ISSN:2520-3398 سال:2016ء شمارہ:1 جلد:1

تحقیقی مجلّہ

سیرت سٹڈیز

شعبہ حدیث وسیرت، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پاکستان

آر۔ جے۔ ایس۔ ایس

مجلہ سیرت سٹڈیز میں مقالہ کی اشاعت سے متعلق قواعد وضوابط

۱. مقالہ میں اصالت اور گہرائی پر مبنی تحقیق ہو۔

۲. مقالہ کے حواشی وحوالہ جات اصولِ تحقیق کے مطابق ہوں نیز حوالہ جات صفحہ کے آخر میں دیئے جائیں۔

۳. مقالہ نگار حوالہ دیتے وقت مصنف، کتاب کے ناشر اور مقام اشاعت کے متعلق مکمل معلومات مع جلد نمبر اور صفحہ نمبر وغیرہ فراہم کریں۔ ایک ہی مصدر / مرجع سے دوبارہ حوالہ دیتے وقت اختصارات کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۴. مقالہ کی ہارڈ کاپی صفحہ کے ایک طرف اور سافٹ کاپی مائیکروسافٹ ورڈ میں کمپوز ہونی چاہیے۔

۵. سیرت سٹڈیز میں ارسال کردہ مقالہ کسی اور جگہ شائع شدہ یا کسی اور جگہ اشاعت کے لیے نہ دیا گیا ہو۔

۶. مقالہ نگار اپنے مقالہ کے ساتھ انگریزی میں ایک صفحہ پر مشتمل ملخص (Abstract) ارسال کریں جو کہ ایک صفحہ سے زیادہ نہ ہو۔

۷. مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلہ کی ۲ کاپیاں فراہم کی جائیں گی۔

۸. مقالہ میں دی گئی رائے کی ذمہ داری مقالہ نگار پر ہو گی۔ مجلس ادارت یا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔

مجلہ سیرت سٹڈیز میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار وخیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں:

پتہ برائے رابطہ: مدیر مجلہ "سیرت سٹڈیز" شعبہ حدیث وسیرت، کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ
بلاک نمبر 12، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، H/8، اسلام آباد
فون نمبر: 0092-51-9250085, 9057839 ای میل: jss@aiou.edu.pk

تحقیقی مجلّہ

سیرت سٹڈیز

مُدیر

شاہ مُعین الدّین ہاشمی

شعبہ حدیث وسیرت، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پاکستان

مدیر

ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی

معاون مدیر

محمد رفیق صادق

مجلس ادارت

قومی

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر چشتی	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز	پشاور
پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء	پشاور
پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر عبد الرؤف ظفر	سرگودھا
پروفیسر ڈاکٹر عبد الحمید خان عباسی	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر عبد القدوس صہیب	ملتان
پروفیسر ڈاکٹر فضل اللہ	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر عبد العزیز ساحر	اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ اعوان	اسلام آباد
ڈاکٹر حافظ محمد سجاد	اسلام آباد
علی طارق	اسلام آباد

بین الاقوامی

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	انڈیا
پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی	جنوبی افریقہ
پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود شیخ	امریکہ
پروفیسر ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی	برطانیہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد صالح سکری	ملائیشیا
پروفیسر ڈاکٹر افتخار حسین ملک	برطانیہ
پروفیسر ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	انڈیا
پروفیسر ڈاکٹر عبد الرحمن رادن الحقی	برونائی دارالسلام
پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد الرزاق اسود	سعودی عرب
پروفیسر ڈاکٹر عبد الحمید بریشک	ترکی
پروفیسر ڈاکٹر عز الدین بن زغیبہ	دبئی
پروفیسر ڈاکٹر فتح الرحمن القرشی	سوڈان
ڈاکٹر محمد زید ملک	سعودی عرب
ڈاکٹر عبد الحمید خروب	الجزائر
بیسا اسماعیلی	کوسووو

فہرست مقالات

اداریہ	ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی	v
عہد نبوی میں سماجی عدل وانصاف	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱
فلاحی معاشرہ کے لیے سماجی بصیرت کی ضرورت واہمیت سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ	ڈاکٹر سعید الرحمٰن	۶۵
عہد حاضر میں تہذیب وشائستگی کے تصورات اور اسوۂ نبی ﷺ	ڈاکٹر ثمینہ سعدیہ	۷۹
قحط سالی اور دیگر قدرتی آفات: تدارک اور عملی اقدامات (اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں)	ڈاکٹر عبد الغفار	۱۰۱
المسؤولية الاجتماعية و دور الفرد في سعادة المجتمع في السّيرة النّبوية	دكتور محمد عبدالرزاق أسود	۱۱۷
التنمية البشرية في ضوء السّيرة النّبوية (التنمية القيادية والإدارية نموذجاً)	دكتور حامد أشرف همدانى	۱۵۱
الفقر والعدالة الاجتماعية في ضوء السنّة النّبوية	دكتور عبدالحميد خرّوب دكتورة نورة محمد زاوي	۱۷۵
العدل الاجتماعي: مجالاته و آثاره في المجتمع الإسلامي	دكتورحافظ محمد طارق محمد رفيق صادق	۱۹۷

مقالہ نگار

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سابق صدر و ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ،

شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا۔

ڈاکٹر سعید الرحمٰن

پروفیسر موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

ڈاکٹر ثمینہ سعدیہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

ڈاکٹر عبد الغفار

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور۔

ڈاکٹر محمد عبد الرزاق اَسود

ایسوسی ایٹ پروفیسر، علوم حدیث و سنت

کالج آف آرٹس، دمام یونیورسٹی، سعودی عرب۔

ڈاکٹر حامد اَشرف ہمدانی

پروفیسر شعبہ عربی زبان و ادب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

ڈاکٹر عبد الحمید خرّوب

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ حدیث و علوم حدیث

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر نورۃ محمد زاوی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ حدیث و علوم حدیث

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر حافظ محمد طارق

لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج فار بوائز، مری، راولپنڈی۔

محمد رفیق صادق

لیکچرار شعبہ حدیث و سیرت

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اداریہ

بسم اللہ والحمد للہ والصّلاۃ والسّلام علی رسول اللہ وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کائنات میں انوار ورحمت کا ثبات اور ساری انسانیت کیلئے نور ہدایت ہے۔ کلام خداوندی اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا جائے تو وہ کلام الٰہی یعنی قرآن حکیم کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جس طرح قرآن حکیم ابدی اور مکمل پیام ہدایت ہے اسی طرح آنجناب علیہ السلام کی ذات بابرکات مکمل نمونۂ ہدایت ہے۔

آپ علیہ السلام سے عشق ومحبت اور آپ سے نسبت میں ساری انسانیت کی کامیابیٔ دوجہاں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں جس قدر تالیفات، سیرت رسول اکرم ﷺ پر ہوئی ہیں اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے موضوع پر نہیں ہوئیں۔ دیگر دنیا کی طرح برصغیر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص سیرت نگاری کی روایت کسی طور کم نہیں، سیرت رسول ﷺ کے مختلف گوشوں پر ہزاروں کتابیں اس خطے میں لکھی جاچکی ہیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ اس کے نصاب میں سیرت رسول اکرم ﷺ پر میٹرک، ایف اے اور بی اے کی سطح پر مستقل کورسز کی تدریس کے ساتھ ساتھ ایم اے علوم اسلامیہ میں سیرت کا تخصص، ایم فل اور پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ میں مصادر سیرت کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ سیرت رسول اکرم ﷺ کے مطالعہ وتحقیق کے سلسلہ کی ایک کڑی زیر نظر مجلہ "سیرت سٹڈیز" کا اجرا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی سیرت مطہرہ کے مختلف پہلو ہیں۔ اس مجلہ میں ہمارے پیش نظر معاشرتی اصلاح وفلاح ہے کہ یہ اس دور کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ مجلہ میں ایسے مقالات کو شامل کیا جائے جو ایک طرف تحقیق کے اعلیٰ پیمانوں کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں اور دوسری طرف امت مسلمہ کے اہم مسائل میں واضح راہنمائی کرسکتے ہوں۔ ہم نے اپنی بساط کی حد تک محنت وکوشش کی ہے تاہم ہمیں علماء اور محققین کی رائے کا انتظار ہے کیونکہ انسانی کاوش میں بہتری کی گنجائش بہرحال باقی رہتی ہے۔

محترم وائس چانسلر، مجلس ادارت اور تمام معاونین کے لیے شکر گزاری کے جذبات ہیں جن کا اظہار دامن ورق پر ممکن نہیں۔ تاہم میں خاص طور پر شیخ الجامعہ کا شکر گزار ہوں جن کی توجہ خاص کی بدولت "سیرت سٹڈیز" کی طباعت ممکن ہو سکی۔ مجلس ادارت اور اہل قلم علماء سمیت ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے مجلہ کی تکمیل میں کسی طور بھی معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو اچھا بدلہ عنایت فرمائے۔

ہم سب اس کاوش پر خوش و خرم ہیں اس امید پر کہ اس سے ہمیں آنجناب علیہ السلام کی شفاعت نصیب ہو جائے اور سب کا کام بن جائے۔

وصلی اللہ علی حبیبنا و حبیب ربنا سیّدنا و مولانا محمد وعلی آله و أصحابه أجمعین

مدیر

عہدِ نبوی میں سماجی عدل وانصاف

Social Justice in Prophet's Regime

محمد یٰسین مظہر صدیقی *

The Holy Book of Allah encompasses all basic concepts and theories of social justice and welfare of society while the life and sayings of the Holy Prophet (SAW) explain it theoretically as well as practically. Islam provides a complete code of justice and system of welfare whereas other religions and social systems cannot be considered equal to it. This reality has also been acknowledged at international level. The last Prophet (SAW) of Allah exercised and implemented social justice and welfare of society for the betterment of an individual and masses. It was an exemplary system which is unique, matchless and also everlasting till the Day of Judgment. It is obligatory for Muslim-Ummah to follow it for eternal salvation and collective good. The researcher has critically and analytically thrown full light upon this topic for general understanding and collective prosperity.

خاتم النبیین وسید المرسلین ﷺ کے عہد مبارک میں عظیم ترین برکات اور انسانیت پرور عطیات میں سے غالباً سب سے نمایاں عدل معاشرتی کا قیام ہے۔ عدل وانصاف اصل میں اسلام کا سرمایۂ حیات ہے اور رسول اکرم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اس کے سب سے بڑے علمبردار۔ آپ امام العادلین بلکہ امامان عدل وانصاف کے سید وسردار ہیں بالکل اسی طرح جیسے آپ تمام انبیائے کرام کے سردار ہیں۔ بحیثیت خاتم النبیین آپ میں تمام کمالاتِ انبیاء اور برکاتِ مرسلین جمع ہی نہیں بلکہ کمال معراج کو پہونچ گئی تھیں اور ختمِ نبوت کے بعد تسلسلِ رسالت محمدی سے تاقیامت معاشرتی عدل وانصاف کا آدرش کامل ترین روپ سروپ میں جاری وساری اور قائم ودائم بھی رہنا ہے۔ آپ نے نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے سماجی عدل وانصاف کے اصول وضوابط اور اطلاق وعمل ثبت کر دیے۔[1]

---

* سابق صدر وڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ / شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا۔

1- نظریات عدل سماجی کا سب سے واضح اور مدلل بیان مکی ومدنی آیات قرآنی میں آیا ہے اور ان پر بحث آگے آتی ہے۔ مکی ومدنی آیات کریمہ کی زمانی تفریق خاص مقاصد سے کی گئی ہے۔ دوسرا ماخذ نظریات اسلامی، رسول اکرم ﷺ کی مکی ومدنی

بیانِ اصول عدل وانصاف کا سرچشمہ خاتم النبیین ﷺ پر منزل، آخری اور جامع ترین صحیفہ الٰہی ہے جو تمام انبیاءِ پیشرو اور ان کی کتب کا جامع ہے۔ تبیین و تشریح اصول قرآنی کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی حدیث کے ذریعہ قلب سید المرسلین ﷺ پر حدیث کی صورت میں تشریحات وتوضیحات وقتاً فوقتاً اتاریں۔ اور قرآنی آیات کی وحی متلو کی مانند آپ نے ان کو خلائق عالم کے لیے معاصر مخاطبین کے سامنے بیان فرمایا۔ یہ دونوں وحی الٰہی اور ارشاد ربانی کی قسمیں توأم ہیں۔[1] سنت و عمل کے ذریعہ آپ نے دوسرے احکام وہدایات ربانی کی طرح عدل وانصاف کے نظریات ومبادیات کو بشری حیثیت سے برت کر دکھادیا۔ نظریہ واطلاق کا یہ عظیم ترین آدرش خاتم النبیین ﷺ کا مثالی، بابرکت، روح وجاں پرور، جسم وبدن ساز یعنی ظاہر وباطن کی صحت وطہارت کا ضامن ہے۔[2] قرآنی آیات وہدایات کے مطابق آپ نے بعثت ورسالت کے بعد شعوری طور سے ملت ابراہیمی کی پیروی اور تنفیذ کی جاں کاہ اور دل سوز کاوشیں کیں۔ نبوت سے قبل چالیس سال کے عرصہ طیبہ اور حیات پاکیزہ ومبارکہ میں دین ابراہیمی اور

احادیث شریفہ ہیں جو مکی عہد نبوی سے مدنی دور شریعت و قانون ریاست تک بتدریج ورود پاتی ہیں۔ ان میں بحث طول کلام کا موجب ہوتی لہٰذا چند احادیث نبوی سے اس کو مدلل کیا گیا ہے۔ حواشی وتعلیقات میں ان کا ایک نسبتاً مفصل تذکرہ آتا رہے گا۔ سماجی انصاف کا عمل سنت مطہرہ اور سیرت نبوی کے آئینہ میں نظر آتا ہے اور قرآن وحدیث سے ان کا ایک ارتباط اس نقطہ نظر سے لایا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کی خیر امت نے کس طرح اور کس جاں فشانی اور کس اخلاص سے نظریات کو اعمال میں تبدیل کیا اور ان کے نتیجے میں پورا عہد نبوی دورِ معدلت گستری بن گیا

۱۔ قرآن وحدیث یا کتاب وسنت میں بالعموم اول ودوم کی درجہ بندی کی جاتی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ دونوں وحی الٰہی پر مبنی ہونے کے سبب اور دین وشریعت کے ماخذ اصلی ہونے کی وجہ سے توأم (جڑواں /twin) ہیں اور ان دونوں کے ایک ساتھ ارتباط کے بغیر نہ تو ایمان مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان پر بیک وقت عمل کے بنا، اسلام کامل ہو سکتا ہے۔ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہوں کتب خاکسار، بالخصوص: وحی حدیث، اسلام بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۲۰۰۰ء، کتاب سرائے لاہور ۲۰۰۰ء۔

۲۔ عدل معاشرتی یا انصاف سماجی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ دوسرے نظام ہائے فکر میں اگرچہ اس کی حدود کار میں صرف انسانی معاشرہ آتا ہو، مگر اسلامی فکر وعمل میں پوری اسلامی زندگی اس کے دائرہ کار میں آتی ہے، جس کا ایک سرا روح کے واسطہ سے ملکوت سے اور دوسرا بدن کے وسیلے سے ناسوت سے وابستہ ہے۔ حقوق اللہ وحقوق العباد میں تال میل اور عدل واعتدال بھی اسلامی سماجی انصاف کا ایک دائرہ کار ہے اور سماجی انسانی معاشرت میں دین وشریعت کے امور بھی آتے ہیں اور دنیاوی ارتباط اور رشتوں کے معاملات بھی اور آخر میں خالص انسانی معاشرت کا دائرہ سیاسی، فوجی، انتظامی، مالی، اقتصادی اور تہذیبی غرضیکہ تمام دائرہ ہائے حیات کو محیط ہے۔

ت حنیفی کی باقیات صالحات میں پیوست عدل وانصاف کے اصول و نظریات اور ان پر صالح نفوس و شخصیات کے عمل وانضباط سے بہ توفیق الٰہی کسب فیض کیا جو شعوری بھی تھا اور فطری بھی کہ وجدانی اور علمی دونوں کا خمیر رکھتا تھا۔[1] قبل بعثت کی حیات طیبہ عصمت نبوی کی اولین وجدانی والہامی صورت حفاظت کی چھاؤں میں صورت پذیر ہوتی تھی جو آپ کی شان شایان چیزوں کی طرف لے جاتی اور شان والا سے فروتر چیزوں سے محفوظ رکھتی تھی۔ عدل وانصاف الٰہی نے بصورت توفیق ربانی آپ کو بطور پیغمبر آخر الزماں دونوں زمانوں میں مستفیض و مستنیر کیا تھا۔[2]

ول بحث:

سماجی عدل وانصاف کے الٰہی احکام

عدل الٰہی- سرچشمہ عدل:

ذات الٰہی کی صفات عالیہ میں عدل وقسط کی صفت خاص ہے اور ایک طرح سے ذات ربانی کا خمیر وجوہر۔ آخری کتاب الٰہی کی بہت سی آیات کریمہ میں عدل وقسط الٰہی کا واضح بیان اور پختہ اثبات دونوں جہات نفی واثبات

۱۔ ملت ابراہیمی کی پیروی واتباع کا حکم قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ میں دیا گیا ہے: آل عمران: ۹۵، سورۃ النساء: ۱۲۵، سورۃ الانعام: ۱۶۱، سورۃ النحل: ۱۲۳، سورۃ الحج: ۷۸۔

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ نبوت وشریعت محمدی کسی کی تابع تھی بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ملت ابراہیمی اساسی نہادی تھی جس پر تمام ادیان سماوی یا صحیح طور سے خالص دین اسلام استوار ہے۔ وہ سب انبیائے کرام کا دین ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانیوں اور کاوشوں سے اسے اپنے عہد میں کامل ترین بنایا۔ اسی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول آخر الزماں کی بعثت کو سمحہ / حنیفیہ / ابراہیمی واسماعیلی قرار دیا اور مقصد بعثت احیائے ملت ابراہیمی بتایا۔ بحیثیت خاتم النبیین وسید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جامع وکامل ترین بنایا اور ملت ابراہیمی ملت محمدی میں مدغم ہو کر اس کا ایک حصہ بن گئی۔ یہ طویل بحث ہے اور اس کا یہاں موقع نہیں۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو شاہ صاحب موصوف کی کتاب **حجۃ اللہ البالغہ** اور **خاکسار کی تالیف** "مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء" فرید بکڈپو، نئی دہلی ۲۰۰۹ء۔

۲۔ توفیق الٰہی اور قبل بعثت اس کی کارکردگی کے لیے ملاحظہ ہو کتاب خاکسار: "مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقا" اور دیگر کتب سیرت کے علاوہ مقالہ خاکسار "بعثت سے قبل عصمت نبوی" ششماہی جہات الاسلام لاہور، جنوری-جون ۲۰۰۸ء۔ امام سیرت وحدیث ابن اسحاق نے اپنی السیرۃ النبویۃ میں اور امام حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں بعثت سے قبل کے اعمال وسنن پر بحث کی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: خاکسار کا مقالہ "قبل بعثت اعمال وسنن کی دینی حیثیت" معارف، اعظم گڑھ، جون ۲۰۰۹ء۔

سے محکم طور سے آتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عادل و منصف ہونے کا مثبت ذکر اس کے ظلم وجور نہ کرنے کی فطرت وعادت سے منفی طور سے اس طرح پیوست ہے کہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ عربی محاورے اور واقعی مظاہرے نے سب کو بتادیا کہ اشیاء ہی نہیں کائنات کی تمام چیزیں اور ان کا خالق وباری عدل سے متصف اور ظلم سے منزہ ہے اور عدل اپنی ضد ظلم سے نہ صرف جانا پہچانا جاتا ہے بلکہ تمام اہل نظر مخلوقات اور صاحبِ ایقان کائنات کے علم وتجربے میں بھی آتا ہے۔ جمہور علماء و مفکرین اور سواد امت مرحومہ نے عدل الٰہی کو عظیم ترین صفات الٰہی میں شمار کیا اور ذات الٰہی سے اس کے افتراق کو غیر ممکن مانا۔ بعض قدری فلسفہ کے ماروں اور قدرت الٰہی کے امکانی قدروں کے پھیر میں مبتلا افراد وطبقات نے محض امکان موہوم کی خاطر قدرت الٰہی کو منشائے الٰہی سے ایسا پیوست کیا کہ ظلم وجور اور ناانصافی وبے رحمی تک سے اس کے ڈانڈے جاملائے کہ ان کے خیال میں قدرت کاملہ کو امکانات سے بھی محدود نہیں کیا جاسکتا۔ عدل الٰہی اور قدرت ربانی کے باہمی ربط ورشتہ کے نازک ودقیق فرق کو آیات کریمہ، احادیث نبویہ اور عقل ومنطق کے میزان میں تولنا لازمی ہے۔ اس توازن وتناظر میں امت اسلامی کے ایک مکتب فکر نے قدریہ وجبریہ کے بے جا اور بے محل امکان کے توڑ کی خاطر عدل الٰہی کا خاص نظریہ بنایا اور اس حقیقت کا اثبات کیا کہ قدرت الٰہی اور منشائے ربانی ومرضی مولا جو چاہے کرے مگر اسی نے خود عدل وقسط اور رحمت ورافت کو اپنے اوپر لازم کرلیا اور یہ لزوم ووجوب اس کی قدرت ومرضی کی محدودیت نہیں بلکہ وسعت وبیکرانی ہے کہ عدل وانصاف ہی اس کی قدرت کاملہ بھی ہے اور اس کا اظہار کلی بھی۔ جور وظلم کا امکانی پہلو اس عدل بیکراں اور انصاف لامتناہی کا ایک منفی اظہار ہے۔ فلسفیانہ بحث وتمحیص اور منطقی استدلال وخیال کے باوصف سب مفکرین وعلماء اور مکاتب فکر کا اجماع ہے کہ عدل وانصاف سرشت الٰہی ہے۔ صرف صفت وعادت نہیں اور اسی حقیقت واحدہ کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عادل ومنصف ہے اور عدل وقسط کو ہی پسند فرماتا ہے۔ وہ نہ صرف جور وظلم سے منزہ وپاک ہے بلکہ اس کو ناپسند کرتا ہے اور اس کو اپنے بندوں اور مخلوقات کے لیے بھی پسند نہیں کرتا بلکہ اس سے احتراز کلی کی ہدایت کرتا ہے اور عدل وانصاف کی صفت اپنی ذات میں پیدا کرنے اور دوسروں کے باب میں اس کی کار فرمائی کا پابند بناتا ہے۔ ذات الٰہی کی سرشت عدل وانصاف اس کے خیر کل ہونے کی حقیقت ہونے کے سبب ہر باب میں اور ہر آن اور ہر محل میں کارسازی کرتی ہے جبکہ انسان وبشر اور دوسری مخلوقات خیر وشر کو ان کی تخلیق وتربیت میں خیر وشر دونوں کے عناصر کی ترکیب کی بنا پر عدل وانصاف گستری کی پیہم ہدایت اور مسلسل تذکیر کی ضرورت لازمی کرتی ہے اور قرآن مجید کی آیات کریمہ ان کا ایک منظم ومتوازن نظام پیش کرتی ہیں۔ (1)

۱۔ عدل الٰہی اور قدرت الٰہی کے ارتباط پر جمہور اسلامی علماء ومفکرین، قدریہ، جبریہ اور خاص کر معتزلہ ومرجئہ کے افکار ومباحث

بحث دوم:

سیرت نبوی سماجی عدل وانصاف کا مرقع

عدل الٰہی کی تعمیرِ سیرتِ نبوی میں کارفرمائی:

اللہ رب العالمین نے اپنے عدل وانصاف کے بیکراں خزانہ سے اپنے خاتم النبیین وسید المرسلین ﷺ کو آپ کی بشری طاقت اور نبوی بسالت کے مطابق حصہ وافر عطا فرمایا۔ عالم آب وگل میں گل سرسبدِ رسالت کے مادی پیکر میں اپنا پرتو عدل وانصاف کوٹ کر بھر دیا۔ روح وبدن کے امتزاجی پیکر میں اس کی اولین تکوینی تعمیر وتشکیل میں دوسری صفات انسانی اور عطایائے ربانی کے دوش بدوش عدل وانصاف کا خمیر اٹھایا۔ اسی الٰہی کارفرمائی اور ربانی کارسازی کی وجہ سے سید المرسلین نے ہوش وخرد کی عمر اور علم وتمیز کے مرحلہ سے قبل ہی ہر مرحلہ حیات میں عدل کا لاشعوری طور پر مظاہرہ فرمایا۔ روایات سیرت وحدیث اور آثار مناقب ومعجزات اسے کرامات ومعجزات کے باب خرق عادات میں لاتے ہیں۔ اصلاً وہ تعمیر سیرت وشخصیت میں ید اللّٰہی کاریگری ہے اور خاص عین عادت وفطرتِ بشری۔ یہ سید المرسلین ﷺ کے عالم طفلی میں منصفانہ بزرگی اور عدالت کی نشانی بھی ہے۔[1]

کا تجزیہ از سر نو لازمی ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور منشائے بیکراں کے تحت جو چاہے کرے، کر سکتا ہے اور حقیقتاً کرتا بھی ہے مگر وہ اپنے عدل کے وصف کے سبب ظلم نہیں کرتا۔ جمہور علماء کا خیال ہے کہ وہ ظلم بھی کر سکتا ہے اور خطاکار کو معاف اور ہدایت یافتہ کر سزا دے سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک امکانی تشخیص ہے۔ وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ کرے گا بالخصوص ہدایت یافتہ اور اطاعت گزار کو نہ سزا دیتا ہے اور نہ جہنم رسید کرتا ہے البتہ وہ خطاکار ومجرم کو معاف کر سکتا ہے اور کر دیتا ہے کہ اس کی رحمت بیکراں اس کی متقاضی ہے۔ معتزلہ نے عدل کے وجوب کو کھینچ کر رحمت کے دائرے کو سکیڑ دیا کہ وہ خطاکار گناہ گار اور بدکار کو سزا دینے کا پابند ہے۔ یہ وجوب مطلق تو ہو سکتا ہے مگر واقعی نہیں کہ اس میں رحمت کی عدل سے اور محبت کی سزا سے رشتہ داری کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ فلسفیانہ بحث محض اس لیے مشکل اور باعث خلجان بنی کہ آیات کریمہ واحادیث نبویہ کا مطالعہ مجموعی تناظر میں نہیں کیا گیا۔

۱۔ (تخلقوا باخلاق اللہ) اور ان جیسی احادیث کریمہ اور خلق الٰہی پر انسان خاص کر پیغمبران عظام اور ان میں بھی خاص الخاص سید المرسلین ﷺ کے تخلق کی ساتھ خالص تخلیق کی حامل آیات کریمہ انسان میں اور دوسری صفات کے ساتھ عدل کی صفات بھی ودیعت ہونے کی حقیقت بتائی ہیں۔

رضاعت میں عدل نبوی:

ولادت مبارکہ کے چند ایام کے اندر اندر ہی اس کا ایک عادلانہ اظہار یوں ہوا کہ اپنی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی مبارک وزندگی بخش چھاتیوں میں سے صرف ایک ہی سے لبن حیات ومحبت نوش فرماتے اور دوسرا سرچشمہ زندگانی اپنے دودھ شریک بھائی کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ وہی عدل الٰہی کا پرتو تھا جو پیکر نبوی میں ودیعت کیا گیا تھا اور جس کے سبب ایک عرصہ قبل ایک پیشرو اولوالعزم رسول مکرم علیہ السلام نے سرکاری مرضعات (دودھ پلائیوں) کو اپنے آپ پر حرام کرلیا تھا تاکہ وہ اپنی ماں کی گود میں جاکر سرچشمہ حیات سے سیراب ہوں اور وعدہ الٰہی کا ایفاء کریں۔[1] رضاعت وپرورش نبوی کے باب میں یہ عدل وتوازن فطری ووجدانی بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ فروتر کردار کے حامل خاندانوں کی کمتر خواتین کے دودھ سے ان کی سیرابی نہیں کی گئی۔ محمدی رضاعت میں بالترتیب رضاعت والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا، رضاعت حضرت ثویبہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا اور رضاعت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا آپ کے شایان شان تھیں۔[2]

نشوونما میں عدل:

اپنے اعمام وعمات (چچاؤں اور پھوپھیوں) اور خاص کر اپنے دونوں حقیقی اعمام زبیر بن عبد المطلب وابو طالب بن عبد المطلب کے گھروں میں کچھ بھی تناول ونوش کرتے تو صرف اپنے حصہ پر اکتفا فرماتے اور اپنے ہم عمر اور شریک طعام وشراب بھائی بہنوں کے حصہ کو ہاتھ نہ لگاتے۔ شرکت ومصاحبت نبوی سے گھر والوں کے آب وطعام میں برکت کا ظہور ومشاہدہ اور معجزہ بھی الٰہی عدل گستری کی کارفرمائی تھی اور وہ نبوی عدل گستری بن کر ظہور میں آئی تھی۔

۱۔ رضاعت نبوی کے متعلق ابواب کتب سیرت ملاحظہ ہوں۔

۲۔ حضرت ثویبہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کے رضاعت نبوی کو ایک باندی / لونڈی کی رضاعت غلط فہمی کی وجہ سے قرار دیا گیا ہے۔ وہ مولاۃ ابی لہب / بنی ہاشم کے رشتہ ولاء کی وجہ سے تھیں اور کافی بلکہ عظیم ترین دودھ پلائی اور خاندانی شخصیت تھیں۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب خاکسار: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی مائیں یا حضرت ثویبہ رضی اللہ عنہا پر مضمون وکتابچہ وغیرہ۔
حکیم محمود احمد ظفر، سیرت خاتم النبیین، تخلیقات لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۴ پر رقمطراز ہیں کہ "قریش میں خوشحالی اور برتری کے زعم کا ایک تکلف یہ تھا کہ۔۔۔۔ دوسرا (تکلف یہ کہ) خاندانی عورتوں یا باندیوں سے دودھ پلوایا کرتی تھیں" اور اس سے قبل حضرت ثویبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں تمام بے سروپا روایات نقل کی ہیں۔ پوری عرب تاریخ میں کسی باندی یا فروتر دودھ پلوائی کا ذکر نہیں ملتا۔

عالم طفولیت میں بے خبری اور بے سمجھی میں یہ احساس یگانگت و شراکت عدل و معدلت بن کر چھلکتا کہ مربیوں سے جو کچھ ملتا اسے مل بانٹ کر کھاتے پیتے اور پہنتے اوڑھتے۔ اپنے ہم سن بھائی بہنوں اور عزیزوں اور بچوں کے ساتھ یہ طفلانہ عدالت باہمی محبت و عقیدت کی قندیلیں دلوں میں روشن کرتی اور بڑوں، بزرگوں اور محسنوں و مربیوں کے ساتھ شراکت و مصاحبت اور ایثار و محبت کا معصوم سلوک ان کی توجہات عالیہ کو اور بڑھا دیتا۔ (۱)

عرب قریشی مروءۃ:

قریش مکہ، ان کے سادات و شیوخ، عوام و خواص اور بیت اللہ کے متولیان و مجاوران کرام میں سماجی شراکت داری، باہمی تعاون، مخلصانہ امداد و انفاق کا خاص سماجی رویہ ان کی قومی صفت "مروءۃ" کی دین تھا اور اس کی تعمیر و تشکیل اور ترویج و تشخیص روایات دین ابراہیمی نے کی تھی۔ وہ قومی روایت اور قریشی و تیرہ نبوی عطایائے کرم گستری سے بنا تھا اور اس کی روحانی۔ تکوینی اور ربانی ساخت و پرداخت عدل گستری ربانی ہی رہی تھی۔ قبائلی اور قومی زندگی میں اس کے دو مظاہر سامنے آتے اور تعمیر سیرت و کردار کرتے رہے۔ (۲)

ایک باہمی تعاون و قومی شراکت داری کے عادلانہ وصف کی حیثیت سے کہ وہ تمام عوام و خواص، خورد و بزرگ، مرد و زن تمام قومی کاموں میں مساوی طور سے حصہ لیتے اور تقسیم کار عادلانہ بنیادوں پر قریشی خاندانوں کی سماجی حیثیت اور قبائلی مرتبت کی بنیادوں پر ہی کیا جاتا تھا افراد و شخصیات اور خاندانوں اور بطون کی سماجی مرتبت اور معاشرتی منزلت بظاہر غیر عادلانہ دکھتا ہے مگر اس کی لازمی رعایت بھی عدل گستری کے لیے ضروری تھی کہ سماجی منزلت کی اقدار و درجہ بندی کو ہمیشہ تسلیم کیا اور ایک حقیقت سمجھا گیا حتی کہ انبیاء و مرسلین میں تفضیلی مرتبہ بندی کا الٰہی قانون ملتا ہے۔ اسی رعایت سماجی اور تفضیل معاشرتی کو عدل و ضبط اور قسط و انصاف سے تعبیر کیا اور اس کی خلاف ورزی کو ہمیشہ ظلم و عدوان اور جور و سرکشی سمجھا گیا۔ (۳)

۱۔ مصادرِ سیرت میں ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن سعد وغیرہ کے ابواب ملاحظہ ہوں۔ ثانوی کتب میں شبلی، داناپوری اور کاندھلوی وغیرہ کی کتب ملاحظہ ہوں۔ نیز محمود احمد ظفر، مذکورہ بالا، ص ۱۲۷، کا بیان ہے کہ "آپ صرف دائیں پستان سے دودھ پیتے اور جب بایاں پستان آگے کرتی تو آپ اپنا منہ ہٹا لیتے۔۔۔" بحوالہ مدارج النبوۃ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

۲۔ روایت مروءۃ پر مستشرقین نے بڑی جاندار تحقیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو: مروءۃ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور وغیرہ۔ نیز مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام۔

۳۔ قومی کاموں میں ملی / قریشی شراکت داری کے مظاہرے حرب فجار وغیرہ جنگوں کے علاوہ عہد نبوی میں دوبار تعمیر خانہ کعبہ میں نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق / ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، تحقیق حمدی، مکتبہ المورد، قاہرہ، ۲۰۰۶ء، ج ۱، ص ۱۲۸-۱۳۰، اس کی شرح سہیلی، الروض الانف، مرتبہ مجدی بن منصور، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ء، ج ۱، ص ۳۳۶ ومابعد۔

ظلم وجور عرب "مروءۃ" میں اسی طرح مبغوض ومردود تھا جس طرح عدل وانصاف محبوب وپسندیدہ۔ یہ عدل وانصاف نبوی سنت ابراہیمی کا عطیہ تھا۔ قبل بعثت نبوی کے زمانے میں ظلم وجور کو کبھی مردانگی کا نشان نہیں سمجھا گیا۔ اس کے برعکس اسے کمزوری، ناداری اور بے چارگی کا پرتو گردانا گیا۔ عرب جاہلی شاعری، قومی روایات معاشرت اور اقدار واعلام مروت وسماحت نے عدل وانصاف کے گن گائے اور ظلم وجور کی مذمت کی۔ عادل اور منصف کو سراہا اور ظالم وجابر کو ہدف طعن ونقد بنایا۔[1] حاتم طائی عرب میں سخاوت کے ساتھ عدل وانصاف کا بھی پیکر تھا۔ عرب جاہلی میں بالعموم ہر بڑے قبیلہ میں اکابر عدل ہوتے تھے جو منصفانہ فیصلے کرتے تھے نفیل بن عبد العزیٰ عدوی وغیرہ۔[2] قرب وجوار کے ملکوں میں ایرانی شہنشاہ نوشیروان عادل ہی کے لقب سے ایسا مشہور ہوا کہ عدل اس کے نام کا جزو بن گیا۔[3] شاہ نجاشی اپنے عدل وانصاف کی بنا پر اپنے ملک وقوم ہی میں نہیں، عرب کے صحراؤں اور شہروں میں معدلت گستری کی وجہ سے محبوب خلائق تھا۔[4] عرب قوم اور عربی روایات کا افتخار عدل یہ بھی تھا کہ ابو ربیعہ بن مغیرہ مخزومی کو "العدل" کا لقب صرف اس لیے عطا کیا گیا کہ وہ ہر دوسرے سال اپنی قوم قریش کے سرداروں ومالداروں کے طبقہ کی مشترکہ قومی روایت کے بالمقابل تن تنہا صرف اپنی دولت سے غلاف کعبہ کا انتظام کرتے تھے۔[5] قومی معاملات ومعاشرتی امور اور دوسرے سماجی اداروں میں ایسے عادلوں کا ذکر آتا رہتا ہے کہ وہ دین ابراہیمی کی صالح روایات واقدار تھیں۔ اس کے برعکس ظلم وجور اور ان کے خوگر افراد وطبقات اور ان

۱۔ کتاب خاکسار "مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقا"، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، **حجۃ اللہ البالغہ**، مکتبہ سلفیہ، لاہور، ج ۱، ص ۱۲۸ وغیرہ۔

۲۔ حاتم طائی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور وغیرہ، ابن قتیبہ، کتاب المعارف کا آخری باب بادشاہوں کا تذکرہ، اردو ترجمہ علی محسن صدیقی، قرطاس، کراچی، ۲۰۱۲ء۔

۳۔ "نوشیروان" مقالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، نیز ابن قتیبہ مذکورہ بالا۔

۴۔ شاہ نجاشی کے عدل کی تعریف زبان نبوی سے ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۲۷، (لو خرجتم الی ارض الحبشۃ فان بہا ملکا لا یظلم عندہ احد وھی ارض صدق.... الخ)

۵۔ ازرقی، اخبار مکۃ، تحقیق عبد الملک بن عبد اللہ، مکتبۃ الاسدی، مکہ مکرمہ، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵۵-۳۵۴، ان کی اولاد بنو العدل کے لقب سے مشہور ہوئی۔

کے حکمرانوں اور شاہوں کا، ظالموں کے نفرت انگیز طبقہ میں ذکر آتا ہے۔ فراعنہ مصر ہوں یا کسریٰ ایران، یا پھر عرب و عجم کے دوسرے ظالموں اور جابروں کے طبقات، وہ ہمیشہ اپنے ظلم وجور کے سبب قابل نفرت ٹھہرے۔ یہاں تک معاملہ قدر انسانی یہ رہا کہ دین وشریعت سے انحراف اور شرافت ومروت سے گریز کو بھی ظلم وجور سمجھا اور مردود گردانا گیا۔ دین ابراہیمی کی اقدار صالحہ اور روایات پسندیدہ کی پاسداری بھی عدل گستری سمجھی گئی اور ان کے علمبرداروں کی تعریف وتحسین کی گئی۔[1]

حلف الفضول:

دوسرا مظاہرہ سماجی ظلم وجور کے برخلاف سینہ سپر ہو جانے کا ہے۔ جب ایک فعال طبقہ اس کا داعی اور علمبردار اور نفاذ کرنے والا بن جاتا ہے اور دوسرا طبقہ یا طبقات اس کے ساتھ دلی طور سے ہوتے ہیں خواہ وہ فعال وکارساز نہ بن سکیں۔ وہ بہر حال ظلم وجور کے خلاف تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال حلف الفضول کی ہے۔

حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کی قبل بعثت نشو ونما اور تعلیم وتربیت مکی معاشرے اور عرب کے وسیع تر سماج کی صالح روایات اور فطرت بخش ماحول میں ہوئی۔ جس طرح بہت سے دوسرے نونہالانِ قریش اور نوجوانانِ عرب کی ہوئی تھی۔ سرداران قوم اور شیوخ قبائل ان کے دینی اور قومی صالح سادات روایات کو قابل فخر سمجھتے اور ان کے ترک کو گناہ گردانتے اور ان میں عدل وانصاف اہم تر تھے۔ اس مایہ فخر میں ایک عدل وانصاف کا قیام ونفاذ تھا، جس پر انحرافات دینی اور تصرفات قومی اور تجاہلات قبائلی کے تاریک سائے بھی چھا گئے تھے۔ مگر صالح نفوس اور قومی افتخار کے خوگر افراد وطبقات نے عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھا اور اس کے نفاذ کے لیے اجتماعی مساعی کیں۔ ان میں سے ایک حلف الفضول کا معاہدہ تھا۔ جس کا مقصد ساکنان حرم کو بالعموم اور بیرونی زائرین وتاجرین کو بالخصوص ظلم وتعدی سے محفوظ کرنا تھا۔ وہ قومی وتیرہ عدل وانصاف کو اجتماعی کوششوں کے ذریعہ قومی سطح پر نافذ اور جاری ساری کرنے کی ایک احیائی تحریک تھی کہ عہد نبوی سے ایک عرصہ قبل ایک طبقہ عدل گسترنے اول اول ایک اجتماعی وطبقاتی تحریک چلائی تھی اور اس نے عرب قومی مزاجِ عدل بنانے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کے عہد شباب میں اس کی اولین تحریک احیاء آپ کے حقیقی چچا زبیر بن

۱۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص۱۳۰-۱۲۸۔

عبد المطلب ہاشمی نے چلائی اور ہمنواؤں کو جمع کر لیا۔ متعدد قریشی خاندانوں کے شیوخ وسادات اور اکابر وسردار کے علاوہ نوجوانانِ قریش بھی شامل تھے اور ان میں آپ ﷺ بھی شریک رہے تھے حلف الفضول کا قدیم وجدید متن / متون سرزمین حرم اور ساکنان مکہ کو ظلم وتعدی سے بچانے اور عدل وانصاف فراہم کرنا اس کا سرنامہ بتاتے ہیں: "...الحلف الذی عقدته قریش بینها علی نصرة کل مظلوم بمکة... کان قدسبق قریشا الی مثل هذا الحلف جرهم فی الزمن الاول..."[1]

تحفظ سماجی کی دوسری صورتیں:

عرب کے قبائلی نظام میں ذاتی اور جان ومال کے تحفظ اور سماجی حفاظت کا ایک سہ طبقاتی نظام ہمیشہ سے فعال وکارگر رہا اور سماجی عدل وانصاف فراہم کرتا رہا۔ مستشرقین اور جدید سیرت نگاروں نے بالعموم اسے قبائلی عددی برتری بڑھانے کا طریقہ سمجھا اور سمجھایا ہے اور روایتی مورخین اس سے نابلد ہیں۔ اصلاً وہ نظام تحفظ سماجی تھا جو ایک کمزور فرد یا طبقہ کو ایک برتر یا طاقتور سماج میں جان ومال اور عزت وآبرو کا تحفظ فراہم کرتا تھا۔ وہ ملکی اور آفاقی دونوں کے لیے تھا۔ ملکی سطح پر یوں کہ دو قبیلے حلف وتحفظ کا معاہدہ کر لیتے یا افراد وطبقات جو کمزور ہوتے برتر اور طاقتور کی پناہ میں آجاتے۔ بالعموم جوار اور جار کا نظام کمترین سطح پر جس میں ایک کمزور شخص یا چھوٹا گروہ خواہ ملکی ہوتا یا آفاقی کسی مقامی شیخ اور اس کے خاندان طاقتور سے پناہ وتحفظ حاصل کر لیتا۔ وہ جار وجوار پورے خاندان کا ہوتا۔ اسی طرح مولیٰ اور موالی، رشتہ ولا استوار کر کے ایک طاقتور خاندان کے ہمکار ووفادار بن جاتے۔ ان میں آزاد اشخاص وطبقات بھی تھے اور غلامی سے آزاد بندگان بھی۔ ان دونوں رشتہ وفا وتحفظ میں ایک طبقہ کمزور وکمتر ہوتا جو ایک طاقتور اور برتر طبقہ کی پناہ میں آجاتا اور پوری طمانیت وعزت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان دونوں سے بلند تر طبقات حلفاء / حلیف تھے جو مساوی سماجی عزت ودرجہ کے افراد وطبقات یا قبائل ہوتے اور وہ ایک دوسرے سے حلف کا معاہدہ کر کے دوست بن جاتے۔ قریش مکہ اور دوسرے قبائل حضارہ وتمدن میں اور بدوی قبائل میں بھی اسی طرح تینوں نظامات تحفظ سماجی بروئے کار لائے جاتے اور وہ سب کو تحفظ فراہم کرتے۔ بلاشبہ ان سے عددی برتری اور اس کی وجہ سے طاقت بھی ملتی مگر ان سب کا بنیادی محور ومحرک یہی تھا کہ ان کو

1- ابن ہشام، ج ۱، ص ۹۳، سہیلی، ج ۱، ص ۲۴۲۔

شدائد کے صحراؤں اور مظالم کے شہروں میں عدل وانصاف مل سکے، جوار، ولاء اور حلف کے رشتہ اور معاہدوں کو اس ضمن میں پرکھنا چاہیے اور رسول اکرم ﷺ کے جار، موالی اور حلفاء کے معاہدات وروابط اسی کے شاہد عدل ہیں۔[1]

مکی عہد نبوی:

قرآن مجید کی آیات کریمہ عدل وانصاف سے متعلق احکام وہدایات کا سراغ اولین روزِ اسلام سے دیتی ہیں اور تمام انبیائے کرام کے صحف کے متون کا حوالہ بھی ہیں۔ وہ منطقی تسلسل اور واقعاتی ارتقاء کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی فطرت عدل وانصاف تمام انبیائے کرام کی سرشت وطنیت میں ودیعت کی گئی اور سلسلہ نبوت کے تمام دوسرے عطایا اور خواص کی مانند وہ تمام پیشرو انبیائے کرام کی کتابوں اور تعلیمات کا ایک اہم ترین سرنامہ بنی اور قرآن مجید میں کمال ارتقا اور معراج اظہار وبیان کو پہنچی۔ اس زمانی تسلسل وارتقاء کا تقاضا تھا کہ مکی دور نبوت میں نازل شدہ آیات قرآنی میں بھی عدل وانصاف کا ذکر خیر آئے۔ بلاشبہ مدنی آیاتِ کریمہ میں آیات عدل وقسط اور ہدایاتِ انصاف وکرم گستری کا زیادہ اور مختلف محلات ومتنوع حالات کا لحاظ سے ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مدنی دورِ نبوت میں ریاستی قوت نافذہ حاصل ہونے کے سبب اس کے قیام ونفاذ کی ذمہ داری سید المرسلین ﷺ کے دوش مبارک پر آپڑی لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ افراد ملت اور طبقات امت یا ان کے حلقہ ارادت کے باہر انفرادی اور اجتماعی ادارے اور افراد عدل وانصاف کے قیام ونفاذ کے مکلف وپابند نہ تھے۔ عدل وانصاف تو ہر انسانی سماج کی بقاوصحت کے لیے ناگزیر ہے حتی کہ پورا نظام کائنات عدل ہی پر استوار وبرقرار ہے۔ اسی طرح سیاسی نظام اور ریاستی انصرام کی زائد ذمہ داری سے قبل کے زمانے میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے سے پہلو تہی برتنے کی حرکت یا صرف مدنی دور حاکمیت میں ان کے نزول وہدایت کی جاہلانہ سوچ کی غیر منطقی وکالت بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ مدنی آیات ہیں لہٰذا ان کا اطلاق وانطباق مکی دور رسالت پر نہیں کیا جاسکتا۔ عدل وانصاف سماجی ہو یا کسی اور نوعیت کا وہ توحید ورسالت وآخرت کی طرح ناگزیر اسلام ہے۔ مکی دور نبوی میں البتہ عدل وقسط کے احکام مجمل اور بنیادی واقعیت کی صورت میں عطا کیے گئے اور اقوام وملل کے واقعات اور قصص الانبیاء کے مضامین میں ان کی نوعیتیں بھی بیان کی گئیں۔ ان کا ایک مختصر تجزیہ مکی عہد میں سید المرسلین وخاتم النبیین ﷺ کے لیے ہدایات عدل وانصاف کا گوشوارہ فراہم کرتا ہے۔

1- بحث کے لیے کتاب خاکسار، "مکی اسوہ نبوی" اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی ۲۰۰۵ء، زوار اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۶ء۔

انسانوں کے درمیان عدل کرنے کا حکم: ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾[1] ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾[2]

معاشرہ میں عدل کرنے اور نہ کرنے کا موازنہ: ﴿هَلْ يَسْتَوِي هُوَ ۙ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾[3]

قولی عدل: ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾[4]

ناپ تول میں / ترازو میں قسط وعدل: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾[5] ﴿أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾[6] ﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾[7] ﴿وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾[8]

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾[9]

سورۃ المطففین میں ناپ تول میں ڈنڈی مارنے کا ذکر اس ہدایت قسط وعدل کا منفی لحاظ سے آیا ہے اور اسے نہ صرف گناہ اور قابل عتاب گردانا گیا بلکہ دنیا میں باعث سزا و جرمانہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے تاریخی واقعات اور مقامی انحرافات کا ذکر بھی روایات تفسیر میں آتا ہے۔[10]

ان تمام مکی آیات کریمہ میں اہل ایمان کو بالعموم اور امت مرحومہ کو بالخصوص عدل وانصاف سے ہر معاملہ میں کام لینے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے توسط سے دوسرے تمام انسانی افراد اور معاشروں کے لیے بھی وہی

۱۔ سورۃ الشوریٰ: ۱۵۔

۲۔ سورۃ النحل: ۹۰۔

۳۔ سورۃ النحل: ۷۶۔

۴۔ سورۃ الانعام: ۱۵۲۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ سورۃ ہود: ۸۵۔

۷۔ سورۃ الرحمن: ۹۔

۸۔ سورۃ الشعراء: ۱۸۲۔

۹۔ سورۃ الاسراء: ۳۵۔

۱۰۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم اور دوسری کتب تفسیر میں ان کی تشریح و تفسیر میں تفسیری روایات واقوال؛ بخاری / فتح الباری شرح صحیح البخاری، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۷۹ء، پارہ ہشتم کے مختلف مباحث سورۃ میں روایات حدیث بالخصوص؛ مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام میں ناپ تول وغیرہ کے مباحث۔

احکام عام وخاص ہیں۔ عدل وانصاف کا معاملہ جوہری اور بنیادی ہے کہ اسی پر فرد اور قوم اور ملک کی صحت وبقا منحصر ہے۔ بعض تفسیری روایات وآثار میں عدل کے نفاذ وقیام پر ماموریتِ سید المرسلین ﷺ کا ایک بہت تنگ، محدود اور ناقابل یقین تصور وبیان دیا گیا ہے۔[1]

مکی دور عدل کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تمام معاشرتی معاملات اور انسانی امور میں رسول اکرم ﷺ کی ماموریت اور امت اسلامی کی تکلیف وپاسداری اور عام انسانی سماج کی ذمہ داری کو محیط ہے جیسا کہ سورۃ النحل :۹۰ میں نہ صرف عام عدل کا حکم ہے بلکہ احسان کا بھی ہے جو عدل سے آگے اور برتر چیز ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام وصحابیات طاہرات نے ان احکام عدل واحسان کو اپنی ذات وفطرت میں اس طرح اتار لیا تھا کہ وہ عدالت صحابہ اور عدل نبوی بن کر معاشرہ انسانی کی تطہیر وتعمیر کر گیا۔ بہت سی آیات قرآنی میں اسی فطرت عادلانہ کی وجہ سے ان کو محسنین کہا گیا اور رسول اکرم ﷺ تو اپنی فطرت وسرشت اور عمل واطلاق سے امام العادلین وسید المحسنین ہیں۔[2]

قولی عدل کا حکم اور وہ بھی اقربا واعزہ کے معاملات کے بارے میں بڑا سخت امتحان ہے۔ عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے امور میں خاموشی وسکوت بھی جرم وگناہ ہے کہ سکوتِ سخن شناسی کے علاوہ وہ حق وانصاف کو چھپانے اور جھٹلانے اور ظلم وجور کو بڑھاوا دینے کے مترادف ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ وصحابیات نے مکی عہد نبوی میں دینی حق کے بارے میں معاشرت وتجارت میں، معاملات میں غرض کہ ہر امر ومعاملہ میں قول حق کا برملا اظہار کیا اور اپنے قربت وقرابت والوں کے سامنے بھی اور غائبانہ بھی اور ان کے خلاف بھی بسا اوقات کیا کہ وہ سب عادل فطرت سمجھے گئے۔ ویسے صدق مقالی عرب قومی روایت اور قریشی سماجی رویہ تھی اور کذب اور

۱۔ مثلاً مکی سورۃ الشوریٰ:۱۵، ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ کی شرح وتفسیر میں متعدد مفسرین نے اسے صرف دعوت وارشاد تک محدود کر دیا ہے۔

۲۔ اس محدود وناقص شرح کا سبب صرف یہ ہے کہ علماء ومفسرین اور مفکرین کے خیال ناقص میں یہ جم گیا ہے کہ مکی دور میں سید المرسلین ﷺ اور صحابہ کرام صرف دین حق کی تبلیغ وارشاد پر مامور تھے اور شریعت وقانون سے آزاد تھے۔ سماجی معاملات میں عدل وانصاف کا کام وہ آپ کی مکی نبوت کے دائرے میں نہیں شامل کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی نبوت ورسالت کے اول روز سے خالص دین وشریعت محمدی سے سرفراز تھے اور عدل وانصاف خواہ شخصی ہو یا دینی یا وسیع تناظر میں سماج کے معاملے میں آپ سے بڑھ کر اور کون عادل ہو سکتا تھا یا عدل کر سکتا تھا۔

جھوٹ اور غلط بیانی کو نہ صرف برا سمجھا جاتا بلکہ شرافت کے خلاف گردانا جاتا تھا۔ دربار نجاشی میں صحابہ واسراء قریش نے اور دربار ہرقل میں حضرت ابوسفیان اموی رئیس وفد وکاروان قریش نے سید المرسلین ﷺ کے بارے میں قول حق ہی بولا تھا۔[1] عدل وانصاف قولی کی بہت سی شہادتیں روایات سیرت، تاریخ اور واقعات وتفاسیر میں ملتی ہیں اور صرف ان کا بیان ہی ایک دفتر تحقیق کا متقاضی ہے صرف چند مثالیں:

دشمنان دین وجان کا اعتراف حق: رسالت محمدی کی حقانیت کی تصدیق تو قریب قریب تمام اکابر وخواص قریش کو تسلیم تھی۔ ولید بن مغیرہ مخزومی، عاص بن وائل سہمی، ابوجہل مخزومی، ابولہب ہاشمی اور عقبہ بن ابی معیط اموی جیسے متعدد اکابر کو اعتراف تھا لیکن شخصی دشمنی یا قبائلی وخاندانی عصبیت سے انکاری تھے۔

رسول اکرم ﷺ کا قول حق دین وشریعت اور سماجیات میں: صرف وہ واقعہ کافی ہے جب آپ نے ابوطالب ہاشمی کی مجلس اکابر میں چاند سورج کو دائیں بائیں ہاتھوں میں رکھنے کی بات کہی تھی۔ اس کے علاوہ آبائی دین کی مخالفت، دین اسلام کی حمایت اور عام صحابہ اور کمزور مظلوم صحابہ کی مدافعت میں آپ کے ارشادات میں ابوطالب اور دوسرے اکابر سے بھی آپ نے یہی فرمایا تھا کہ یہ ہمارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صحیح دین ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا واحد پسندیدہ دین ہ۔ے اور بت پرستی یا غیر اللہ کی عبادت شرک وظلم ہے۔ جیسا کہ آیت قرآنی میں ہے۔

صحابہ کرام وصحابیات کا قول عدل وانصاف عوم اوراقربا واکابر قوم کے سامنے: مظلوم صحابہ کا دین حق ان کا اعتراف، ان کے مقاطعہ اور ظلم پر احتجاج اور متعدد مواقع پر اسلام، رسول اکرم ﷺ اور اسلامی سماجی نظام

1- دربارِ نجاشی میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دو خطباتِ پیغام ورسالت اور حقانیت خاتم النبیین ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت ورسالت کے بارے میں تھے۔ موخر الذکر بھی صحابہ کرام کے اجماعی اتفاق سے صحیح اسلامی نقطہ نظر پیش کرنے کا فیصلہ ہوا تھا خواہ وہ فکر وعقیدہ عیسائی کے خلاف ہو۔ حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے ایمانی صلابت سے اسلامی عقیدہ وفکر کو ہی صحیح عیسائی عقیدہ ثابت کیا تھا۔ بحث کے لیے مکی اسوہ نبوی کا باب دوم اور اس کے ماخذ ابن اسحاق وغیرہ۔
صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوسفیان اموی شام / ایلیا میں تھے جب رسول اکرم ﷺ کے نامۂ مبارک کے بارے میں اور خاص رسالتِ مصطفی ﷺ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ہرقل روم نے قریشی کاروان تجارت کے قائد کو طلب کیا تھا اور کاروان کے دوسرے اراکین کو ہدایت کی تھی کہ اپنے قائد وامیر کے بیانات کی تصدیق یا تکذیب کریں۔ اگرچہ حضرت ابوسفیان اموی اس وقت غیر مسلم تھے، لیکن سچ بولتے تھے کہ صدق مقالی ان کی عرب سرشت میں تھی اور کسی نکتہ پر غلط بیانی ان کی تکذیب تک لے جاتی۔

کی مدافعت میں متعدد اکابر صحابہ کے بیانات بالخصوص ظلم وجور کے معاملات میں اور ہجرت حبشہ میں ہجرت مدینہ کے تعلق سے۔[1]

عملی عدل معاشرتی:

قول کا ایک لازمی تعلق فعل وعمل سے بھی ہے اور مکی آیات کریمہ میں عملی عدل وانصاف سماجی کا فریضہ انجام دینے کا حکم بالواسطہ یا براہ راست دیا گیا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس عملی عدل معاشرتی کا بڑا جرأت مندانہ ایک لحاظ سے نفسیات / سائیکی ساز نمونہ واسوہ پیش کیا اور سماجی طبقات کو اس کے لیے برانگیختہ کیا۔ مظلوم وآفاقی تاجروں اور بیرونی زائروں کو اکابر قریش میں سے متعدد ظالموں جیسے ابوجہل مخزومی، عاص بن وائل سہمی وغیرہ سے محض اپنی اخلاقی قوت وایمانی صلابت سے نہ صرف بچایا بلکہ مظلوموں کو ان کا حق دلایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلم ضعیف افراد وطبقات کو مظالم سفہائے قریش سے بچایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان میں سے متعدد کو غلامی یا جبر کے چنگل سے آزاد کرایا۔ دوسرے صحابہ کرام نے بھی عدل معاشرتی کے عملی جہات کو پروان چڑھانے اور بروئے کار لانے کا کارنامہ انجام دیا۔ صحابیات طاہرات بھی ان سے پیچھے نہ تھیں۔[۲]

مدنی آیات کریمہ میں ہدایات عدل وقسط کا بیان زیادہ صراحت اور تنوع کے ساتھ آتا ہے مگر وہ بنیادی مکی عام فرمان عدل کا توضیحی بیان ہے اور بہت معنی خیز بھی۔ مکی آیات کریمہ میں شہادت حق اور قوامی عدل وقسط کا

۱- تمام مصادرِ سیرت اور کتب وتالیفات متاخرین کے مختلف مباحث میں ان بیانات کا ذکر ملتا ہے۔ مکی اسوہ نبوی کے مباحث میں اس پر خاصی بحث ہے۔

۲- مکی اسوہ نبوی کی بحث مدافعت دین وسماج بالخصوص ملاحظہ ہو مآخذ میں ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۸۲-۱۶۷ ومابعد کے مباحث: مباداة رسول الله ﷺ قومه.... /ذكر مالقى رسول الله من قومه؛ سہیلی میں ان کی شرح وتفسیر کے علاوہ بخاری کے مختلف ابواب وکتب خاص کر قبل بعثت اور مکی دور کے واقعات سیرت میں اس قسم کے عناوین ومباحث ہیں؛ بخاری / **فتح الباری شرح صحیح البخاری**، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۷۹ء، ج ۷، ص۲۰۷ ومابعد: كتاب مناقب الانصار، باب ذكر مالقى رسول الله ﷺ واصحابه من المشركين بمكة وغیرہ مختلف ابواب۔ خواتین اور ان کے عملی اقوال حق واقدامات اور ان کے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے سماجی عدل وانصاف کے واقعات کے لیے کتاب خاکسار، رسول اکرم ﷺ اور خواتین، ایک سماجی مطالعہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء کے مختلف مباحث۔

جس طرح ذو معنی اور وسیع الاطراف حکم آیا ہے وہ مدنی آیات مقدسہ میں مفقود ہے یا تابع مفہوم ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور اہم ترین نکتہ ہے کہ مدنی آیات واحکام میں فروعی اور خاص خانگی معاملات سیاسی ملی امور اور عام سماجی انحرافات سے زیادہ ارتباط و تعلق رکھتا ہے۔ ان کا ایک مختصر تجزیہ مکی آیاتِ عدل کا امتیاز مدنی احکامِ قسط وانصاف سے نمایاں طور سے واضح کردے گا۔

عورتوں / ازواج کے باب میں عدل وانصاف کرنا: اگرچہ وہ ناممکن العمل امر ہے۔ سورۃ النساء کی آیات کریمہ ۳ اور ۱۲۵ میں بالترتیب آیا ہے: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا.... فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً...الخ / یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ....الخ﴾

خواہش نفس عدل گستری میں حائل نہ ہونے کی تنبیہ وہدایت: اسی سورۃ النساء کی آیت کریمہ ۱۳۵ میں ہے: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا...الخ﴾۔

کسی فرد / قوم کی دشمنی عدل نہ کرنے کے جرم سے باز رکھنے کی ہدایت: سورۃ المائدۃ ۸ میں ہے: ﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾

عام فیصلہ وعدالت میں عدل وانصاف کا حکم: سورۃ النساء ۵۸ میں ہے: ﴿وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ سورۃ المائدۃ، ۴۲ ﴿وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾

باغی گروہ اور مرکز گریز عناصر مسلمانوں کے ساتھ ان کی رجعت وانابت کے بعد عدل وانصاف کا فیصلہ: سورۃ الحجرات، ۹ ﴿فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا...الخ﴾

خواتین اور بیویوں کے معاملات طلاق ومعاشرت میں اختلاف ونزاع پر متعدد مدنی آیات کریمہ مختلف حوالوں سے آئی ہیں اور عدل وانصاف کا تقاضا کرتی ہیں۔

عورتوں کے ساتھ نکاح میں عدل وقسط / خاص کر یتیم بچیوں کے باب میں: سورۃ النساء، ۱۲۷ ﴿وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ﴾

طلاق اور دوسرے خانگی معاملات میں اختلاف ونزاع پر گواہی اور عدل کا التزام: سورہ الطلاق، ۲ ﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾

دوران حج و عمرہ اور بحالت احرام شکار اور قتل مویشی اور ہدی کی قیمت کی تعیین میں عادلوں کی گواہی: سورۃ المائدۃ ،۹۵ ﴿یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ سورۃ المائدۃ،۱۰۶ ﴿اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾

نسب ونسبت خاندانی میں عدل وقسط کا حکم: سورۃ الاحزاب، ۵ ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾

مالیات / معاشی امور میں اختلاف ونزاع کی صورت میں عدل وانصاف کی تاکید خاص: سورۃ البقرۃ، ۲۸۲ ﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾

مالی معاملات میں کتابت وتحریر، تجارتی امور میں عدل کا التزام کاتب وولی وغیرہ کے لیے: سورۃ البقرۃ، ۲۸۲ ﴿وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ / فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾

کفار ومشرکین / غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف لازمی اور اس کا معیار وعیار: سورۃ الممتحنہ، ۸ ﴿لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ﴾

ازواج پر صرفہ کفار کی ادائیگی میں عدل وانصاف اور احسان کی ہدایت: سورۃ الممتحنہ، ۸ ﴿...اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ﴾

بے لاگ قیام عدل نفاذ انصاف کا حکم عامۃ المسلمین کو: سورۃ المائدۃ، ۸ ﴿وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾

امت مرحومہ کو عدل وانصاف کا علمبردار اور اللہ کی جناب میں گواہی کی ذمہ داری: سورۃ النساء، ۱۳۵ ﴿قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ سورۃ المائدۃ،۸ ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾[1]

۱۔ مصادرِ تفسیر وحدیث بالخصوص ابن کثیر وبخاری میں ان آیات کریمہ سے متعلق روایات واحادیث اور ان پر مباحث کے لیے اماماں کبیر رازی، طبری وغیرہ کے متعلقہ ابواب۔

مکی ومدنی آیات کریمہ میں ارتباط:

مفسرین کے اختلاف فہم، تفسیری روایات کی کثرت اور متصادم کیفیت اور زمانی وتوقیتی بُعد اور تاریخی اختلاف جیسی چیزوں نے مکی اور مدنی آیات واحکام کے ارتباط میں خاصا ابہام واشکال پیدا کیا اور تنزیل الٰہی اور شریعت ربانی کے معنوی جوہر ووحدت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اسلامی احکام وتشریعی ہدایات کے تسلسل اور کتب سابقہ کی آیات وہدایات کے تواتر اور ان کے آخری صحیفہ الٰہی سے ارتباط کو بالعموم نہیں سمجھا گیا۔ جن علماء محققین اور مفکرین ومفسرین کی باریک بیں اور حقیقت شناس نظریں تھیں انھوں نے فکر اسلامی کی وحدت وتواتر کی حقیقت خوب سمجھ لی اور اپنی اسلامی بصیرت اور تشریعی تبحر اور دینی وسماجی دور رسی سے اسلامی فکر کے تسلسل وتواتر کے تناظر میں مکی ومدنی آیات کریمہ کا ارتباط بھی جان لیا۔ بلاشبہ بہت سے احکام والتزامات بعد کے مدنی دور میں آئے۔ لیکن ان کی نوعیت وحیثیت توضیحی، تشریحی اور اضافی تھی، اصل جوہری وبنیادی نہ تھی۔[1] امامان اسلام میں بخاریؒ، شاطبیؒ، رازیؒ، غزالیؒ، ابن کثیرؒ، شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے عبقری اکابر نے تواترِ وحدت کی بناپر مکی دور کے احکام وآیات کو جوہر گردانا۔ دوسرے مسائل ومعاملات سے قطع نظر عدل وانصاف کے اعتبار سے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مکی دور میں امت مرحومہ اور اس کے سید وآقا ﷺ کسی کمتر معیار پر قائم تھے یا عدل وانصاف کے بلند ترین معیار ومثالی عیار پر مدنی دور کی تنزیلات کے بعد فائز ہوئے تھے۔ یہ نقص ونارسائی فہم ہی نہیں نقص ونقصان ایمان ہے۔ تمام انبیائے کرام اور ان کے خاتم وسید ﷺ عدل وانصاف کے اول روز سے پیکر وتمثال تھے اور زمانہ کے انقلابات اور تاریخ کے دھاروں نے اس میں کمی کی تھی اور نہ زیادتی۔ وہ جوہری طور سے عدل الٰہی سے مستنیر اور نبوت ربانی سے مستفیض بلند ترین معیار عدل پر نہ صرف فائز تھے بلکہ بے مثال وبے نظیر تھے۔ ان کے عدل وانصاف اور قسط واحسان سے تو کائنات کے تمام ذوی روح ہی نہیں جمادات وبے جان اشیاء بھی اکتساب فیض کرتے تھے اور عالم ملکوت میں ملائکہ اور دوسرے ساکنان پاک عدل وانصاف نبوی اور احسان وکرم رسولی پر حیرت وافتخار کرتے اور اپنی کمتری کا احساس کرتے۔ اس عالم آب وگل میں ابن کثیر جیسے مفسرین وشارحین نے مکی آیات کریمہ کا ارتباط وتعلق معنوی ووحدانی مدنی آیات عدل سے مختلف سورتوں کی آیات میں کیا ہے۔[2]

۱۔ کتاب خاکسار "مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء" باب اول۔

۲۔ تفسیر ابن کثیر میں مکی ومدنی آیات کریمہ کے تعلق کے لیے مذکورہ آیات کی تفسیر۔

مکی آیاتِ عدل وانصاف اور مدنی بیناتِ قسط وعدل کا ایک مختصر تجزیہ اس وحدتِ فکر کو اجاگر کر دے گا جو بظاہر دو ادوار میں سے فرق زدہ دکھتا ہے۔ عام عدل وانصاف کی آیات شوریٰ و نحل وغیرہ بلاشبہ مدنی آیات مائدہ ونساء وغیرہ کی بنیاد ونہاد ہیں کہ سب میں آپ کو عدل کا حکم دیا گیا اور کمال کا پیرایہ اختیار کیا گیا کہ آپ کی زبان سے اسے ادا کیا گیا جب کہ اولین مکی آیت کریمہ میں ہے اور دوسری مکی آیات میں وہ حکم الٰہی بن کر اتارا گیا۔ اس طرح عادل وغیر عادل کا موازنہ کرنے پر اول موصوف کو فضیلت عطا کی گئی۔ اور قولی عدل کا اور وہ بھی اپنے عزیزوں اور حبیبوں کے خلاف اور اپنی جانوں کے برعکس حکم دے کر عدالت عام اور عدل مثالی کا معیار قائم کیا گیا جو مدنی آیات میں قوام وشاہد عدل اور قوام وشاہد الٰہی کی صورت میں بیان کر کے توضیح وتشریح کی گئی۔ مکی آیت کریمہ میں ہوائے نفس اور نفسانی خواہش کی بنا پر عدل وانصاف سے گریز واجتناب کرنے کی جو ہدایت دی گئی اس کی وضاحت مدنی آیت میں یوں کی گئی کہ کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل وانصاف سے ہاتھ کھینچ لینے کی حرکت وجرم پر نہ اکسائے۔ یہ دشمنی وعداوت تو ہوائے نفس کی ہی صرف ایک صورتِ بد ہے۔ مکی آیت میں وارد لفظ "الھویٰ" ہر قسم کے گریز، بدخصلت اور کجی کو محیط ہے اور اس میں بے جا محبت وخاندان واعزہ کی جانبداری اور طرفداری بھی شامل ہے۔ خاص خاص معاملات معاشرت میں طلاق، تجارت، نکاح وازواج بالخصوص یک زوج یا بالمقابل تعداد ازواج، ناپ تول وغیرہ کے باب میں جو مدنی آیات ہیں وہ خالصتاً مکی آیات پر اضافات بھی نہیں صرف ان ہی کی بازگشت ہیں۔ نسب ونسبت کی بابت مدنی آیت بظاہر نئی اور اضافی لگتی ہے مگر حقیقت میں وہ بھی ان کے دلوں میں بنیادی تھی۔ وحدت فکر واتحاد ہدایت کے لحاظ سے دونوں ادوار کی آیات عدل وقسط مل کر اسلامی عدل وانصاف کا ایک مثالی اور احسانی معیار قائم کرتی ہیں اور اسی کا شاخسانہ تھا کہ اسلام کے دشمنوں نے بھی آپ کے عدل وانصاف کا برملا اعتراف کیا اور اس کو آسمان وزمین کے محور پر قائم رکھنے والا بتایا۔[1]

آیات واحکام عدل کا سیرت نبوی سے ارتباط:

معاندین ومخالفین اسلام اپنی غیر عادلانہ فکر والزام تراشی سے اور ناقصان فہم وجاہلان بے دانش اپنی کم فہمی اور نارسائی سے یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی ان آیات عدل وانصاف میں ہدایت وحکم کا التزام وذکر ہے۔ ان پر عمل وقیام اور ان کے نفاذ کا اثبات کہاں ہے؟ نظریہ وعمل کے فرق میں مبتلا بھی اسی خلجان میں مبتلا ہو سکتے

1۔ مذکورہ بالا حواشی وتعلیقات کے علاوہ بعد کے مباحثِ مقالہ میں ان پر بحث ارتباط آتی ہے۔

ہیں لیکن جن کی نظر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا (کان خلقه القرآن) پر ہے، جو کہ مکی آیت کریمہ کی شہادت ربانی ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ کی تفسیر و تعبیر ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ امت مرحومہ اور ان کے سید و آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکم الٰہی سے سرتابی اور عدم تعمیل کی بات تو بہت دور کی ہے اس پر عمل آوری اور اس کی بجا آوری سے ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں کر سکتے تھے خواہ ان کی جان پر ہی کیوں نہ بن جائے۔ مکی آیت قرآنی کی تفسیر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا بظاہر مدنی دور کی لگتی ہے لیکن وہ روایت و ترسیل ہی کے اعتبار سے ہے معنوی وحدت کے لحاظ سے وہ مکی قرآن کو بھی اسی طرح محیط ہے جس طرح مدنی آیاتِ عدل سے۔ اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارتباط مکی و مدنی نبوت عالمگیریت و عدالت سے بھی ملتا ہے۔ منطقی طور سے بھی یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت و ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو احکام و ہدایات جناب الٰہی سے ملتی تھیں ان پر آپ کا عمل جاں گسل و جان کاہ ہوتا تھا۔ جس کا ایک اثبات " بَاخِعٌ نَّفْسَكَ " کی آیت کریمہ میں ملتا ہے کہ دعوت وارشاد اور تبلیغ وابلاغ کے احکام الٰہی کی تعمیل میں آپ اپنی جان و دل پر بنا لیتے تھے اور شدت تعمیل اور افراط عمل آوری سے اللہ رب العالمین آپ کو بڑی محبت و عقیدت اور احسان شناسی سے روکتا تھا لیکن آپ کی سرشتِ تعمیل اور فطرتِ بندگی جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جاں نثاری اور جاں سپاری سے کم نہ تھی کہ بارگاہ رب میں قربانی کے درپے ہو گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جان عزیز کو قربان کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ سیرت نبوی کے بہت سے واقعات بھی اس کے شاہد عدل ہیں۔[1]

خالص نظریاتی اور منطقی بحث و تمحیص سے عملی طور سے احکام و عدل پر عمل آوری رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح اثبات ہوتا ہے اسی طرح آپ کے قول و عمل اور واقعات حیات و سیرت سے بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ سیرت نبوی اصلاً اسلامی عدل وانصاف کے قیام و نفاذ کی عملی تفسیر ہے۔ دعوت و تبلیغ اور تعلیم کتاب و دین کا معاملہ ہو یا تزکیہ و تطہیر نفس کا، قرآن کریم و احادیث شریف کی تلاوت کا منصب ہو یا ان کی تشریح و تفسیر کا، آپ کے اپنے خانگی اور شخصی معاملات ہوں یا سماجی و معاشرتی مسائل کے گوناگوں الجھاوے، مالی و اقتصادی امور ہوں یا معاشیات و معیشت کے دقیق و وسیع اختلافات، سیاسی و تنظیمی تشکیل و تعمیر کے مختلف النوع ادارے یا ریاست اسلامی اور حکومت نبوی کے روز افزوں امور یا غیر ملکی حکمرانوں اور ملکی شاہوں سے متعلق تہذیبی اور تمدنی واقعات

۱۔ سورۃ القلم: ۵ کی تفسیر میں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارتباط قریب قریب تمام تفاسیر میں ملتا ہے۔

ہوں یا ان کے مراسم و معاملات غرض کہ انسانی معاشرت اور عصری معاملت کا کوئی بھی مسئلہ و معاملہ، رسول اکرم ﷺ نے ان میں عدل وانصاف کا ایک مثالی نمونہ اور عظیم ترین اسوہ قائم فرمایا۔[1] سماجی عدل وانصاف محض خارج وبیرون میں صراط مستقیم اختیار کرنے کا نام نہیں ہے وہ فرد بشر کے اندرون نفس اور جان وبدن سے شروع ہوتا ہے اور اندرون وبیرون دونوں کو عدالت گستری کی مثالی زنجیر سے خون و گوشت کی مانند باندھ دیتا ہے۔ سیرت نبوی میں بالخصوص اور عہد نبوی میں بالعموم سماجی عدل وانصاف کا تجزیہ و مطالعہ چند عناوین فکر انگیز اور سرنامہ ہائے روح پرور کے تحت کیا جارہا ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ عدل وانصاف محمدی صرف اجزاء فرد وسماج میں جاری وساری نہیں رہا بلکہ پورے معاشرہ وماحول کے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ تب ہی تو وہ خاتم النبیین ﷺ کا مثالی عدل وانصاف معاشرتی کہلایا۔

دینی معاملات میں عدل وانصاف:

تبلیغ و تعلیم وتزکیہ: اپنے فرائض منصبی کی بجاآوری میں سید المرسلین نے عدل وانصاف کا مثالی معیار قائم فرمایا اور بلا اختلاف رنگ و نسل اور بلا تمیز علاقہ و قوم اور بلا تفریق سماجی واقتصادی ہر شخص اور طبقہ کے سامنے تلاوتِ کتاب اور تبلیغ حق کے ذریعہ اللہ کی طرف بلایا اور ان سے قبول اسلام کا شرف پانے والوں کو بلا کسی امتیاز تعلیم وتزکیہ کا فرض نبھایا اور تمام انسانیت بلکہ سارے عالموں کے لیے رحمت الٰہی (رحمۃ للعٰلمین) ہونے کا عملی اثبات فرمایا۔ سید المرسلین کا دعوت و تبلیغ اور تعلیم وتزکیہ کا طریقہ اقدامی وحرکی تھا آپ بنفس نفیس مدعوین کے پاس جاتے اور ہر مقام و محل میں اور ہر آن وہر وقت میں اپنے فرائض منصبی پوری جاں کاہی سے انجام دیا کرتے۔ طالبین حق و متلاشیان دین جناب رسالت وخدمت نبوی میں حاضری دیتے تو ان کا اکرام واعزاز فرماتے اور ان کی طلب کے مطابق عطا فرماتے۔ اس ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی دعوت وارشاد کے پیہم تقاضوں کو پورا کرنے میں اپنی ذات کا آرام توج ہی دیتے، مناجات رب کا وقت بھی کم کر دیتے اور اس کا مطالبہ راتوں کی عبادتوں اور شب گذاریوں سے پورا کرتے جس کا بڑا دل آویز ذکر سورہ مزمل وانشراح وغیرہ میں خود رب ذوالجلال نے کیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اور تعلیم وتزکیہ کے مکی اور مدنی ادوار میں وحدت و یکسانی رہی۔ طریق وانداز بھی یکساں رہے اور تسلسل وتواتر بھی قائم رہا۔[2]

۱۔ سماجی عدل وانصاف کے ابواب وجہات بہت وسیع ہیں، مذکورہ بالا صرف چند موضوعات عام واہم ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو مقالہ خاکسار "مدنی زندگی میں دعوت نبوی۔۔۔ مزاج ومنہاج" دعوت، نئی دہلی خاص شمارہ، حیات طیبہ کا دعوتی پہلو، مارچ ۲۰۱۳ء۔

ظاہر بیں نگاہوں اور کم فہم سیرت نگاروں اور حقیقت ناآشنا مورخوں کو جو شکوہ وشکایت کا موقع ملا، وہ انکی اپنی کج فہمی کا پیدا کردہ تھا۔ عدل تبلیغ وتعلیم کے باب میں چند خاص جہات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ کج فہموں اور نارساذہنوں کی طرح حقیقت اوجھل رہے گی۔

بعض روایات واحادیث سے یہ غلط فہمی پیدا کردی گئی کہ دوسرے انبیائے کرام کی طرح سید المرسلین ﷺ پر اول اول ایمان لانے والے غریب غرباء اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے طبقات کے غلام وموالی اور بے کس ونادار لوگ تھے۔ یہ یک رخی تصویر کشی اور جزوی بیانیہ ہے۔ سید المرسلین ﷺ کے اولین جاں نثاروں اور مومنوں میں دونوں اعلیٰ وادنیٰ طبقات وافراد بھی تھے اور خاندانی شرفا وسادات کے نونہال بھی۔ اولین سابقین میں حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدی، ورقہ بن نوفل اسدی، آل یاسر اور عظیم المرتبت خواتین زنیرہ وفکیہہ وبرکہ وغیرہ تھیں۔ یہ سید المرسلین کی ہمہ گیر دعوت وتعلیم کے گلہائے سرسبد تھے جو تمام طبقات معاشرہ وقوم کی نمائندگی کرتے تھے اور ان میں قریشی اور مکی اصل کے مسلمانان مکرم کی مانند موالی وحلفاء کے طبقات آفاقی بھی برابر کے شریک تھے کہ ناوکِ نبی نے کسی صید کو نہ چھوڑا تھا زمانے میں۔[1]

عبد المتعال صعیدی جیسے جدید تجزیہ نگاروں کا نظریہ کہ اولین مسلمانانِ مکہ سب کے سب نوخیز ونوجوان تھے اس لیے اسلام جوانوں کی تحریک تھی جزوی طور سے صحیح ہے کہ ممتاز افراد اور مشہور صحابہ میں اکثریت جوانوں کی تھی لیکن کلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں پختہ عمر کے افراد بھی متعدبہ تعداد میں تھے اور متعدد شیوخ

1- اصلاً یہ حدیثِ ہرقل (دربار ہرقل میں حضرت ابوسفیان اموی کی حدیث) میں شاہ روم کے ایک تبصرہ پر مبنی تاثر ہے کہ تمام انبیائے کرام کے اولین پیرو نادار ہوتے رہے ہیں۔ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ پریس، لندن، ۱۹۵۳ء نے سابقین اولین کے خاندانی تجزیہ میں مکہ مکرمہ کے تمام شریف خاندانوں کے نوجوانوں کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے اور خاصا واقعاتی تجزیہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ کمزور طبقات کے سابقین کا بھی موزوں بیان پیش کیا ہے۔ بعض دوسروں کے ہاں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے لیکن معمر، عمر رسیدہ اور پکی عمر کے سابقین وسابقات کا ذکر ان کی عمروں کے حوالے سے سب نے گریز کیا ہے۔ بیشتر نے تو اس کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ان کے معمر عزیز حضرت ورقہ بن نوفل اسدی رضی اللہ عنہ جیسے بزرگوں مثلاً عبیدہ بن حارث مطلبی اور ان کے برادروں کا ذکر خیر ندارد ہے یا ناکافی۔ سابقین اولین کے قبول اسلام کے وقت ان کا سن متعین کرنے کی ایک سماجی تحقیق ابھی تک باقی ہے۔ صرف ایک مثال اس کی اہمیت بتانے کے لیے کافی ہے حضرت عبد الرحمن بن عوف زہری رضی اللہ عنہ اور ان کے طبقہ کے کئی صحابہ وسابقین قبول اسلام یا ہجرت مدینہ کے وقت کافی پختہ عمروں کے تھے لیکن ان کا ذکر بھی نہیں آنے دیا جاتا۔

وبزرگان قوم کے مرتبہ کے تھے۔ حضرت عبیدہ بن الحارث مطلبی اور ان کے برادران کرام اور خاندان مظعون کے متعدد سابقین بزرگ طبقات کے تھے۔ حضرت خدیجہؓ اور ان کے عزیز وخاندانی حضرت ورقہ بن نوفل وغیرہ تو اپنے سید وداعی وآقا سے زیادہ عمر رکھتے تھے۔ (۱)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اولین شوہر کے فرزندوں میں ہالہ اور ہند فرزندانِ ابی ہالہ تمیمی اور بعض موالی نبوی بھی خاصی عمروں کے افراد تھے۔ سماجی اختلاف دینی کے لحاظ سے یہ تجزیہ بھی اہم ہے۔

دعوت و تبلیغ و تعلیم وتزکیہ کے باب میں عدل وانصاف نبوی کا ایک دلچسپ اور اہم زاویہ سورہ عبس کی آیات اولین میں آیا ہے۔ ابتدائی آیات کریمہ میں بظاہر رسول اکرم ﷺ کی جناب الٰہی سے سرزنش وتنبیہ کا پہلو نکالا گیا ہے کہ آپ نے ایک نابینا سے اعراض فرمایا اور سادات قوم پر توجہ مرکوز رکھی مگر وہ دراصل ترجیح کار کا معاملہ تھا۔ خیال خاطر نبوت میں یہ حقیقت پیوست اور خواہش گھر کر گئی تھی کہ اکابر وسادات قوم کی دین پناہی سے پوری قوم کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے کہ عوام اپنے خواص کے اور قبائل اپنے مشائخ کے زیر اثر آتے ہیں اور ان کی راہ پر چلتے ہیں اور اکابر قریش کی طرف توجہ عالی میں خلل پڑنے سے خاطر عاطر میں ناگواری کا شائبہ جھلک آیا کہ وسیع وموثر ترین ذریعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے تبلیغ ودعوت اور تعلیم وتزکیہ کے باب میں طلب حق کو ترجیح دی اور استعفادہ اور گریز اکابر کی مذمت کی۔ یہ ظاہری اور حقیقی ترجیح کا معاملہ تھا اور عدل وانصاف کے خلاف نہ تھا اور اگر بغرضِ روایات تھا بھی تو اس کی تصحیح کر کے طلب حقیقی کو معیار بنانے کا اسوہ اپنا لیا گیا۔ غالباً اسی تنبیہ وتذکیر الٰہی کا نتیجہ تھا کہ نابینائے قوم اور بینائے اسلام حضرت ابن ام مکتوم جمحیؓ کو سید المرسلین ﷺ نے امامت کبریٰ کا مقام دیا تھا۔ دینی معاملات اور تشریعی امور میں نہیں ریاستی اور تنظیمی معاملات میں بھی ان کو نائب الرسول اور خلیفۃ النبی کے مرتبہ پر فائز کیا اور اپنے بزرگ ترین اور سابقین اولین پر بھی ان کی فضیلت وامامت ثابت کر دی۔ حضرت ابن ام مکتومؓ کی سیرت وسوانح کا مطالعہ اس زاویہ سے بھی کرنا ضروری ہے۔ (۲)

۱۔ عبد المتعال صعیدی، الشباب فی العہد السری للاسلام، قاہرہ، ۱۹۶۰ء۔ کا تجزیاتی مطالعہ مختصر بھی ہے اور سرسری بھی۔ ان کے ہاں سابقین اولین میں نوجوانوں کی عمروں کی تعیین میں خاصی جلد بازی اور عجلت کا پتہ چلتا ہے اور متعدد روایات میں محاکمہ وتجزیہ کا فقدان بھی ہے۔ وہ کم سے کم عمروں کو قبول کرنے میں صرف اپنے نظریہ کے اثبات کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اور پختہ عمروں کے صحابہ وصحابیات کا تذکرہ نظر انداز بھی کرتے ہیں۔

۲۔ ابن کثیر، القرآن العظیم، سورۃ العبس کی روایات اور دوسری کتب ماثورہ میں ان کا بیان اور ان پر جدید مفسرین کرام کی آرا خاص نقطہ ہائے نظر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بخاری / فتح الباری، کتاب التفسیر، سورہ عبس، ۶۹۲– ۶۹۳ / ۸ میں حافظ ابن حجر

دینی اور سماجی عدل وانصافِ نبوی کا ایک سلسلہ زریں واقعات سیرت وتاریخ اسلام میں نظر آتا ہے۔ اس کے چند نمونے بطور مثال حاضر ہیں:

سابقین اولین کی خاطر داری اور ان کی سماجی ودینی مرتبت وجلالت کی حفاظت کی خاطر آپ ﷺ نے حضرت صدیق امتؓ کو کہ خیر البشر کے بعد بالاتفاق خیر الصحابہ ہیں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اوران کے کمزور سماجی مرتبہ والے صحابہ سے معافی طلبی پر مجبور کیا تھا کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم ترین سردار قریش کے باب میں ان کے اسلامی جذبات وکلمات پر نقد کرکے بے ادبی کی تھی۔ ان کی ناراضی کو ناراضی رب بتا کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معافی مانگنی اور معذرت کرنی پڑی۔[1] مگر یہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے جن کو آپ ﷺ نے اپنی آخری بیماری میں امامت نماز و امامت کبریٰ کے لیے پورے جزم وعزم کے ساتھ متعین فرمایا تھا۔

شیخین کریمین کے بعض سماجی اور شخصی اختلافات میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے معذرت کرنے پر صرف اس لیے مجبور کیا کہ وہ عظیم ترین جاں نثار اور محبوب ترین صحابہ کی شان والا اور

نے شرح حدیث و آیت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث ترمذی وحاکم اور ابن حبان وغیرہ کی مختلف سندوں سے یہ نقل کی ہے کہ یہ سورۃ نابینا حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی۔ انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا: یارسول ارشدنی (مجھے ہدایت دیجیے) اور نبی ﷺ کے پاس ایک عظیم مشرک ازسادات (عظمائے مشرکین) بیٹھا تھا۔ نبی ﷺ نے ان سے اعراض کیا اور موخرالذکر پر توجہ مرکوز رکھی اور یہ فرماتے رہے: کیا تم کو میری بات میں کوئی قباحت نظر آتی ہے اور وہ کہتا رہا: نہیں نظر آتی:۔۔(أَتَرَى بِمَا أَقُولُ بَأْسًا فَيَقُولُ لَا فَنَزَلَتْ عَبَسَ وَتَوَلَّى)۔۔۔ عبدالرزاق نے اس عظیم مشرک کا نام ابی بن خلف بتایا ہے اور سعید بن منصور نے اس کا بھائی امیہ بن خلف قرار دیا ہے۔ جبکہ ابن مردویہ کے مطابق وہ فرزندان ربیعہ عتبہ وشیبہ مخاطبین نبوی تھے۔ عوفی نے ابن عباس کی روایت میں کہا ہے کہ وہ تین تھے: عتبہ، ابوجہل اور عیاش۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت میں ہے کہ خدمت نبوی میں اس وقت مشرکین کے اکابر موجود تھے جن میں عتبہ اور ابوجہل بھی تھے اور یہ تمام اقوال کا جامع ہے۔ اس تفصیل سے متعدد جہات دعوت کا علم ہوتا ہے اور دینی تبلیغ واشاعت میں سماجی انصاف وعدل کی وسیع ترین جہت واضح ہوتی ہے۔ مزید جہات پر بحث کا موقع یہاں نہیں ہے۔

1- بحث کے لیے کتاب خاکسار: "عہد نبوی کے اختلافات۔۔۔ جہات، نوعیتں اور حل"، دارالنوادر، لاہور ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۹-۱۵۰ بحوالہ بخاری / فتح الباری، ج ۸، ص ۷۵-۷۱ ومابعد: كتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالداً۔

خیال وخاطر کے منافی تھا۔ حالانکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو خود اعتراف تھا کہ زیادتی ان کی تھی۔ سماجی مرتبت کا تحفظ اور مقام ومرتبت صحابیت کا دفاع وبقا بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دینی عدل وانصاف کا ایک خاص زاویہ ہے۔ (۱)

اپنی انّا اور باندی حضرت ام ایمن برکہ حبشیہ رضی اللہ عنہا سے سید المرسلین کا تعلق خاطر اور حسن سلوک اور مادر مہرجان کا درجہ عطا کرنا اس سماجی دینی عدالت گستری کا ایک اظہار تھا اور ایسی کنیزان وبندگان عالی مقام کے دینی وسماجی مرتبہ ومقام کی درجہ بندی وحفاظت بھی اس کا عطیہ تھا۔ (۲)

مکی دور نبوی کے وسط میں مظلوم ومقہور صحابہ وصحابیات کی حفاظت وجوار کے لیے خود مکی اشراف واکابر سے جوار وپناہ کی فراہمی عدل سماجی کی بنا پر تھی۔ بنفس نفیس آپ نے قریش کے ایک سردار مطعم بن عدی نوفلی سے جوار طلب کی تھی۔ یہ عرب جاہلی روایت تحفظ، ابراہیمی طریقت اور اسلامی سنت تھی جو سماجی انصاف دلاتی تھی۔ (۳)

اشراف خاندانوں کے افراد وطبقات اسلامی کے تحفظ ودفاع کے لیے آپ نے ایک عیسائی بادشاہ، نجاشی حبشہ، کی عدل گستری کی بنا پر ہجرت کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس کا انتظام بھی کیا اور شاہ نجاشی کو خطوط ومراسلات بھیج کر ان کے قیام وسکونت کو آرام دہ بنایا۔ اختلاف مذہب ودین کے باوجود سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ حقیقت بیں

۱- مذکورہ بالا کتاب اختلاف میں شیخین کریمین کے اختلاف پر ایک تجزیاتی فصل، ملاحظہ ہو: ص ۱۳۰-۱۲۷۔ اس کا خاص ماخذ بخاری کی احادیث: ۳۶۷۰-۳۶۶۷ وغیرہ کے علاوہ اصلاً محمد بن اسماعیل بخاری، **الجامع الصحیح المختصر**، دار ابن کثیر، الیمامة، بیروت، الطبعة الثالثة ۱۴۰۷ء، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت، باب فضل ابی بکر وغیرہ اور اس کی تشریحات ابن حجر ہیں۔

۲- اراضی کے باب عطا وواپسی میں اس کا ذکر وحوالہ آتا ہے۔

۳- جوار وتحفظ حاصل کرنے اور مشرکین اور معاندین اسلام کے زیر سایہ بہ حفاظت زندگی بسر کرنے اور دین حق کے لیے مساعی کرنے کا ایک خاص زاویہ حکمت نبوی تو ہے ہی، مگر وہ سماجی عدل وانصاف کے ایک مسلمہ قانون جاہلی سے استفادہ اور اس کے ذریعہ سابقین اور معذورین کی حفاظت مال وجان کا ایک سماجی عادلانہ طریق بھی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مکی اور مدنی ادوار میں بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور صحابہ کرام کو سماجی انصاف کا ذائقہ چکھایا تھا۔ بحث مفصل کے لیے ملاحظہ ہوں: مقالات خاکسار "عہد نبوی میں سماجی تحفظ کا نظام" تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۲ء؛ عظیم صحابیہ ام عبیس، جہات الاسلام لاہور، جنوری-جون ۲۰۱۴ء؛ نیز مکی اسوہ نبوی کے متعلقہ مباحث۔

میں عدل وانصاف سماجی کی رفعت ومنزلت اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ مکہ وقریش اور عرب کے دوسرے عادل شاہوں اور معدلت گستر سادات ومشائخ سے ارتباط وتحسین نبوی کا موضوع ابھی تک تحقیق طلب ہے۔[1]

خانگی زندگی میں عدل وانصاف نبوی ﷺ:

بعثت سے قبل حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدی رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کے دو معدلت گسترانہ پہلو بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے سے پندرہ سالہ زیادہ عمر کی ایک مطلقہ / بیوہ خاتون سے بیاہ کیا اور ان کی پوری زندگی میں پندرہ سال قبل بعثت اور دس سال بعد نبوت دوسری شادی نہ کی جبکہ قریشی وعرب روایات معاشرت میں کثرت ازواج ایک مقبول ومحبوب روایت ہی نہیں بلکہ سماجی بلند مرتبتی کی علامت تھی۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف اپنی زوجہ واحدہ کے ساتھ مثالی محبت واحترام بھری زندگی گزاری اور ان کے حقوق وفرائض ادا کیے بلکہ ان کے سابقہ ازواج کی اولاد کو اپنے ساتھ رکھا اور پالا پوسا اور ان کی تعلیم وتربیت کی۔ حضرات ہالہ بن ابی ہالہ اور ہند بن ہالہ فرزندان ابوہالہ تمیمی اور ہند بنت عتیق مخزومی رضی اللہ عنہ کو ایمان، علم اور اخلاق اور مکارم کی تعلیم دی اور سابقین اولین میں شمولیت کا شرف بخشا اور پھر ساری زندگی ان کی کفالت کی۔[2]

کفالت وتربیت میں عدل گستری نبوی کا ایک معاملہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی رضی اللہ عنہ کو اپنی کفالت میں لینے کا واقعہ ہے اور وہ احسان کے بدلے احسان کے حکم ربانی اور مروت عرب کے مطابق صرف اس لیے پیش آیا تھا کہ کبھی ابوطالب عم مکرم نے آپ کی کفالت کا شرف پایا تھا اور ان کی کسمپرسی اور مالی بدحالی کے زمانے میں

۱۔ ہجرت حبشہ پر بحثِ مصادر کا ایک تجزیاتی مطالعہ "مکی اسوہ نبوی" کے باب دوم میں آیا ہے اور مقالہ خاکسار "اسلام کی حفاظت واشاعت میں نجاشیؓ کا کردار" تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری-مارچ ۲۰۱۵ء اس پر مزید بحث پیش کرتا ہے۔ ابھی حبشہ کی اسلامی امت اور ان کے اثرات پر تحقیق باقی ہے اور حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ سے رسول اکرم ﷺ کے مراسلات وفرامین کا مطالعہ بھی ادھار ہے۔

۲۔ طبقات ابن سعد کی مختلف جلدوں میں ربائب نبوی ﷺ پر روایات ملاحظہ ہوں۔ خاکسار کی مختلف تحقیقات میں ان پر بحث آئی ہے جیسے عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت کے باب دوم میں ان کی تربیت وپرورش اور قبول اسلام کے حوالے سے۔ اس موضوع ربائب پر کئی مطالعات آچکے ہیں لیکن ایک بھرپور تحقیقی دفتر کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

ان کے فرزندان خاص کی کفالت وتربیت کر کے پرانا قرض چکا دیا۔ اسی تربیت نبوی نے کمسن وکمزور بچے کو شیر خدا بنایا اور اپنی چہیتی دختر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا ان سے عقد کر کے اہلبیت میں شامل کر کے وہ مقام ومرتبہ عطا کر دیا جو حضرت عثمان بن عفان اموی کو ذوالنورین بنا کر دیا گیا اور حضرت ابوالعاص بن ربیع عبشمی رضی اللہ عنہ کو اسی طرح اہل بیت میں شامل کر لیا گیا۔ (۱)

بقیہ ازواج مطہرات سے نبوی نکاحوں اور شادیوں کا معاملہ بھی سماجی عدل وانصاف کا ایک اعلیٰ اسوہ اور قابل تقلید نمونہ عالم انسانیت کے لیے ہے۔ حضرت سودہ بنت زمعہ عامری رضی اللہ عنہا سے شادی اپنی خانگی طمانیت اور خاندانی ضرورت کے ساتھ حضرت ام المومنین کے انتخاب میں ان کی "رعایات" میں موجود تھی۔ ایک یہ کہ وہ ایک محبوب اور مہاجر صحابی کی بیوہ تھیں اور مہاجرتِ حبشہ کے علاوہ فرقت شوہر کی گزیدہ تھیں اور ان کے اندرونی زخموں کا اندمال کرنا مقصود تھا دوم ان کی ماں شموس خاندان بنو النجار / خزرج کی دختر تھیں جو جد امجد عبد المطلب ہاشمی کا مادری خاندان / ننہال / اخوال تھا اور عرب روایات میں قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ۔ سوم سودہ بنت زمعہ عامری رضی اللہ عنہا اپنی صفات ستودہ کی بنا پر ام المومنین کے اعزاز کی مستحق تھیں اور ان کا برملا اظہار بعد کی زندگی میں ہوا۔ دوسری امہات المومنین میں حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ خطاب عدوی اور حضرت عائشہ بنت ابو بکر تیمی رضی اللہ عنہ کا خاص سبب نکاح اپنے شیخین کریمین اور صاحبین عظیمین کی سماجی اور دینی منزلت اور شخصی توقیر وتعظیم میں اضافہ کے ساتھ ان کو اہلبیت میں شامل کرنا بھی تھا۔ وہ محبت وشیفتگی شیخین کی عدل گسترانہ جزا تھی۔ حضرت جویریہ بنت حارث خزاعی رضی اللہ عنہا اور حضرت صفیہ بنت حیی نضری رضی اللہ عنہا سے ازدواج نبوی کا بابرکت سبب ان کی تالیف قلوب اور توقیر شخصی کے علاوہ ان کی قومی منزلت کی رفعت بھی تھی، ان کی قوم بالخصوص اول الذکر کے تمام قیدی اور غلام وباندی صرف ازدواج نبوی کے سبب آزادی، حریت کے علاوہ منزلت دینی سے ہمکنار ہوئے۔ اسی طرح دوسری ازواج مطہرات سے ازدواج نبوی کی معدلت گسترانہ وجوہ تھیں۔ ورنہ صرف نکاح وشادی کا مقصود مد نظر ہوتا تو ان کی شادیاں کہیں اور کرائی جاسکتی تھیں۔ شرف ام المومنین کی عطا وکرم آپ کے احسان آمیز عدل وتوقیر کی دلالت تھی۔ (۲)

۱۔ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۶۲-۱۶۱: قبول اسلام موصوف کی بحث میں تفصیل ہے اور اس کی مزید شرح سہیلی، ج ۱، ص ۴۲۶ ومابعد میں ہے۔

۲۔ ازواج مطہرات کے ساتھ رفاقت نبوی کی بحث سید سلیمان ندوی کی سیرۃ عائشہؓ کے حسن معاشرت کے باب میں عمدہ، تجزیاتی اور اہم ترین ہے۔ تمام مصادر سیرت میں ازواج مطہرات کے ابواب خاص کر ابن اسحاق، ابن ہشام، سہیلی، بلاذری /

آپ نے مکی زندگی میں جس طرح نوجوان ہوتے ہوئے ایک عمر رسیدہ خاتون سے شادی کی تھی اسی طرح دوسرے نوجوانانِ اسلام ومکہ اور بعد میں جوانانِ مدینہ کی شادیاں معمر خواتین سے کی تھیں یا ان کی ترغیب وتحریک کی تھی۔ ان میں ایک شادی اپنے نوجوان چہیتے صحابی اور مکی دور تک لے پالک (متبنیٰ) حضرت زید بن حارثہ کلبی رضی اللہ عنہ کی اپنی بوڑھی اور چہیتی انا حضرت برکہ حبشیہ رضی اللہ عنہا سے تھی اور ان سے حضرت اسامہ بن زید کلبی رضی اللہ عنہ فرزندِ اسلام ملت کو ملے تھے۔ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک جنتی خاتون کی بشارت پر حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ کے متبنیٰ نے نکاح کر لیا تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دولہا تو آپ کا لے پالک تھا اور دوسری طرف دولہن کو آپ اپنی ماں کا درجہ دیتے اور اہلبیت / خاندان کا بقیہ بتاتے تھے۔ قبل بعثت آپ نے اپنی ماں جیسی انا برکہ کی شادی یثرب کے ایک شیخ ومعزز فرد عبید سے کی تھی جن سے ایک فرزند ایمن پیدا ہوئے تھے اور اسی فرزند نے ان کو ام ایمن کی کنیت سے شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا۔

خاندانِ رسالت میں حضرت زبیر بن عبد المطلب ہاشمی رضی اللہ عنہ کی دختروں کی شادیاں آپ نے بطور امام المسلمین اور ولی خاندان زبیری کی تھیں اور ان میں سے بعض کی شادیاں جلیل القدر صحابہ کرام میں سے معمر اور آفاقی حضرات سے کی تھیں۔ شادی بیاہ میں یہ معدلت سماجی بہت اہم تھی۔

بالعموم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی مبارک کو ایک سماجی مسئلہ بتایا جاتا ہے لیکن عرب روایات میں اور اسلامی اقدار میں کم عمر بچیوں اور نوخیز لڑکیوں سے شادی کا رواج عام تھا اور وہ سماجی مصالح سے بھی ہوتا تھا اور سماجی انصاف کی وجہ سے کمسن لڑکیوں سے شادی کو انمل اور بے جوڑ بتانے والے عمر رسیدہ اور پختہ عمر خواتین سے نوجوانوں کے نکاحوں اور رشتوں کی خاص کر بیواؤں سے شادی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن بے جوڑ عمر کے لحاظ سے وہ بھی تھیں۔ عمر کے تفاوت کو سماجی عدل کے میزان نے بہر حال مٹا ڈالا۔[1]

ازواج مطہرات کے ساتھ کاشانہ نبوت میں بامسرت وشادمانی اور بہ توقیر واکرام ازدواجی زندگی گزارنے کا اسوہ کاملہ ایک ناممکن کو ممکن اور قابل عمل وتقلید بنانے کا واقعہ ثابتہ ہے اور اس سے زیادہ خانگی عدل اور ازدواجی

انساب الاشراف، ابن سعد جلد ہشتم میں بھی ہیں، خاکسار کے مطالعات سیرت میں "رسول اکرم ﷺ اور خواتین - ایک سماجی مطالعہ"، "عہد نبوی کے اختلافات" اور "عہد نبوی کا تمدن" سماجی خانگی عدل کے واقعات سے سرشار ہیں۔

1- خاص وتجزیاتی بحث کے لیے مذکورہ بالا کتاب خاکسار "رسول اکرم ﷺ اور خواتین" کے مختلف ابواب ومباحث۔

انصاف کا مثالی نمونہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب وآخری رسول اکرم ﷺ کو ازواج کے معاملہ میں کسی طرح پابند نہیں فرمایا تھا کہ جسے چاہیں قریب رکھیں اور جسے چاہے دور رکھیں۔ لیکن آپ نے سماجی انصاف کی مشکل ترین جہت میں عدالت وانصاف اور احسان ومحبت اور سلوک ورویے میں جو معیار قائم فرمایاوہ بشری طاقت کے پرے ہے۔ لیکن برداشتِ پیغمبرانہ کے ماتحت ہے۔ آپ نے تمام ازواج مطہرات سے یکساں عدل گسترانہ سلوک تازندگی فرمایاحتی کے خانگی چپقلش بھی اس پر اثرانداز نہ ہوسکی۔

۱-تمام ازواج مطہرات کامہر یکساں رکھا۔ ۲-سب کے نکاح پر ولیمہ کاایک جیسا انتظام فرمایا، حضر اور قیام میں روایات عرب واسلام کے مطابق اور سفر وحرج میں حالات کے موافق۔ ۳-سب کو یکساں نان ونفقہ عطاکیااور ان کے لیے یکساں قسم کے الگ الگ حجرے تعمیر کیے۔ ۴-سب کو برابر کے تحائف وعطایا فراہم کرتے۔ ۵-سب کی یکساں باری مقرر کی۔ ۶-روزانہ عصر کے بعد سب کے ساتھ مشترکہ مجلس ازواج میں برابر شریک ہوتے اور سب کو ایک سلک محبت میں پرودیا کرتے۔ ۷-روزانہ صبح کوسب کے حجروں سے گزرتے اور ان کو سلام کرتے اور خیریت پوچھتے۔ ۸-تکلیف ومرض اور پریشانی میں سب کابرابر ساتھ دیتے اور دکھ بانٹتے۔ ۹-صحابہ کرام بالخصوص پڑوسی انصاری ومہاجر اکابر سے آنے والے خوان ہائے نعمت میں سب ازواج کے گھروں میں برابر کھانااور دوسری اشیاء بھجواتے۔ ۱۰-حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باری پر خانہ صدیقہ میں خوان ہائے نعمت اور ہدایا کی جھڑی لگ جاتی تو ان میں مالکہ کے ہاتھوں سب کے حصے برابر کرکے بھجواتے۔ ۱۱-ازواج مطہرات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ومحبت اور اعانت وامداد کی جبلت پیدا کردی اور وہ ایک دوسرے کے گھروں میں کھانے اور ہدیے بھیجا کرتیں۔ ۱۲- ان میں سے ہر ایک کے مقام ومرتبت، عزت ومنزلت اور خاندانی عظمت وشخصی شرافت کا تحفظ فرماتے اور سوتیا چاہ کی پیدا کردہ ناروا باتوں پر سرزنش فرماتے اور قصور وزیادتی پر معذرت کے علاوہ بدلہ دلواتے اوراس میں حکمت ومحبت کاشیرہ گھول دیتے۔ خود بھی ان کی رفعت ومنزلت کامعدلت گسترانہ لحاظ کرتے۔ ازواج مطہرات کے ساتھ حسن معاشرت کا نبوی وتیرہ ایک الگ جہان عدل واحسان ہے اور اس کی نیرنگیوں کااحاطہ کرنا قصوروار فہم کاعجز ہی ہے۔ نبوی معدلت گستری کی شہادت خود آپ کی ایک حدیث شریف سے

ہوتی ہے کہ بارالٰہا! جو میرے بس میں تھا وہ میں کر گزرتا ہوں اور جو میری بساط کے باہر ہے اور دل کی لگی ہے اس پر تیرا قبضہ ہے اور اس میں تو میری مدد فرما۔ (۱)

کاشانہ نبوت میں ازواج مطہرات کے ساتھ دوسرے افراد واشخاص بھی سایہ رحمت وعدالت میں زندگی گزارتے تھے۔ ان کے ساتھ سلوک عدل کا ایک مختصر گوشوارہ چند سرناموں کے تحت پیش ہے:

ربائب نبوی:

سابقہ شوہروں سے مختلف ازواج مطہرات کی اولاد امجاد ربائب نبوی کے نام وشرف سے متصف تھی۔ ان کی دو قسمیں تھیں: ایک نابالغ اولاد، دوسرے بالغ افراد۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی حقیقی اولاد کی طرح ان کی کفالت وسکونت کا انتظام فرمایا۔ دونوں میں سگے اور سوتیلے کے فرق کو کسی طرح راہ نہ دی۔ نابالغ اور کمسن بچے بچیاں اور اپنی ماؤں کے ساتھ اپنے اپنے حجرات میں قیام پذیر رہے اور بالغ، پختہ عمر کی اولاد کی مانند ربائب کے بھی ایسے افراد کو الگ مکانوں میں رکھا اور ان کی کفالت کی، گذارے کے لیے یکساں نان ونفقہ دیا اور ان کی تعلیم وتربیت مساوی انداز سے کی اور ان کی شادیاں بھی اسی طرح عادلانہ فرمائیں۔ (۲)

موالی:

اس طبقہ نبوی میں غلام اور باندی بھی تھے اور غلامی کے بندھن سے آزاد مگر رشتہ ولاء نبوی میں بندھے موالی بھی تھے۔ آپ نے ان دونوں طرح کے موالی نبوی کی کفالت وپرورش اور پرداخت اور تعلیم وتربیت کے ازواج واولاد کی طرح انتظامات فرمائے۔ یکساں نان ونفقہ اور سکونت کے علاوہ ان کی شادیاں کیں اور ان کی اولاد کو مانند حفید (پوتا) سمجھا۔ حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کلبی رضی اللہ عنہ اور ان کی ماں اورماں جائے بالترتیب حضرت ام ایمن اور حضرت ایمن رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبوی سلوک عدل وانصاف سے بڑھ کر احسان ورحمت اور کرم گستری کا ہے۔ ہالہ بن ابی ہالہ تمیمی اور ان کے برادر حقیقی کی کفالت وتربیت معدلت محمدی کا ثبوت ہے اور اسی نے ان کو "وصاف نبوی" بنایا تھا۔ (۳)

۱۔ مذکورہ بالا حاشیہ اور اس کے مصادر وکتب دعائے نبوی کے لیے ملاحظہ ہوں۔

۲۔ ربائب پر بحث وحوالہ گزر چکے ہیں۔

۳۔ ابن سعد، ابن اسحاق / ابن ہشام اور بلاذری / اشراف وغیرہ میں موالی نبوی پر مباحث ملاحظہ ہوں اور تجزیہ وتحقیق کے لیے کتب خاکسار مذکورہ بالا۔

مالی معاملات میں عدل وانصاف سماجی:

یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے اور ایک ضخیم کتاب کا مواد رکھتا ہے۔ اس کا ایک مختصر تجزیہ مختلف عناوین کے تحت کیا جاتا ہے:

شخصی مالی معاملات میں عدل نبوی:

خاتم النبیین ﷺ صحابہ کرام میں سے کسی سے کوئی قرض لیتے تو رقم یا جنس واپس کرتے وقت مزید کچھ اضافہ بھی عطا فرماتے کہ احسان نما معدلت گستری تھی۔

ایک قرض خواہ کے سخت و بے ادب تقاضے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو شدید ملامت و لعن طعن کیا۔ آپ نے قرض ادا کرنے کے ساتھ اصحاب کی شدید مدافعت و تادیب کے عوض نہ صرف اس کا قرض ادا کیا بلکہ مزید عطا فرمایا اور ارشاد کیا کہ قرض خواہ کا حق تقاضا درست تھا مگر اس کی بے ادب سختی کے جواب میں عرض مسلم عدل واحسان کے خلاف تھی۔[1]

پوری حیات طیبہ میں متواتر سنت وطریقت نبوی رہی کہ صحابہ کرام یا غیر مسلم اکابر واشخاص کے مالی یا طعامی یا جنس وجانور پر مبنی ہدایا کے عوض ان سے زیادہ قیمتی ہدایا وتحائف عطا فرماتے کہ محسن اعظم ﷺ کی عدالت گستری احسان وتلطف کی خوگر تھی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ تحفہ دینے والوں کو نبوی ہدیہ وعطائے بیش قیمت پر تکدر وملال ہوا اور حرف شکایت زبانوں پر آگیا، مگر آپ نے ان کو ہدایا کے باہمی تبادلہ میں چھپی حکمت ومحبت سے آگاہ کیا اور روایت اسلامی اور طریقت عدالت گستری ڈالی کہ محبت بھرا لین دین محض اکابر ومشائخ کی تحائف کی قبولیت تک محصور نہ ہو جائے اور وہ دوسروں کو خاص کر فروتر لوگوں، خادموں اور مداحوں اور

1- بخاری / فتح الباری، کتاب الاستقراض، باب استقراض الابل، ج ۵، ص ۷۱، حدیث ۲۳۹۰: (أَنَّ رَجُلًا تَقَاضَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَغْلَظَ لَهُ فَهَمَّ بِهِ أَصْحَابُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوهُ فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا ثُمَّ قَالَ اشْتَرُوا لَهُ بَعِيرًا فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ فَطَلَبُوهُ فَلَمْ يَجِدُوا إِلَّا سِنًّا أَفْضَلَ مِنْ سِنِّهِ فَقَالَ اشْتَرُوهُ فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً) اس قیمت کا اونٹ دستیاب نہ تھا بلکہ بیش قیمت ملتا تھا وہ دلوایا۔ نیز احادیث: ۲۳۹۴-۲۳۹۲: موخر الذکر میں ہے کہ آپ پر ایک صحابی کا قرض تھا وہ تو آپ نے ادا کیا ہی اور مزید عطا کیا۔

پیروکاروں کو تحفہ وہدیہ دینا ہی بھول جائیں۔ اس ضمن میں بلند ہاتھ کی پست دست پر فضیلت کی حدیث کی حکمت زیادہ معنی خیز نظر آتی ہے۔[1]

خانگی معاملات میں منصفانہ طریق نبوی:

ازواج مطہرات کے مابین کبھی سوتیاچاہ سے عالم غیظ وغضب اور حالت رشک ومحبت میں زیادتی ہو جاتی تو زبانی معدلت گستری تو فرماتے تھے اور اس کے ساتھ نقصان مایہ کی تلافی بھی کرتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عالم سرخوشی میں ایک دوسری زوجہ محترمہ کے بھیجے ہوئے پیالہ طعام پر ہاتھ مار کر گرادیا۔ سید وآقا صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر اپنے دستر خوان کی زینت بنالیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ جوڑ کر رکھ لیا اور اس کے عوض ثابت وسالم اور بہتر پیالہ عوضانہ میں دلوایا اور کھانا بھی بھجوایا۔ اس نوع کے بعض اور واقعات دوسری ازواج مطہرات کے ضمن میں بھی آتے ہیں کہ فطرت نسائی کے وہ مظاہرے اور سید العادلین صلی اللہ علیہ وسلم کے وتیرے تھے۔ ان معاملات مہر ومحبت میں حکیمانہ تعلیم وتربیت کا اہم ترین نکتہ اس کے سماجی عدل گستری میں مستور ومحفوظ ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چہیتی زوجہ مطہرہ تھیں اور ان کو نبوی چاہت کی بیکرانی اور گہرائی وگیرائی کا بھی بخوبی تجربہ تھا۔ تاہم حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا وغیرہ بعد کی ازواج مطہرات اور ان سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل چہیتی زوجہ واحدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ان کے بعض زبانی طنزیات اور شکوہ آگیں فرمودات پر آپ نے ان کی نکیر کی اور ان کو اپنے حکیمانہ اور عادلانہ انداز تعلیم سے خطاو سہو اور سوتیاچاہ سے بھرے لہجے کی خطرناکی کا احساس دلایا اور معذرت ومعافی پر آمادہ کیا۔ حضرت عائشہؓ کا آخری احساس یہ رہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب حزیں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اتھاہ محبت تازندگی رہی اور اس پر وہ رشک کناں رہیں۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح ایک طنزیہ اظہار کا صدور ہوا تو آپ نے ان کا مقاطعہ کر دیا اور بالآخر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سفارش پر اس کا خاتمہ ہوا۔

ازواج مطہرات کی سوتیاچاہ کی درجہ بندی اور بقول امام بخاری دوگانہ فرقہ بندی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان کے حامی طبقہ ازواج کا اور ان کی مخالف ازواج طاہرات کے مابین موخر الذکر کا مطالبہ عدل وانصاف کا تھا۔ وہ

۱۔ مفصل بحث کے لیے کتاب خاکسار **عہد نبوی کا تمدن، باب ہدایا وتحائف**۔ حاشیہ وتعلیق: ۴۹ کی احادیث اور اس کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے مباحث بھی موجود ہیں اور مزید مدلل کرتے ہیں۔

سماجی انصاف کا بھی تقاضا تھا اور خانگی مساوات کا بھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اس قضیہ مرضیہ اور محبت وعدالت گستری کے معاملہ میں جس طرح عدل وقسط کا وتیرہ اختیار فرمایا وہ نہ صرف خانگی عدل کا معیار اعلیٰ پر بلکہ سماجی انصاف کا بھی معیار واحد ہے۔ شاکی گروہ کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ صحابہ کرام اور بالخصوص ہدایا بھیجنے والے حضرت عائشہؓ کی باری کے دن کا انتظار نہ کیا کریں اور سب ازواج مطہرات کی باریوں پر مساویانہ طور سے ہدایا بھیجتے رہا کریں۔ آپ نے ان کا یہ مطالبہ مسترد فرمادیا کہ کسی ہدیہ دینے والے کی آزادی اور پسند پر قدغن کیونکر لگائی جاسکتی ہے۔ یہ پورا واقعہ سماجی انصاف کا ایک آدرش مرقع ہے جس میں نبوی عدل وانصاف معاشرتی کی روح منعکس ہوتی ہے۔[1]

بطور امام عادل:

حضرت محمد ﷺ کی شخصیت ومنزلت نبوت ورسالت کے بعد شخصی اور نجی نہیں رہ سکی اور وہ کسی طور سے رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ منصب نبوت ورسالت پر سرفرازی کے بعد سید المرسلین وخاتم النبیین کی مرتبت وحیثیت آپ کی شخصی اور نجی جہات بشریت کو بھی محیط ہوگئی تھی۔ بلاشبہ عبد وبشر کی حیثیت میں آپ کی تمام کارفرمائیاں اور کارگزاریاں بشری سطح کی ہوسکتی تھیں اور کچھ ہوتی بھی تھیں، لیکن وہ رسول بشر اور وہ بھی خاتم الانبیاء، امام المحسنین اور دانائے سبل اور مولائے کل کی بھی چھاپ اور رنگ وآہنگ رکھتی تھیں۔ ان میں فقہی درجہ بندی اور تکلیف کی نوعیت پسندی کے باوجود رسول رب العالمین کی دینی جامع ومانع روح وحقیقت بھی کارفرما تھی اور امام عادل اور رسول آخریں کی مرتبت سے بھی وہ اسی طرح مستنیر ومستفیض تھیں۔ بطور امام ورسول اور حکمران رسول اللہ ﷺ نے عدل وانصاف کا ایک لازوال وبے نظیر اور آدرش اسوہ پیش کیا جو آخری کتاب اللہ کے احکام

۱- کتاب عہد نبوی کے اختلافات کے دو ابواب، ۶۷-۵۵: ازواج مطہرات کا اختلاف اور ان کے باہمی اختلافات میں عدل وانصاف نبوی۔ ان کے مآخذ ہیں: بخاری، کتاب الھبتہ کے مختلف ابواب، فتح الباری، ج ۵، ص ۲۵۳ ومابعد؛ مسلم، کتاب الفضائل، فضل عائشہ رضی اللہ عنہا؛ بخاری التفسیر، سورہ التحریم، کتاب الطلاق باب لم تحرم مااحل اللہ لک وغیرہ؛ فتح الباری، کتاب المظالم، باب ایلاء، ج۹، ص ۲۷۳ وغیرہ۔

سید سلیمان، سیرۃ عائشہ کے باب حسن معاشرت وغیرہ، سوکنوں کے ساتھ برتاؤ؛ شبلی، سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء، جلد دوم کا باب ازواج وحسن سلوک؛ کتاب خاکسار: عہد نبوی کا تمدن، باب ہدایا طعام۔

عدل وانصاف کا عملی مرقع اور ظاہری اور حسی پیکر ہے۔ مالی معاملات میں بطور امام بنفس نفیس عدل گستری کا بلند ترین معیار قائم فرمایا اور صحابہ کرام کو بھی اسی کی اتباع و نقل کا خوگر بنایا۔ عدل وقسط قرآنی اس طرح انصاف وعدل نبوی میں ڈھل گئی اور دونوں مل کر عدالت صحابہ کرام میں عمل خالص بن گئی۔ اس کے واقعات وامثال مختلف النوع ہیں، اس لیے ان کو متعدد عناوین کے تحت بطور نمونہ وعبرت اور سبق پیش کیا جاتا ہے:

فوجی معاملات میں عدل وانصاف: کے نمونے سلب، زر فدیہ، تقسیم غنائم، عطایائے مولفۃ القلوب وغیرہ کے ابواب وانواع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اول مسئلہ خمس اور ارباع کا تھا کہ پانچواں حصۂ غنیمت عرب روایات کی رعایت سے زیادہ احکام قرآنی کی بناپر سربراہ ریاست کا حصہ تھا اور باقی چار حصے شریک مجاہدین کے۔ عرب اسلامی روایات کے مطابق کل غنائم میں سے ایک چیز اختیار کرکے اپنے لیے خاص کرلینے کی بھی تھی، جسے صفی / صفایا کہا جاتا تھا اور وہ سربراہ امت کا خاص حق سمجھا جاتا تھا۔

سلب: مفرور یا مقتول دشمن کے ساز وسامان بالخصوص اسلحہ کی تقسیم میں عدل مساوات واخوتِ برادرانہ اور مصلحت امت اور لیاقت فرد جیسی متعدد وجوہ پر مبنی تھا۔ مختلف غزاوت وسرایا میں اس کی عطا وتقسیم کا معاملہ سیدھا سادہ اصولی نوعیت کا تھا کہ مسلم غازی کو اس کے مقتول ومفرور مقابلوں کا سلب مل جاتا کہ اس روایت عرب کو اسلامی وقرآنی تصدیق عطا ہوگئی تھی۔ عدالت وفیصلہ کا معاملہ اس پیچیدہ صورت حال میں پیش آتا جب ایک سلب کے دعویدار ایک سے زیادہ ہوتے اور ہر شخص اپنے حق کا طالب ہوتا یا سرے سے کوئی طالب سلب نہ ہوتا۔ مختلف مواقع پر آپ نے حق دار یا حقداروں کے درمیان عدل وانصاف سے فیصلہ فرمایا۔ اس کے مختلف الانواع معاملات ملتے ہیں:

دو یا زیادہ مدعیوں کے مطالبہ پر آپ ﷺ عینی شہادت یا عادل کی گواہی کی بنا پر حق دار کو اس کا حق دلادیتے جیسے غزوہ بدر میں ابوجہل مخزومی کے سلب پر آپ نے تمام دعووں کا منصفانہ فیصلہ فرمایا۔ غزوہ حنین میں حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک شریک مجاہد کے درمیان سلبِ مقتول پر اختلاف ہوا تو آپ نے ان کا حق دلایا۔ بعض دوسرے غزوات وسرایا میں سلب کے حق میں نبوی عدل گستری یا صحابہ کرام کے منصفانہ طرز عمل کا ذکر ملتا ہے۔

قتلِ فرعون امت ابوجہل مخزومی کے باب میں تین تین مدعیان سلب تھے اور آپ نے ان تینوں کو ان کے قتلِ ظالم میں حصہ داری کے سبب مساوی حصہ دلوایا۔

سریہ موتہ میں حضرت خالد بن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ فاتح وغازی امیر لشکر اوران کے ایک مجاہد حضرت عوفؓ بن مالک حمیری کے درمیان ایک کافر مقتول کے سلب پر اختلاف ہوا کہ مجاہد صحابی اپنے حق سلب کے طالب تھے اور امیر موصوف اس کی زیادہ قیمت کے سبب انکاری، حالانکہ مجاہد مذکور نے اصول نبوی بھی واضح کیا تھا۔ مدینہ منورہ واپسی پر معاملہ عدالت میں پیش کیا گیا اور آپ نے دونوں کی باتیں اور دلیلیں سننے کے بعد سلبِ مقتول مجاہد سپاہی کو دینے کا حکم دیا۔ مجاہد موصوف کو اپنے حق ودعوی کے تسلیم کیے جانے پر شدت جوش وحصول میں یہ حرکت سرزد ہوئی کہ امیر موصوف کی چادر کھینچ کر بے ادبی کی اور اپنے دعوے کی حقانیت پر سخت لہجہ اختیار کیا۔ امام عدالت وانصاف نے اس بے ادب اور شدت نکیر کو مقام ومرتبہ امیر کے خلاف گردانا اور بطور سزا مجاہد موصوف کو ان کے حق سلب سے محروم کر دیا۔

امیر سریہ یا امیر شہر سے کسی غلطی کے صدور یا غلط فیصلہ پر قصاص وانتقام لینے کے مطالبہ صحابہ کو آپ نے تسلیم نہیں کیا کہ اس سے انضباط وانتظام میں خلل پڑتا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ کے بعض اقدامات سے حضرات صحابہ اور بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اختلاف رہا مگر آپ نے اسے مصلحت امت کے سبب تسلیم نہیں کیا۔[1]

تقسیم غنائم: میں رسول اکرم ﷺ مساوی طور سے ہر ایک پیدل سپاہی اور سوار مجاہد کو بالترتیب اکہرا اور دہرا مال دیتے تھے اور بعد کے زمانے میں بعض بعض مجاہدین کو ان کے دو گھوڑوں کی بنا پر تین گنا مال دیا تھا۔ وہ دراصل سوار مجاہد اور اس کے مرکب جہاد کی سریع الحرکت اور موثر ترکارکردگی کا انعام تھا۔ اس باب میں آپ نے کسی اور قسم اور وجہ کو معیار نہیں بنایا اور ہر ادنیٰ واعلیٰ کو برابر برابر قیمت کا حصہ ومال عطا فرمایا اور خود بھی وہی لیا۔ بطور امام وقائد کے آپ ﷺ کو عرب روایات کے مطابق صفی (مال غنیمت کے کسی حصہ کو) چن لینے کا حق تھا اور اس کا استعمال بھی آپ نے کیا، لیکن وہ صفی / صفایا[2] کبھی اپنے پاس یا زیر استعمال نہ رکھیں بلکہ کسی نہ کسی صحابی کو ان کی فوجی

۱۔ عہد نبوی کے اختلافات کے ابواب: فوجی معاملات کے علاوہ اموال غنیمت اور اسلاب پر اختلافات نیز معاملات؛ ۱۴۸-۱۵۰؛ ۱۶۱-۱۵۹ بحوالہ بخاری /فتح الباری: کتب المغازی، باب غزوة بدر، کتاب فرض الخمس، باب لم یخمس الاسلاب، مسلم، کتاب الجهاد، باب استحقاق القاتل سلب القتیل وغیرہ۔

۲۔ کتاب المغازی بخاری وغیرہ میں صفی / صفایا سے متعلق ابواب نیز کتب ومصادر سیرت ابن اسحاق / ابن ہشام وغیرہ میں مختلف غزوات میں صفی نبوی کی روایات عہد نبوی میں اختلافات کا متعلقہ باب۔

کارکردگی کے سبب عطا کردیں۔ تاہم کبھی کسی مصلحت کے سبب جیسے ابوجہل مخزومی کے اونٹ کو اپنی صفی خاص میں محفوظ کیا اور بالآخر حدیبیہ کے موقع پر اس کو دینی وفوجی مصالح سے بطور ہدی قربان فرمادیا۔ فرعون امت کی تلوار یا کسی اور قریشی جنگجو کی سیف ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی کہ حضرت موصوف نے بیس سے زیادہ قریشی سرداروں کو ٹھکانے لگایا تھا، یا اسی طرح حضرت زبیر بن عوام اسدی رضی اللہ عنہ اور بعض ،دوسرے صحابہ وصحابیات کو بھی صفایائے خاص سے نوازا تھا کہ ان کی فوجی اور جہادی کارکردگی عدل واحسان کی طالب تھی۔

بعض غزوات ومواقع پر مجاہدینِ بدوی اور سخت مزاج قبائلیوں کو آپ کی تقسیم غنائم سے بے جا شکایت ہوئی اور کسی بے ادب نے آپ کی چادر مبارک کو اپنی طلب کے تقاضائے شدید پر ایسی سختی سے کھینچا کہ گردن مبارک پر چادر کی رگڑ سے خراشیں پڑ گئیں مگر آپ یہی فرماتے رہے کہ میرے پاس کچھ اور مال ہوتا تو وہ بھی تمہارے حوالے کردیتا۔

ایک موقع پر ایک سخت مزاج وسخت گیر بدوی نے مال غنیمت کی طلب میں نہ صرف بے ادبی کی بلکہ عدل وانصاف کرنے کی بات تک کہہ ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ میں اگر عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟ احادیث بخاری: ۳۱۳۸/ اور ۳۱۵۰/ اور موخر الذکر کے سات اطراف میں اس کا ذکر ہے۔[1]

تقسیمِ غنائم کے برخلاف تقسیم خمس یا اموال فے وغیرہ میں سے عطیہ وعطا کا معاملہ مادی اور حسی عدل سماجی سے زیادہ روحانی اور اسلامی عدل گستری کا تھا۔ اس کا مختصر تجزیہ بعد میں آتا ہے۔

مولفۃ القلوب کو عطایائے نبوی:

تقسیمِ اموالِ غنائم کی ایک روایتی شق اور خاص اسلامی حکمت یہ بھی تھی کہ اکابر قبائل اور سادات قریش کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید سے بہت بڑی مالی قدر وقیمت کے عطایا دیتے تھے۔ ان کا سلسلہ تو شروع سے تھا مگر فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بیش قیمت غنائم میں عظیم ترین واقعہ بن گیا۔ بڑے قبائل اور وسیع اثرات کے مالک شیوخ بطور خاص اور روسائے قبائل کو بالعموم سو سو اونٹ یا ان کے بقدر مالیت کے عطایا تالیف قلوب کے لیے عطا

۱- بخاری کی مذکورہ بالا احادیث اور ان کے مختلف اطراف متعدد کتب وابواب میں مختلف سندوں سے آئے ہیں جیسا امام موصوف کا طریقہ روایت ومکررات ہے۔

کیے۔[۱] اس عطیہ میں اکابر ومشائخ کے سماجی وقبائلی مرتبہ کے ساتھ ان کی خدمات اور مصالح امت کے مقاصد ومحرکات بھی کار فرمارہے تھے۔ یہ تمام عطائے نبوی خالص خمس غنائم سے عطا فرمایا کرتے تھے جو بحیثیت رسول وسربراہ امت وریاست آپ کا خاص الخاص اختیار تھا اور اس کے متعلق آیات قرآنی اور احادیث نبوی نے آپ کو یہ اختیار بھی دے دیا تھا کہ جس کو جتنا چاہیں عطا فرمادیں اور جس کو نہ چاہیں کچھ نہ دیں۔ متعدد شیوخ وسادات قبائل کو عطا سے محرومی برانگیختہ کر گئی تو وہ لعن طعن اور بے ادبی وشکایت پر اتر آئے۔ قرآن کریم نے ان کو غلط ٹھہرایا۔ بعض رؤسا کو سو سے کم اونٹ کے عطیہ پر اپنی سماجی وقبائلی منزلت پر حرف آتا اور ہمسروں میں سبک سر ہوتا محسوس ہوا تو انھوں عدل ومساوات کا مقدمہ عدالت نبوی میں بہ ادب پیش کیا اور آپ نے ان کا مطالبہ تسلیم کرلیا اور ان کا عطیہ وحصہ بڑھا کر انھیں سرخرو کردیا۔

تقسیم مال ومنال میں صورت عدلِ احسانی:

بہت سے ایسے افراد واکابر تھے جو راضی برضا تھے کہ ان کو مال ودولت کی طلب سے زیادہ رضائے مولیٰ مطلوب تھی اور وہ شاکر بھی تھے۔ متعدد احادیث نبوی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ سے ایک خاص مکالمہ سے عطائے مال اور ارزانی رضا کا فرق واضح ہوا تھا کہ آپ جن کو مال ودولت کی آلائش سے محفوظ رکھتے ہیں ان کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک صحابی شیخ حضرت عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ تھے جن کو یہ فرمان نبوی سننے کو ملا تو بے ساختہ فرمایا: "کلمہ نبوی میرے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہے۔" ان جیسے دوسرے صحابہ کرام اور شیوخ عظام کافی تعداد میں تھے۔[۲] حضرت حکیم بن حزام اسدی رضی اللہ عنہ کا معاملہ خاص بھی ہے اور تربیت و عدالت نبوی کا حکیمانہ اثبات بھی۔ وہ آپ کے دیرینہ دوست، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے، بہت متمول وبااثر سردار قریش اور صاحب مکارم اخلاق بزرگ تھے۔ ان کو عطیہ نبوی ملا تو اور کی طلب ہوئی، آپ نے پوری کردی۔ پھر مانگا، پھر دیا۔ اور تیسری بار ارشاد فرمایا کہ "حکیم! مال بڑا میٹھا اور جاذب نظر ودل میوہ ہے، لیکن اسی کے لیے جس نے اسے حق سے لیا اور حق کے لیے صرف کیا" فرمان نبوی ان کا دل چیر گیا اور عزم راسخ اور ایمان قوی تر کر گیا

۱- مسلم، کتاب الزکوۃ بروایت حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ؛ ابن اسحاق / ابن ہشام اور بخاری کے ابواب مولفۃ القلوب پر۔

۲- بخاری، کتاب فرض الخمس، باب ماکان النبی ﷺ یعطی المولفة قلوبهم الخ، حدیث ۳۱۴۵؛ فتح الباری، ج ۶، ص ۳۰۰ ومابعد۔

اور انھوں نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے بعد کسی سے کچھ نہ لیں گے اور تازندگی اسے نبھایا۔ ان کے صبر وعزم اور وعدہ وایمان پر آپ نے ان کو خوشحالی اور دولتمندی کی دعا دی اور اس کے نتیجہ میں ان کو اپنی تجارت سے اتنا مال ملا کہ کوئی ان کا حریف نہ تھا۔[1] رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمیؓ کے مال کے بارے میں دو واقعات سے تقسیم مال میں عدل وانصافِ نبوی اور سماجی قسط ومساوات کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔

شیوخ وسرداران انصار: کا معاملہ ایمان ومحبت، خدشہ ووسوسہ اور اندیشہ ہائے دور دراز کے علاوہ خلشِ دل اور اضطرابِ شوق کا تھا۔ خاص عطائے مولفۃ القلوب کے موقعہ پر بھی آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو مال کے عطیہ سے آلودہ نہ کیا کہ عدالت گستری کا ایک درس دینا تھا۔ بعض مشائخ مدینہ کو اندیشہ نے ستایا کہ مکہ فتح ہو گیا اور آپ اپنی قوم میں پہونچ گئے۔ اب ان ہی میں رہ جائیں گے۔ ان کی سرگوشیاں آپ تک بھی پہونچیں۔ نوجوان طبقات اور ان کے زعماء کو مال ودولت سے محرومی پر اتنا صدمہ نہ تھا جتنا عطایائے نبوی سے محرومی پر۔ وہ عطائے مال کو عطیہ محبت سمجھتے تھے۔ بعض بعض کی زبانوں پر مال سے محرومی کی شکایت بھی آگئی۔ سید المرسلین اور خاتم النبیین ﷺ کو ان سب کی خبریں ملتی رہیں اور بالآخر آپ نے ان کو جمع کیا۔ آپ کا یہ خطبہ عالیہ عدالت، محبت، سماجی انصاف، مالی عطیہ، رضائے آقا ومولیٰ اور دولت کونین سے سرفرازی کا نسخہ حکمت وعزم ہے۔ انصار کرام کی خدمات عالیہ اور بے مثال وعظیم قربانیوں کا ایک ایک کا ذکر کر کے ان کے احسانات سے اپنی اور امت اسلامی کی گرانباری کا ذکر فرمایا۔ ان کے دل جب نرم اور قبول حق ومحبت کے لیے تیار ہو گئے تو آخری عطیہ کا اعلان فرمایا: "کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ لوگ بھیڑ بکری لے جائیں اور تم رسول اللہ کو اپنے گھر لے جاؤ؟" پورا مجمع جاں نثاران پھوٹ پڑا، آنکھیں برسنے لگیں، آنسوؤں سے چہرے اور داڑھیاں تر ہو گئیں اور زبانوں سے تر اوش ہونے لگی۔ "بخدا ہم راضی ہیں ہم شاکر ہیں، ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں دولتِ کونین مل گئی۔"[2]

۱- بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسالۃ؛ مسلم کتاب الزکوۃ میں یہ حدیث مختصر ہے اور خلفاء راشدین کے زمانے میں ان کے استغنا کا ذکر نہیں۔ حدیث: (ان المال حلوۃ خضرۃ) میں ہے وہ مشہور حدیث: (الید العلیا خیر من الید السفلیٰ)۔ نیز حضرت حکیم بن حزام اسدی پر کتاب وخاص مطالعہ خاکسار "رسول اکرم ﷺ کے صحابی حکیم بن حزام" (زیر طبع)

۲- بخاری / فتح الباری، کتاب فرض الخمس، باب ماکان النبی ﷺ یعطی المولفۃ قلوبھم، ج۶، ص ۳۰۲-۳۰۰ ومابعد، حدیث ۴۱۴۷۔

عدل وانصاف کا ایک قانون اور مادی پہلو ہے اور وہ بظاہر برابر برابر یا درجہ و مرتبہ کے مطابق مال و دولت اور دنیاوی اشیا کی تقسیم کا مطالبہ کرتا ہے مگر نبوی عدالت گستری اور اسلامی سماجی انصاف اس سے بڑھ کر احسان آگیں عدالت و معدلت گستری کا تقاضا کرتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ظاہری اور مادی عدل وانصاف کے ساتھ روحانی اور ملکوتی عدل سماجی کا ایک جان وروح پرور اور جسم وبدن ساز اور معاشرتی توازن وتناسبِ منصفانہ کا معیار عدل قائم فرمایا تھا جو مال و دولت کی تقسیم مساویانہ و منصفانہ سے زیادہ سماجی تعمیر و تطہیر اور نفسی تہذیب و ترقی کا ضامن ہے۔

اراضی کی تقسیمِ منصفانہ:

رسول اکرم ﷺ کے نصابِ عدل وانصاف میں ضرورتِ افراد وطبقات، مصالحِ امت اور بلند مرتبتِ خیر امت کی رعایت بنیادی نکتہ ہے۔ اور مساوی تقسیم اراضی اور منصفانہ عطیہ اموال / جائداد بھی اپنے مقام و محل اور مصلحت واصول کی بنا پر اس کا ایک باب ہے۔ تقسیم مال و منال میں خدمات و شراکت اور شرافت و مصاحبت کا خیال بھی اس کی شہ سرخی اور دل پذیر عبارت ہے۔ ان کی چند مثالیں ہی اس مختصر پیش کش میں سما سکتی ہیں:

اراضی مدینہ کے اقطاعات وعطایا:

انصار کرام کی بے مثال اور قابل تقلید اور تہذیب و معاشرت آفریں قربانیوں کا ایک مادی مظاہرہ یہ تھا کہ اپنی تمام اراضی واموال اور افتادہ وآباد جائیدادیں اور سارا نقد و جنس پر مشتمل مال و دولت رسول اکرم ﷺ کے قدموں میں رکھ دیا اور مہاجرانِ نادار کو مال و منال میں شریک کرلیا۔ رسول اکرم ﷺ نے افراد و طبقات مہاجرین کی ضرورت وحیثیت اور بساط کے مطابق ان کو مکانات، اراضی اور باغات وغیرہ عطا کیے۔ مدینہ منورہ کے ایک مخیر یہودی نو مسلم صاحب اموال حضرت مخیریق رضی اللہ عنہ نے اپنے باغات واموال آپ کو ہدیہ کر دیے تو آپ نے ان کو بیشتر نادار مہاجرین میں اور بعض مفلس ومحتاج انصار میں تقسیم کر دیا۔ انصار کرام خیر ومحبت وایثار میں تمام اموال کو اپنے نادار اور ضرورت مند مہاجر برادران اسلام میں تقسیم کرنے کے لیے مصر تھے لیکن آپ نے اسے

قبول نہ فرمایا۔ اور مہاجرین صحابہ میں سے بھی اکثر غیرت مندوں نے حاجت کا مظاہرہ نہ کیا۔ عطا کرنے والے اور لینے والے کے کردار و نفس کی تہذیب بھی تو عدل گستری ہے۔ (۱)

خیبر وفدک ووادی القریٰ کے اموال واراضی: اوران کے پیداواریں منصفانہ اور اصولی طور سے فاتحین اسلامی کے درمیان تقسیم کی گئیں اور خمسِ ریاست رسول اکرم ﷺ نے قرآنی قانون کے مطابق طعم / پیداواری حصوں میں سے عطایا اپنی ازواج مطہرات، اعزہ واقربا اور نادار مسلمانوں وغیرہ پر نچھاور کی۔ اس تقسیم وعطا میں جس عدل وقسط معاشرتی کا آپ نے مظاہرہ فرمایا تھا وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ مفتوحہ اراضی کے سابقہ مالکوں کو بھی بھا گیا۔ (۲)

بنو عبد مناف میں بنو ہاشم وبنو مطلب کا عطیہ:

خمسِ ریاست سے جب دیا گیا تو بنو عبد مناف کے دو باقی خاندانوں بنو امیہ اور بنو نوفل نے اپنے دو عظیم سربراہوں حضرت عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ اور حضرت جبیر بن مطعم بن عدی نوفلی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اپنا حصہ بھی مانگا کہ وہ بھی آپ کے اسی طرح عزیز و قریب ہیں، لیکن آپ نے ان دونوں خاندانوں سے عزیزانہ تعلقات اور ان کے نمائندوں اور سرداروں کی اسلامی خدمات ودینی منزلت کے باوجود ان کو اس عطیہ سے باہر رکھا کہ مکہ کے دورِ ستم وکرب وبلا میں ان دونوں خاندانوں نے آپ کی حمایت ونصرت اس طور نہ تھی کہ جس طرح بنو ہاشم وبنو مطلب کے افراد وطبقات نے متحدہ طور سے کی تھی۔ یہ خالص قرآنی حکم وفیصلہ کے مطابق عدل نبوی تھا جس میں خدمات عالیہ اور فتح سے قبل اور فتح کے بعد کی عطا وفضیلت میں درجہ بندی رکھی گئی تھی جیسے انبیائے کرام کی باہمی افضلیت کا معاملہ ہے۔ (۳)

۱- **بخاری**، کتاب المساقاة : حدیث:۲۳۶۲-۲۳۵۹، **فتح الباری**، ج ۵، ص ۴۲-۴۰؛ کتاب التفسیر، سورۃ النساء، کتاب الصلح / **فتح الباری**، ج۵، ص ۳۸۰، **مسلم**، کتاب الفضائل، باب وجوب اتباعه ﷺ۔ اصل واقعہ حدیث بخاری رقم ۲۷۰۸ میں ہے۔ نیز کتاب خاکسار "عہد نبوی میں اختلافات"، ۱۶۹-۱۶۸ مع حواشی ۲۶۴-وغیرہ۔

۲- ابن اسحاق / ابن ہشام میں غزوہ خیبر وغیرہ کی فتح اور صلح کی بحث میں سب سے زیادہ تفصیل ہے۔

۳- ابن اسحاق / ابن ہشام کی روایات واحادیث تھوڑی سی تبدیلی سے بخاری میں ہیں: کتاب فرض الخمس، باب ومن الدلیل علیٰ ان الخمس للامام الخ، حدیث:۳۱۴۰؛ فتح الباری، ج ۶، ص ۲۹۵-۲۹۳۔ امام بخاری کے دو اطراف

اموال واراضی کی واپسی:

مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو النضیر کی شہر نبوی سے جلاوطنی کے بعد جب ان کے اموال وباغات رسول اکرم ﷺ کے فے (خاص حصہ مال) میں آئے تو آپ نے انصار کرام کے عطا کردہ باغات واموال مہاجرین سے لے کر ان کو واپس کرنے شروع کر دیے کہ ناداروں اور بے مالوں کو اموال فے مل گئے تھے۔ سب نے اپنے عطایائے نبوی سے سے خوش ہو کر انصار کے اموال واپس کر دیے۔ رسول اکرم ﷺ کی انا (حاضنہ) حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے اپنا مال وباغ واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، جو خادم نبوی حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کی ماں نے ان کو ہبہ کیا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی ماں ام ایمن رضی اللہ عنہا کو بہتر مال اور زیادہ قیمتی عطیہ اراضی دینے کا وعدہ کیا مگر وہ اپنے مال موہوبہ سے محبت اور رسول اکرم ﷺ کے رشتہ مودت کے زعم میں کسی طرح راضی نہ ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو بھی خوب کھری کھری سناتی رہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کی تالیف قلب اور اکرام واعزاز میں اضافہ کیا اور اتنا بڑا اور قیمتی مال دیا اور اپنی ایسی محبت وعقیدت اور لحاظ وخاطر نچھاور کی کہ وہ انصاری ام الخیر کی اراضی / باغ واپس کرنے کر راضی ہو گئیں اور معدلت گستری اور احسان شناسی کی لاج رکھ لی۔[1]

زر فدیہ:

غزوہ بدر میں زر فدیہ کی متعدد شرحیں سماجی عدل وانصاف کی بنا پر مقرر فرمائیں کہ سب اسیر انِ جنگ یکساں مالی حیثیت کے نہ تھے۔ مالدار اسیروں کے لیے چار ہزار درہم کی بلند ترین شرح جو عرب قومی روایات اور قریشی ناز وافتخار کے معیارات کے عین موافق تھی۔ متوسط مالی حیثیت کے قیدیوں کے لیے دو ہزار درہم اور ان سے فروتر افراد کے لیے ایک ہزار اور معذوروں کو بلا فدیہ بطور احسان آزادی دی۔ ان اسیر ان قومی میں متعدد کاتب اور کتابت و قراءت

حدیث اور ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح میں امام ابن اسحاق کی تشریح کو بہت اہمیت دی ہے؛ نیز عہد نبوی میں اختلافات، ۳۴- ۳۵ مع حواشی وتعلیقات۔

۱- بخاری، **کتاب المغازی**، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، حدیث ۴۱۲۰، **فتح الباری**، ج ۷، ص ۵۱۲-۵۱۵؛ مسلم، **کتاب الجهاد**، باب رد المهاجرین الی الانصار منائحهم، مقالہ خاکسار: حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا، رسول اکرم ﷺ کی انا، معارف اعظم گڑھ، فروری-مارچ ۲۰۰۳ء اسی نام سے یہ کتابچہ بھی چھپ گیا ہے۔

وتدریس کے عالم تھے۔ ان کا زر فدیہ مالِ فانی کی بجائے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا متعین فرمایا۔ یہ عدالت نبوی اور حکمت محمدی ہی کر سکتی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کی نگاہ نبوت وفکر فطرت میں صرف مادی مال ہی سب کچھ نہ تھا۔ مال کے بطور زر فدیہ بنانے کا واقعہ عم مکرم حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی رضی اللہ عنہ اوران کے بھتیجے حضرت عقیل بن ابی طالب ہاشمی رضی اللہ عنہ کے باب میں چشم کشا ہے بعض اکابر انصار وسرداران بنو النجار / خزرج کے عرب قومی روایت "ابن اخت" (فرزند ہمشیرہ) کے جذباتی دلائل کے خلاف آپ نے نہ صرف حضرت عباس ہاشمی رضی اللہ عنہ کو گراں ترین شرح پر فدیہ ادا کرنے کا پابند کیا بلکہ ان ہی سے ان کے مفلوک الحال بھتیجے کا بھی زر فدیہ اسی شرح سے وصول کیا۔[1]

داماد رسول حضرت ابو العاص بن ربیع عبشمی رضی اللہ عنہ کے زر فدیہ میں جب ان کو زوجہ مطہرہ اور بنت رسول حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے وہ طلائی ہار بھیجا جو ان کو ان کی ماں اور رسول اکرم ﷺ کی عزیز ترین رفیقۂ حیات نے ان کی شادی پر ہدیہ کیا تھا تو آپ نے صحابہ کرام کی اجازت ومرضی سے ہار تو واپس کر دیا مگر قیدی داماد سے بنت رسول کو مدینہ بھیج دینے کی شرط منوالی اور صالح ترین داماد نبوی نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ یہ بھی حکمت وعدالت نبوی کا مظاہرہ تھا اور احسان ومحبت اور ایفائے عہد اور تالیف قلوب کا نسخہ کیمیائے عدل وانصاف تھا۔ زر فدیہ مال ومادہ کی بجائے ایک مسلمہ مومنہ کی گھر واپسی کی شرط رکھی جو پوری کی گئی۔ اسے تبادلہ مال از تحفظ جان بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ غزوہ بدر کے موقع پر ایک قریشی کافر قیدی کو ایک مسلمان عمرہ کرنے والے اسیر کا تبادلہ بھی اسی طرح کیا گیا تھا۔ عدل گستری میں صرف دونوں پلڑے برابر کرنے یا رکھنے کا کام نہیں ان کے میزان کے مستقیم ہونے کا معاملہ بھی لازمی ہے اور ہر چیز کو تولنے کا لازمہ بھی ملتا ہے۔[2]

۱۔ بخاری، کتاب العتق ، باب اذا اسیر أخو الرجل أوعمه هل یغاریٰ؟ **فتح الباری**، ج۵، ص۲۰۷-۲۱۰، بخاری کے علاوہ ابن اسحاق / ابن ہشام وغیرہ میں فدیہ کی مختلف شرحوں کا ذکر ہے اور مسند احمد بن حنبل میں تعلیم بچگان کا بیان ہے۔ ملاحظہ ہو: شبلی، سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۳۳۲ غزوہ بدر کے مباحث تجزیاتی؛ شبلی نے طبقات ابن سعد سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طریقہ سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا؛ ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۸۹-۱۹۰ وما بعد۔

۲۔ ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۹۴-۱۹۳۔

زرِ دیت و قصاص:

دیت (مالی خوں بہا/معاوضہ) اور قصاص برابر کا بدلہ قتل و زخم کے باب میں اسلامی قرآنی احکام ہیں اور تمام شرائع اسلامی میں جاری ساری رہے ہیں۔ عرب قومی روایات اور قریشی قوانین وضوابط تحفظ میں ان دونوں کا اجرا و عمل ان کی زندگیوں کا بھی ضامن تھا اور ان کے مال واسباب وخاندان کی حفاظت کا بھی۔ دراصل وہ معاشرت و معیشت کی صحت وبقا کا ایک لازمی اصول تھا اور عدالت اسلامی کے علاوہ سماجی عدل وانصاف میں بھی وہ تمام معاشروں کے لیے لازمی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس اصول وضابطہ تحفظ کو مکی دور میں بعثت سے قبل دین حنیفی کے باقیات صالحات میں پایا تھا اور ان کی تصدیق و تائید قرآنی آیات میں ملی تھی۔ مکی دور نبوی میں قریشی ملأ اور دوسرے قبائلی نظاموں کی قوت نافذہ اور سیاسی و سماجی قوانین نے اس کا نفاذ کیا اور مدنی عہد نبوی میں آپ کو قوت نافذہ ملی تو براہ راست نفاذ کا حق آپ کو مل گیا۔ آپ نے حکیمانہ انداز سے مختلف قبائلی روایاتِ دیت و قصاص کو تسلیم کیا کہ ان کی گوناگونی میں قبائلی حیات و صحت کی ضمانت تھی۔ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصہ بعد ہی آپ نے دستور مدینہ کی اولین دفعات میں ان گوناگوں روایات قبائل کو تسلیم کر کے نام بہ نام ان کی تصریح ثبت فرمادی تھی تاکہ تحریر وروایت کے اتفاق سے عرب قبیلوں اور مسلم وغیر مسلم دونوں فریقوں پر دستور ومعاہدہ سے روایت و قانون کی بالادستی سب پر واضح ہو جائے اسی معاہدہ و دستور کی طاقت و تاثیر نے مدینہ منورہ کے تین جارح یہودی قبیلوں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ کو دیت و قصاص کے متفقہ و مسلمہ اصول و قاعدہ کی بنا پر دیت ادا کرنی پڑی تھی یا قصاص کے عمل سے گزرنا پڑا تھا۔[1] ان کا ذکر ذرا بعد میں اپنے مقام پر آتا ہے۔ امت اسلامی کے افراد و طبقات کے معاملاتِ دیت و قصاص کا ایک مختصر جائزہ سماجی عدل وانصاف کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے:

دانت کے بدلے دانت کا معاملہ:

ایک عظیم ترین صحابیہ حضرت ربیع بنت نضر خزرجی رضی اللہ عنہا سے ایک لڑائی جھگڑے میں ایک اور لڑکی کے دانت توڑ ڈالنے کا حادثہ پیش آیا۔ صحابیہ موصوفہ کے والیوں نے زخمی لڑکی کے اعزہ سے معافی کی درخواست کی مگر وہ

1- عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت کے باب اول میں دستور مدینہ پر تجزیاتی بحث بحوالہ مآخذ متعددہ بالخصوص ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۱، ص ۹۶-۹۵ جس میں متن دستور مدینہ ہے۔ ان پر متعدد محققین جیسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ، آربی سرجنٹ، مونٹگمری واٹ، وینسنک وغیرہ نے بحث کی ہے اور تجزیہ بھی؛ روایتی مسلم سیرت نگاروں نے صرف اس کا سرسری ذکر کیا ہے۔

قصاص لینے پر تل گئے اور عدالت نبوی تک معاملہ لے گئے۔ آپ نے حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کا دانت توڑنے کا حکم آیت قرآنی کے مطابق دے دیا، مگر ان کے مستجاب الدعوات چچا حضرت انس بن نضر نے آپ کی سچی بعثت کی نسبت سے اللہ تعالیٰ پر قسم کھالی کہ ان کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ پھر دیت کے اصول کے مطابق صحابہ نے صلح کرلی اور دیت مالی ادا کرکے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی قسم نے اپنی بھتیجی کا دانت بچالیا۔ روایت میں خاصا اضطراب ہے کہ دیت کا حوالہ وذکر اس میں نہیں آتا اور یہ واضح کیا جاتا ہے کہ جیسے دیتِ زخم کا اصول اس واقعہ یا قسم مستجاب کے بعد اترا ہو حالانکہ وہ آیات مذکورہ میں موجود ہے۔[1]

قتل کے بدلے قتل / قصاص:

ایک برادر کے قتلِ مظلومانہ کی دیت دلا دینے کے بعد اور فیصلہ نبوی ہو جانے کے بعد ان مقتول کے حقیقی مسلم برادر نے قاتل کو جوش غضب میں قتل کرڈالا۔ وحی ربانی اور خبر رسانی کے ذریعہ سے آپ کو ظالمانہ عمل وانتقام کی خبر مل گئی تو آپ نے مسلم منتقم مزاج قاتل کو سزائے موت دی کہ عدل سماجی اسی کا متقاضی تھا۔

اس سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی نے غصہ میں آکر گالی دینے والے کو اپنی کلہاڑی سے کاٹ ڈالا۔ خدمت نبوی میں اعتراف جرم بھی کرلیا لیکن دیت دینے یا اپنی قوم کی طرف سے ادا کرنے سے غربت کی بنا پر معذوری ظاہر کی۔ آپ نے مقتول کے وارث بھائی کو قتل کرنے کی اجازت دے دی اور دونوں کے جانے کے بعد فرمایا: "اگر وارث قتل کردے تو وہ بھی مجرم بن جائے گا کہ ایک برادر خاطی کو معاف نہ کرسکا۔ اگر قاتل کو معاف کردے گا تو دونوں کا گناہ قاتل کے حساب میں ہوگا"۔ ایک سامع صحابی نے آپ کا ارشاد ان دونوں تک پہونچا دیا اور وارث اپنے مجرم کے ساتھ پھر حاضر خدمت ہوا اور آپ کے فرمان کی تصدیق چاہی، مل جانے پر اس نے قاتل کو معاف کردیا۔ قصاص کا قانونی پہلو تو یہی تھا کہ قاتل کو وہ قتل کرتا مگر قصاص احسانی نے معافی وعفو در گزر کی راہ کھولی اور سماجی انصاف کا ایک منارہ نور روشن کیا۔ قصاص ودیت کے ایسے اور بھی متعدد واقعات اور فرامینِ سرکار

۱- بخاری، کتاب الصلح ،باب الصلح فی الدیة، کتاب الجهاد، باب قول الله عزوجل: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا...... الخ﴾؛فتح الباری، ۳۷۶/۵ومابعد وغیرہ۔

ہیں اور وہ عہد نبوی میں سماجی عدل وانصاف کے وسیع ترین جہات کے دروازے وا کرتے ہیں اوران سے سماجی طبقات وافراد میں زیادہ ہم آہنگی پیدا ہوتی اور معاشرہ مجموعی طور سے خیر کل بن جاتا ہے۔ (۱)

چور عورت کی سزا:

سماجی انصاف اور عدل انسانی کی فطرت کے خلاف اونچ نیچ، شریف ورذیل اور خاندانی وغیر خاندانی جیسے انحرافات کی وجہ سے عدل گستری میں چور دروازے ہمیشہ نکالے جاتے رہے ہیں۔ قریش کے ایک عالی خاندان کے ایک عظیم الشان خانوادے کی ایک معزز ومالدار خاتون نے چوری کا جرم کیا تو اس کے خاندان والوں اور بلند خاندانی عظمت کے نگہبانوں نے اس کو سزا سے بچانے کی ہر کوشش کی حتی کہ رسول اکرم ﷺ کے ایک چہیتے فرد کو سفارشی بنا کر بیچ میں ڈالا مگر آپ نے سماجی عدل کا بیش قیمت معیار قائم ہی نہیں کیا بلکہ اصول بھی بیان کیا کہ اگر "فاطمہ بنت محمد نے یہی جرم کیا ہوتا تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔ اور سفارشی کو سخت سرزنش کی اور ان کو توبہ پر مجبور کیا۔ (۲) ایک دوسرے واقعہ میں اصول بیان کیا کہ سرکار دولت مدار میں جرم۔ سرقہ وغیرہ۔ کی رپورٹ کرنے سے قبل معافی دینا چاہیے۔ اثبات جرم کے بعد نفاذ قانون ناگزیر ہو جاتا ہے مگر اس میں دفع مضرت کا پہلو ہمیشہ راجح رکھا گیا کہ کسی طرح خطاکار کو سزا سے بچایا جائے۔ حالات وظروف کا جبر بدرجہ مجبوری حدود کا نفاذ کراتا تھا۔

زنا کی حد:

حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ اور حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا پر حدود زنا کے اطلاق کے واقعات معلوم ومشہور ہیں اوران سے موجودہ دور کے قانونی ماہرین وعلماء استدلال کرتے ہیں۔ بلاشبہ حدود زنا وسرقہ وغیرہ کا بسا اوقات نفاذ معاشرہ کی صحت اور سماجی انصاف کے لیے لازمی ہے اور رسول اکرم ﷺ نے ان کا نفاذ بھی کیا تھا، لیکن احتیاط وحزم سے ان دونوں کے باب میں آپ نے اپنی طرف سے بچانے کی پوری سعی کی ہے۔ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کے چار بار کے اعتراف جرم پر اعلان نہ کیا اور نہ سزا دی۔ ان کے اصرار پر نفاذِ حد کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ اور بھی دفع حد کا اثبات کرتا ہے کہ حمل کے دوران سنگسار کرنے سے انکار کر دیا اور وضع حمل کے بعد ان کو

۱۔ مسلم، **کتاب القسامة**، باب صحة الاقرار بالقتل اور دوسرے ابواب قصاص ودیت صحیحین وغیرہ ہیں۔

۲۔ بخاری، کتاب الفضائل، باب مناقب اسامة؛ کتاب المغازی، باب فتح مکة، کتاب الحدود؛ مسلم کتاب الحدود۔

دو سال تک مزید مہلت دی تا آنکہ نومولود دودھ چھوڑ کر کھانا کھانے لگے۔ اور ان کے پاک کرنے کے عزم کے سامنے دفعِ حد کی مہربانی رحمت للعالمین ﷺ کچھ نہ کر سکی مگر آپ نے ان دونوں کی توبہ کو ہزاروں کے لیے معافی کے لائق گردانا حدود تعزیرات میں اصل سماجی انصاف فوری اور بلا غور وخوض ان کے اجراء میں نہیں بلکہ تدریج، مہلت دفع اور بالآخر معافی میں ہے کہ وہ تب احسانی ومثال بنتا ہے۔[1]

پانی کی تقسیم کا مسئلہ:

ہجرت مدینہ کے بعد کا ہی واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کھیتی باڑی کے لیے جو اراضی وقطاعات مہاجرین مکہ وغیرہ میں تقسیم کیے ان میں سے ایک قطعہ زراعت حضرت زبیر بن عوام اسدی رضی اللہ عنہ کو ملا اور وہ ایک انصاری صحابی کے کھیت سے پہلے آبپاشی کے ذریعہ کے قریب تر پڑتا تھا۔ آپ نے انصاری کاشتکار کی درخواست پر دونوں پڑوسی کھیتوں کی آب پاشی کا عادلانہ فیصلہ یہ فرمایا کہ حضرت زبیر اسدیؓ اپنے کھیت کو تھوڑا پانی دینے کے بعد انصاری صاحب کے کھیت کی کاشت کے لیے پانی چھوڑ دیا کریں۔ مدنی کاشتکار کو اس میں قومی جانبداری کا شائبہ نظر آیا اور انھوں نے اس کا برملا اظہار یوں کیا کہ آپ نے یہ فیصلہ اپنے عزیز وقریب کے مفاد کے تحت کیا ہے۔ آپ نے اس اظہار بے جا پر سخت رد عمل کا مظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے یہ فیصلہ خالص انصاف اور باہمی موانست اور احسان کی بنیادوں پر کیا تھا۔ اب خالص عدل وانصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ زبیر اپنے کھیت میں مینڈوں تک پورا کھیت سیر اب کرنے کے بعد ہی پڑوسی کے کھیت کے لیے پانی چھوڑا کریں۔ انصاری کاشتکار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور صحابہ کرام کی ملامت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ سابق فیصلہ نبوی کو بحال کرنے کی درخواست کریں۔ صرف عدل وانصاف ظاہری کافی نہیں بلکہ احسانی معدلت گستری ہی مشکل کشا ہے جس میں طرفین کے مفادات عامہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔[2]

۱- بخاری، کتاب المحاربین من اهل الکفر، باب لایرجم المجنون، باب الرجم فی المصلی، مسلم، کتاب الحدود وغیرہ۔

۲- بخاری، کتاب المساقاۃ کے علاوہ فتح الباری، کتاب الصلح، ج ۵، ص ۳۸۰ ومابعد اور ج ۸، ص ۳۰۰ ومابعد بالترتیب میں ہے۔

اراضی واموال کی ملکیت:

زر، زمین اور زن کو حکماء وعقلاء نے بالعموم اسباب اختلاف اور باعث / بواعث نزاع وفساد میں شمار کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ عہد نبوی میں ان اسباب فساد کے باعث نزاع و مقدمہ اور عدالتِ نبوی اور عدالت صحابہ کا ذکر بہت سے واقعات میں ملتا ہے، اراضی کے تنازعات کی چند مثالیں ہیں:

ایک بئر والی اراضی (کنوئیں سے ملحق مال) کے باب میں دو صحابہ کرام حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ اور ان کے عم زاد میں ملکیت کا تنازعہ ہوا اور مقدمہ عدالت نبوی میں پہونچا۔ اصول شہادت وحلف کے مطابق آپ نے صحابی موصوف سے دو گواہوں کی شہادت طلب کی اور نہ پیش کرنے پر فریق مخالف کے قسم کھانے کا حکم دیا۔ حضرت اشعث رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فریق مخالف تو جھوٹی قسم کھالے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تب غیظ وغضب الٰہی کا مستحق ہو گا۔ بہر حال یہ قضیہ صلح فریقین سے طے ہوا۔

اسی طرح کا ایک تنازعہ ملکیت اور دو اصحاب حضرات امرؤالقیس کندی اور ربیع بن عبدان حضرمی رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوا کہ موخر الذکر غصب اراضی کا الزام لگا رہے تھے۔ آپ نے مدعی سے گواہی اور مدعا علیہ سے قسم لینے کا اصول بیان کیا اور مدعی نے فریق مخالف کے جھوٹی قسم کھالینے کی بات کہی اور آپ کا فرمان بھی وہی تھا۔ روایات میں خاصا اضطراب وخلا ہے لیکن یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ "شہادت وبینہ" کا ذمہ صرف مدعی پر اور "حلف وقسم" کا معاملہ مدعا علیہ پر ڈالنا صرف ایک پہلوئے عدل ہے۔ عدل نبوی اور عدالت اسلامی تمام پہلوؤں پر غور کر کے عدل وانصاف کرنے کی پابند ہے اور وہی عدالت نبوی کا طریق محکم تھا۔ اصول مذکورہ سچے لوگوں اور پاکباز ملت میں جاری ساری رہے گا مگر جھوٹوں کی دنیا میں اور جھوٹے گواہوں اور غلط قسم کھانے والوں کے جہان میں گواہی اور ثبوت لازمی ٹھہریں گے۔[1]

اولاد میں عادلانہ تقسیم مال کا ضابطہ:

ایک مالدار ومخیر صحابی بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنے چہیتے فرزند حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو ایک باغ اور اس کی اراضی اپنی زندگی میں ہبہ کر دی۔ ان کی بیوی اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی ماں حضرت عمرہ بنت رواحہ

1- مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم، حدیث حضرت وائل بن حجر کندی۔

خزرجی رضی اللہ عنہما نے اس عطیہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنالینے کی شرط اپنی رضا و قبولیت کے لیے رکھی۔ عدالت نبوی کے استفسار پر معلوم ہوا کہ ہبہ کرنے والے صحابی نے اپنی کئی اولادوں میں صرف ایک کو ترجیحاً باغ کا ہبہ دیا ہے تو آپ نے اسے ظلم قرار دے کر گواہ بننے سے انکار فرمایا اور اصول عدالت بیان کیا کہ یا تو سب اولاد کو برابر برابر مال و دولت کا عطیہ دو یا اس ظالمانہ ہبہ کو واپس لو۔ روایت میں اختلاف ہے لیکن یہ واضح ہے کہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے یا تو اس ہبہ کو واپس لے لیا تھا یا سب فرزندوں / اولاد کو مساوی مالیت کے باغات و اراضی ہبہ کیے تھے۔[1]

قرض کالین دین:

مالیات کی فراہمی کے ایک خود کار اور خود کفیل ذرائع ہوتے ہیں جن سے محنت وغیرہ سے مال و دولت حاصل ہوتی ہے اور دوسرے وسائل غیر سے حصول کے طریقے ہیں۔ بسا اوقات ان دونوں کی حد فاصل مٹ جاتی ہے اور خود پیداواری ذرائع کی کارکردگی جاری رکھنے کے لیے دوسروں کے مالی وسائل سے استفادہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت جیسے مالیاتی اداروں میں خود کا سرمایہ اور محنت بنیادی ہوتا ہے مگر ان کے دائرہ ہائے کار کی وسعت و توسیع کے سبب وسائلِ غیر کی مدد ناگزیر بن جاتی ہے۔ وسائل غیر میں قرض کالین دین اسی سماجی اور معاشی ضرورت کے لیے تمام معاشروں میں جاری ساری رہا۔ خواہ وہ نقد و رقم کی صورت میں ہو، خواہ جنس و آلات کے صورت میں ہو قرض چاہے سودی ہو یا بلا سودی، حسنہ ہو یا استحصالی یا صرف احسانی اور رحمانی۔ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان قرآن مجید کے بقول قرض دیتے ہیں اور کئی گنا منافع واپس پاتے ہیں اور مغفرت کا مزید عطیہ پاتے ہیں۔ ﴿إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾[2] بسا اوقات صرف زندگی برقرار رکھنے اور جسم و جان کا رشتہ استوار رکھنے کے لیے قرض کالین دین سماجی ضرورت بن جاتا ہے۔

عہد نبوی میں قرض کے لین دین کی تمام حسین و استحصالی اور انسانی و یہودی صورتیں جاری ساری تھیں، کہ معیشت و اقتصاد ہی نہیں زندگی و سماج بھی ان پر منحصر تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک احسانی سنت اور

۱- بخاری، کتاب الھبۃ، کتاب الشھادات/باب الھبۃ للولد وغیرہ؛ **فتح الباری**، ج ۵، ص ۲۶۰ومابعد؛ مسلم کتاب الھبات۔

۲- سورۃ التغابن: ۱۷۔

ملکوتی صفت جس کا ذکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بوقت تنزیل قرآنی تسلی و تشفی میں ملتا ہے دوسروں پر اپنا مال و دولت و محبت لٹانے کی تھی۔ دوسری سماجی و مالی سنت قرض لینے اور دینے کی بھی تھی۔ بنفس نفیس آپ اپنے لیے، اپنے اہل عیال کے لیے، اپنی امت کے لیے قرض لیتے اور ان کو ادا کرتے رہے، دوسرے افراد و طبقات کو بھی آپ نے اپنے مال و دولت سے قرض دیے اور ان سے واپس لیے۔ صحابہ کرام بھی اسی طرح معاشی و سماجی ضرورتوں سے قرض لیتے دیتے رہے۔ ان میں قرض حسنہ بھی شامل تھے تو بالعموم اہل ایمان و احسان سے لیے دیے جاتے تھے۔ اور ان میں انسانی ہمدردی، سلوک احسانی اور غیرت قومی بھی برابر کام کرتی تھی۔ مالدار یہودی اور مشرک افراد و طبقات سے لین دین سودی بنیادوں پر ہوتا تھا۔ متعدد مکی، یثربی، طائفی اور دوسرے مالدار مشرکین سودی کاروبار کرتے تھے جیسے یثرب / مدینہ کے یہودی قبائل اور دوسرے شمال و جنوب کے مالدار یہودی تحریم سود کے احکام تورات کے باوجود قرض کا لین دین صرف سود و ربوا کی بنیاد پر ہی کرتے تھے۔ اس گناہ آلود کاروبارِ ربا میں نجران کے عیسائی بھی اپنی شریعت میں حرمتِ سود و ربوا کے باجود ملوث تھے۔ اصلا کسی دین و شریعت میں سود حلال کبھی نہیں رہا۔

سودی کاروبار کی بندش اور سودی قرض کے لین دین کی حرمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دین ابراہیمی، دین و شریعت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام سے میراث میں ملی تھی۔ عہد جاہلی میں بہت سے افراد و طبقات اور قبائلی شیوخ و سردار سودی کاروبار کو حرام سمجھتے تھے اور اپنے دین ابراہیمی کے شعورِ پاکدامنی اور پاک دلی کی بنا پر اس سے بچتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ طبقاتِ عرب سود خوراں جو اس کاروبار تلویث میں مال و دولت کی حرص میں گردنوں تک ڈوبے تھے اسے حرام ہی سمجھتے تھے اور نیک کاموں میں سودی مال یا سودی گندگی سے ملوث اموال لگانے سے احتراز کرتے تھے جیسے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت قریش کے مشائخ و سادات نے سب سے عہد لیا تھا کہ وہ اللہ کے گھر کی عمارت کاری میں سود آمیز مال نہیں لگائیں گے اور اس پر وہ کاربند بھی رہے تھے۔

قرض میں سود و ربوا کی آمیزش چونکہ ایک فریق (قرضدار کی) دوسرے فریق (قرض خواہ / مالدار) کے استحصال کو لازم ہوتی تھی، لہٰذا وہ بہر حال حرام قرار دی گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سماجی عدل و انصاف اور اس سے بڑھ کر انسانی فلاح و بہبود اور انسانی سلوک و طریق کا ایک کارنامہ تو یہ ہے کہ ذات گرامی کو کبھی آلائش سے آلودہ نہ فرمایا، حتی کہ اس کا خیال خام بھی خاطر عاطر میں گزر نہ پاسکا کہ لوث ذہنی ہی عمل گندہ کی طرف لے جانے کا باعث بنتا ہے، ذات والا صفات اپنی ہئیت و ساخت اور سرشت میں اس سے ہمیشہ منزہ و مبرا رہی اور آپ نے کبھی

سود دیا اور نہ لیا۔ قرض بھی بلا سود ہی دیا۔ اسی طرح صحابہ طاہرین وصحابیات طاہرات اپنی پاکیزہ سرشت کی وجہ سے عرب دینی براہیمی تربیت کی بنا پر سودی کاروبار اور سودی قرض لین دین سے پاک رہے۔

رسول اکرم ﷺ کا مالیات، خاص کر سودی کاروبار کے سلسلہ میں سماجی عدل وانصاف کا انسانیت نواز اور خیر وبہبود انگیز کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے روز اول سے سود کو حرام قرار دیا۔ اور ہر مسلمان کو اسلام لاتے ہی اس کے لین دین سے اس طرح محفوظ کیا جس طرح کفر وشرک اور اس کی پروردہ حرام چیزوں سے کیا تھا۔ یہ بھی اصولی طور سے یاد رکھنے کی بات ہے کہ آپ نے تمام انبیائے کرام کی مانند اور ان سے بڑھ کر تمام طیبات کو حلال قرر دیا اور تمام خبائث کو حرام بتایا۔ اور سود ان میں سے اخلاق سوز، انسانیت کش اور فرد وسماج بلکہ پوری معاشرت کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ بلاخوف تردید اور بلا نقل روایات وشہادات یہ بات پورے وثوق اور حقیقت شناسی سے کہی جارہی ہے کہ ہر شخص کو اسلام لاتے ہی دوسرے تمام گناہوں سے اور حرام چیزوں سے اسی طرح روکا جاتا تھا جس طرح شراب خوری، سود خوری، زنا وبدکاری، قمار بازی اور ہر طرح کی بازیوں سے روک دیا جاتا تھا۔ اسلام وایمان کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ شراب نہ پیئں گے اور نہ سود لیں گے اور نہ دیں گے۔ جن علماء ومفکرین اور سیرت نگاروں نے ایک مدت تک عہد نبوی میں شراب خوری اور سود خوری کی اجازت وحلت بیان کی ہے یا ان کی تحریم کے مرحلے بیان کیے ہیں ان کو غلط فہمی لگی ہے۔ اس پر بحث کہیں اور خاص مفصل ومدلل کی جاچکی ہے۔ اس کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

شراب خانہ خراب اور دوسری حرام چیزوں سے زیادہ سود خوری سماجی عدل وانصاف کے نفاذ وقیام کی راہ میں سب سے بڑھ کر روڑہ بلکہ قاطع حیات شے تھی۔ اسی بنا پر آپ نے دوسرے ادیان، پیروان یہودیت ونصرانیت وغیرہ، کے ساتھ سودی کاروبار کرنے یا سود وربوا کی بنا پر قرض لینے دینے سے قانوناً روک دیا۔

مکی وقریشی عہد نبوی میں رسول اکرم ﷺ نے مشرکین عرب وقریش کو سودی کاروربار سے روکا۔ انھوں نے نہ مانا یہ دوسری بات تھی کہ آپ کو اس وقت ریاستی طاقت اور سرکاری قانونی قوت حاصل نہ تھی۔ مدنی دور میمون میں آپ نے یہودی قبیلوں سے انصار کرام کے بعض یا متعدد افراد وطبقات کو قانوناً اور حکماً یہودی قرض خواہوں کو سود نہ ادا کرنے کا حکم دیا اور غزوات بنی قینقاع اور بنی نضیر میں انصاری قرضداروں نے اپنے اپنے یہودی قرض خواہوں کے راس المال (اصل مال) تو واپس کیے مگر سود دینے سے انکار کیا۔ نجران کے عیسائی / نصرانی

طبقات سے صلح کی شرائط میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ سودی کاروبار نہ کریں گے۔ یہ ریاست مدینہ اور اس کے سربراہ کا اسلامی حکم تھا۔ (1)

قرض حسنہ واحسانی:

بلاسود قرض کو احسانی قرض نظام میں بدلنے کا طریق حکمت و سماجی عدالت نے یہ قائم کیا کہ آیات قرآنی کے مطابق قرض دار کو مہلت دلوائی اور قرض خواہ کو اپنے دینی بھائی یا اپنے سماجی عزیز اور ساکن ہم وطن کو آسانی سے قرض ادا کرنے کی سہولت دینے پر آمادہ کیا اور ان کے اخلاق و ایمان اور جذبۂ خیر کو اس پر ابھارا۔ اس کی ایک صورت یہ تھی کہ قرض کی رقم کو بالا قساط لینے دینے پر طرفین کو راضی کیا۔ ایک سے زیادہ واقعات صحابہ اور ان کے یہودی قرض داروں یا مسلم قرض خواہوں کے ملتے ہیں، مثلاً حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو ان کے یہودی قرض خواہ سے فصل آنے تک مہلت دلائی اور بوقت فصل خود آپ نے اس کا قرض جنس / کھجور کی صورت میں ادا کروایا۔

قرض احسانی کے دو تین واقعات بہت اہم ہیں اور وہ اس باب مالیات میں سماجی عدل و سلوک کے نہایت اہم اور روح پرور علائم ہیں:

1- اس پوری بحث کے لیے کتاب خاکسار "مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقا" باب سود و ربوا ملاحظہ ہو۔ نیز مقالہ خاکسار بھی جس کا عنوان ہے: "اسلام میں ربا کی تحریم - مختلف جہات کا تنقیدی تجزیہ"۔ مشمولہ مقالات سمینار "معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات"، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ ۲۰۱۱ء، نیز دوسرے مقالات۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ پر دراصل ان کے والد کا لیا ہوا قرضہ تھا، جس کا تقاضا غرما / قرض خواہ کرتے تھے۔ یہ پورا واقعہ حدیث بخاری: ۲۳۹۵ میں ہے۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ان کا قرض ادا کرانے میں مدد کی۔ حدیث بخاری ۲۴۰۵ میں بہت دل چسپ و اہم اضافہ ہے۔ مختلف قرض خواہوں نے جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو ان کے باپ عبد اللہ بن عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ کے قرضوں کی ادائیگی پر اصرار کیا تو فرزند سعادت مند نے کچھ قرض معاف کر دینے کی التجا کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاف کرانے کی سفارش کروائی، تب بھی وہ انکاری رہے۔ آپ نے فصل کے پکنے پر مختلف کھجوروں / اقسام تمر کے الگ الگ ڈھیر بنانے کا حکم دیا، پھر اپنے قرض خواہوں کے بلانے کا حکم دیا۔ آپ بھی وہاں تشریف لے گئے اور بیٹھ گئے۔ ہر قسم کے ڈھیر سے، ان میں سے ہر ایک کا قرض پورا پورا ادا کیا گیا پھر بھی ساری فصل جوں کی توں بچ گئی۔ یہ معجزہ الٰہی اور کرامت نبوی کی فصل تھی۔ ادائے دین کی یہ سماجی عدل گستری تھی جو اخلاص و نیت صالح پر اتری تھی۔

حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ نے ایک مالدار صحابی حضرت کعب بن مالک خزرجی رضی اللہ عنہ سے ایک مدت کے لیے قرض لیا لیکن بروقت ادا نہ کر سکے۔ دونوں فریق اس معاملہ پر الجھ پڑے اور ان کی آوازوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمع خراشی کی اور آپ نے از خود اقدام فرمایا اور دونوں میں صلح کرادی۔ روایات کے مطابق آپ نے قرض دہندہ کو راضی کر لیا کہ وہ آدھا قرض ابھی لے لیں اور آدھا بعد میں۔ اس سے بڑھ کر دوسرا موقف احسانی یہ آپ نے تجویز کیا کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ صرف قرض کی آدھی رقم فوری طور سے قبول کر لیں اور آدھا قرض معاف کر دیں۔ قرضدار فریق تو راضی برضا تھے ہی حضرت کعب رضی اللہ عنہ جیسے صاحب خیر وبہبود نے اسے بطیب خاطر قبول کر لیا۔ یہ قرض احسانی کی ایک انسانیت نواز اور سماجی عدل کی آدھی سطح تھی۔ (۱)

ایک صحابی کریم وجلیل حضرت ابو الیسر رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو قرض دیا مگر قرض دار ان سے کتراتا اور وہ جب اس کے گھر تقاضا کرنے جاتے تو وہ چھپ جاتا تھا۔ صحابی عظیم وجلیل نے اپنے قرض دار کی شرمندگی وخجالت اور مجبوری کا احساس کیا اور آخری بار جب وہ تقاضے کے لیے ان کے گھر گئے اور وہ چھپ گئے تو بلند آواز سے کہا: اگر اس مہلت کے بعد بھی وہ اسے ادا نہ کر سکے تو قرض سب کا سب معاف ہے۔ یہ عدل سماجی نبوی کا پرتو تھا جو عدالت صحابہ میں ظہور پذیر ہو کر سماجی عدل وانصاف سے اسلامی معاشرہ کو ملکوتی واحسانی بناتا تھا۔ (۲)

قرض کا لین دین بعض افراد وطبقات کی نظر میں غیر محتاط یا غیر ضروری ہے، لیکن وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مالی سنت اور سماجی عدالت بھی ہے۔ آپ نے بطور قرض رقم وجنس لینے دینے کی وکالت وحمایت کی، مگر بشرط ضرورت واحتیاج، محض دوسروں کا مال لینے اور اسے ہڑپنے کا طریق نہیں تجویز کیا، بلکہ اسے حق مسلم وحق عبد قرار دے کر قرضدار کی ذمہ داری، دنیاوی فلاح اور اخروی بہبود کی شرط قرار دیا۔ غصب اور قرض میں فرق بہت واضح ہے اور اس طرح قرض حسنہ اور قرض استحصالی میں فرق ہے۔ بسا اوقات قرضدار اپنے محسنوں کا استحصال کرتے ہیں اور وہ سماجی انصاف کو برباد کرتے ہیں۔

۱- بخاری، **کتاب الصلوٰۃ**، باب التقاضی والملازمۃ فی المسجد؛ **فتح الباری**، ج ۱، ص ۷۱۵-۷۱۳۔

۲- مسلم، **کتاب الزھد**، باب حدیث جابر رضی اللہ عنہ ۔۔۔ الخ۔

غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف:

امامِ عدالت واحسان، سید المرسلین اور خاتم النبیین ﷺ اپنی ذات والاصفات میں ودیعت کردہ عدل گستری کی بنا پر صرف انصاف ہی کر سکتے تھے اور ناانصافی کا شائبہ تو خیال خاطر والا میں بار بھی نہ پا سکتا تھا۔ سیرت وکردار کا یہی کمالِ معدلت تھا کہ اپنی ذات سے عادلانہ انتقام لیتے تھے۔ قرآنی احکام الٰہی نے معاشرہ عرب میں اپنوں، بیگانوں، دوستوں، دشمنوں، عزیزوں اور مسلمانوں، غیر مسلموں سب سے عدل وانصاف کرنے کا اصول وطریق عطا کیا تھا۔ سرشتِ مطہرہ اور ذاتِ پاکیزہ میں اندرونی عادلانہ جلوہ آرائیوں نے وحی الٰہی کی خارجی نیرنگیوں سے مل کر عدل معاشرتی کا وہ تصور وعملِ نبوی اور انصافِ سماجی کا وہ طریق ومعیارِ محمدی بروئے کار لائیں جس کو دیکھ کر دشمنان جان وایمان تک گواہی دیتے کہ یہی وہ عدل وانصاف ہے جس کی وجہ سے آسمان وزمین قائم ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ارض وسما کا قیام ونظام ان کے اختیار کے بغیر اور کارساز اعلیٰ کی عادلانہ کاریگری کے سبب قائم ہے۔ خاتم الانبیا ﷺ کا سماجی عدل وانصاف اختیارِ بشر ورسول کے وسیع عریض دائرے اور امکان وعمل کے مشکل دائروں میں کاریگری کرتا ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کا سماجی عدل وانصاف ایک وسیع تر تحقیق کا متقاضی ہے اور دفتروں کی وسعت کا طالب۔ مختصر یا مطول مقالے کی تنگنائے ظرف میں اس کی سمائی قلم بشر اور رقم ناقص کی سیرت نگاری کی کوشش وکاوش کی تنگ دامانی کی مانند مشتے از خروارے ہے۔ مطالعہ سیرت اور تحقیق حیات طیبہ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی غیر مسلموں کے باب میں معدلت گستری کا سلسلہ مکی دور سے مدنی عہد تک دراز ہے۔ قبل بعثت، بقول امام ابن اسحاق، توفیق الٰہی نے آپ ﷺ کو حق وصحیح کی تمیز وترجیح کی دولت سے نوازا تھا، جو قلب نبوی میں اندرون سے ابھرتی اور خارج میں الہام والقا سے استفادہ کرتی۔ بعثت ونبوت کے بعد کار رسالت کا تقاضا ہی عدل گستری تھا۔ مکی دور میں نہ صرف قریشی عزیزوں اور مکی عربوں سے واسطہ پڑا تھا بلکہ حبشی، ایرانی، یمنی، عیسائی اور یہودی عناصر وطبقات سے بھی ارتباط رہا تھا۔ وہ تجارتی، شخصی، دینی، سماجی، مالی، اقتصادی اور تہذیبی نوعیتوں کو محیط تھا۔ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اپنی عالمگیر نبوت ورسالت اور کامل وآخری کتاب وشریعت کی طرح ہمہ گیر وہمہ جہت تھا۔ مدنی عہد نبوی میں مسلم اقلیت کے سربراہ اور انسانیت کے معلم اور اللہ رب العالمین کے آخری نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی ریاست اور ایک خالص اسلامی

معاشرت وتہذیب کے بانی مبانی اور سربراہ ومنتظم کی قوت نافذہ اور سیاسی طاقت سے بھی معدلت گستری فریضہ وعمل بن گیا تھا۔ وہ قولی اور عملی سماجی انصاف بھی تھا۔ قانونی وتشریعی عدل وقسط بھی تھا۔ سیاسی اور سماجی اداروں اور تقاضوں میں کارگزاری کرنے والا بھی تھا۔ مال ومعیشت، اقتصاد وتجارت، لین دین، قرض وسلوک سے متعلق بھی تھا، اور تہذیب وتمدن کے مختلف ابواب وعناوین سے بھی اسی طرح وابستہ تھا۔[1] وقت وظرف کی تنگ دامانی کی وجہ سے صرف چند عناوین وموضوعات کے تحت غیر مسلموں سے عدل وانصاف نبوی کا سماجی منظرنامہ پیش کیا جاتا ہے۔

عہد مکی کا ایک انقلابی اصولِ عدل:

بالعموم اس سماجی عدل وانصاف کے رجحان ساز، روح پرور اور انسانیت نواز اور عدل پرور واقعہ کا ذکر ایک محدود دائرہ ومفہوم میں کیا جاتا ہے مگر وہ اپنی گوناگوں جہات اور عظیم الشان ابعاد کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کی سماجی عدل گستری اور صحابہ کرام کی معاشرتی عدالت کے ساتھ اشراف قریش کے حسن خیال وعمل کا بھی ایک اثبات ہے۔ اس پر بحث ومباحثہ بعد میں پہلے اصل واقعہ عدالت وانصاف۔

صحابی جلیل حضرت عبدالرحمن بن عوف زہری رضی اللہ عنہ نے اپنے دیرینہ دوست، شریکِ تجارت اور ندیم امیہ بن خلف جمحی سے ہجرت مدینہ سے قبل ایک معاہدہ کیا۔ قریشِ مکہ کے دو زعماء تجارت ومعیشت اور شہر حرام کے دو بااثر مشائخ کے درمیان وہ کثیر المقاصد اور وسیع الجہات تحریری معاہدہ اذن نبوی سے کیا گیا تھا۔ اس کی دفعات ومبادیات کے مطابق دونوں فریق ایک دوسرے کی، ان کے اہل وعیال کی حفاظت اور فریقین کو اپنے اپنے علاقہ وشہر میں جانی ومالی تحفظ فراہم کرتے، ان کی تجارتی مساعی اور مفادات کی حفاظت کرتے، سماجی طور سے ایک دوسرے کی اپنے اپنے علاقوں اور شہروں میں خاطر داری اور تواضع وامداد کرتے۔ یہ باہمی معاہدہ مدافعت وتحفظ

۱- متعدد مباحث کے تعلیقات وحواشی پہلے گزر چکے ہیں۔ غیر مسلم طبقات واقوام سے نبوی روابط اور ان کے حسن وکمال معدلت کا ذکر متعدد کتب ومقالات خاکسار میں آچکا ہے جیسے: مکی اسوہ نبوی، عبدالمطلب ہاشمی - رسول اکرم کے دادا، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۰۴ء، عہد نبوی میں قریش وثقیف کے تعلقات، سیرت چیر وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی ۲۰۱۵ء، تاریخ تہذیب اسلامی، جلد اول، قاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۴ء، عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں، عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، قاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۵ء (نیا ایڈیشن ۲۰۱۶ء) وغیرہ، عہد نبوی کا تمدن، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۱۰ء۔

اس سماجی اور سیاسی اور دینی پس منظر میں کیا گیا تھا جب ایک فریق صحابی اور دوسرا معاند نبوی تھا۔ دونوں میں اسلام کی وجہ سے اتنی سماجی بیگانگی اور معاشرتی بے لطفی پیدا ہوگئی تھی کہ کافر و مشرک فریق حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو ان کے اس نئے اسلامی نام سے پکارنا پسند نہ کرتا اور وہ ان کو ان کے پرانے مشرکانہ نام عبد عمرو سے مخاطب کرتا اور حضرت صحابی جلیل حمیت اسلامی میں اس پر کان نہ دھرتے۔ دونوں میں بحث و تکرار بھی ہوتی۔ آخر کار بڑی تمحیص و تحفظ کے بعد اس پر مصالحت ہوئی کہ وہ ان کو "عبد اللہ" کے نام سے پکارے گا اور وہ اس کو سنیں گے۔ لفظ 'رحمن' باعث خلجان کافری تھا۔ اس سے بڑا سبب مناقشہ وافتراق یہ تھا کہ امیہ بن خلف جمحی تمام تر قرابت کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت موذی دشمن تھا اور اسلام کا شدید ترین مخالف وہ اور اس کا بھائی ابی بن خلف جمحی بر سر عام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف مخالفت کرتے بلکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ایذا دیتے اور قتل نبوی کے ارادے باندھتے۔ اس کے باوجود دونوں دوستوں اور تجارتی شریکوں میں یہ معاہدہ موانست و تحفظ کیا گیا اور باقاعدہ تحریر میں لایا گیا۔ غالباً اس پر گواہوں کے دستخط بھی ثبت تھے اور علم تو سب کو تھا۔ غزوہ بدر میں امیہ بن خلف جمحی اپنے فرزند علی بن امیہ جمحی اور برادر اخبث وغیرہ دوسرے معاندین کے ساتھ شریک ہوا اور سخت جنگ و جدال میں پورا حصہ لیا۔ صحابی جلیل نے خدشات و خطرات کے پیش نظر دونوں مشرکوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور رات کی تاریکی میں لوگوں کے سونے کے بعد امیہ کو پہاڑ میں کسی محفوظ جگہ لے جارہا تھے کہ امیہ کے دشمن حضرت بلال بن رباح حبشی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں دشمنان جانی کو دیکھ لیا جو مکہ مکرمہ میں ان پر سخت مظالم کرتے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے رفقاء اور مجاہدین کے ساتھ ان دونوں کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ صحابی موصوف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور ان کے انصاری رفقاء کے تعاقب کو دیکھ کر علی جمحی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تاکہ لوگ اس میں مشغول ہو جائیں اور وہ امیہ کو بحفاظت نکال لے جائیں مگر وہ ان کے تعاقب میں لگے رہے۔ حضرت عبد الرحمن زہری رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں نے ان دونوں معاندین و مشائخ قریش کی حفاظت اپنی سی تمام سعی کی مگر بلال رضی اللہ عنہ نے ان کی ٹانگوں میں گھس کر ان کو قتل کر ہی دیا۔ حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو اس مجاہدہ میں سخت زخم آئے جس کو وہ بعد میں دکھایا کرتے تھے۔ ان کو اپنے معاہدہ کی پاسداری نہ کر سکنے کا بے انتہا قلق تھا اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے سخت شکوہ بھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ جہاد و مجاہدہ کو تسلیم کر لیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

غیر مسلموں سے سماجی روابط اور مسلم و غیر مسلم تعلقات میں عدل گستری کی جہت سے اس معاہدہ تحفظ و سلامتی کے بعض اہم اطراف ہیں:

امام بخاری و دیگر محدثین نے اس معاہدہ کا ذکر حسب دستور مختلف کتب کے الگ الگ ابواب میں کیا ہے اور ان کی اہمیت وفقاہت وحکمت اجاگر کی ہے۔[1] وکیل، دارالحرب اور دارالاسلام کی اصطلاحات بعد کی امام موصوف کے زمانے کی ہیں۔ کتابت معاہدہ کے وقت مکہ مکرمہ مقام تھا۔ وہ دارالحرب نہ تھا اور دارالاسلام کا الگ سے وجود نہ تھا۔ معاہدہ کا اطلاق بلا قید زمان ومکان فریقین کی حیات تک تھا اور وہ اطلاق اور قانونی حیثیت وطن مالوف ومہجور سے دارالھجرۃ اور دارالاسلام تک وسیع ہوگئی تھی۔

امام المحدثین سے سو سال قبل امام سیرت وحدیث ابن اسحاق نے اپنی سند متصل سے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بعض قیمتی تفصیلات کے ساتھ بیان کی ہے۔ "امیہ بن خلف ان کا مکہ کا دوست (صدیق) تھا۔ میر انام عبد عمرو تھا اور اسلام لانے کے بعد میں نے عبدالرحمن مکہ میں ہی رکھ لیا تھا۔ امیہ جب مجھ سے ملتا تو عبد عمرو کہہ کر مخاطب کرتا اور کہتا کیا تم نے اپنے والدین کا تسمیہ /نام چھوڑ دیا ہے۔ میں کہتا: ہاں۔ وہ کہتا: میں "الرحمن" کو نہیں جانتا لہٰذا اپنے اور میرے مابین ایسا کچھ نام رکھ لو جس سے میں تمہیں مخاطب کروں کیونکہ تم اپنے اولین نام پر جواب نہیں دیتے اور جس کو میں جانتا نہیں اس نام سے میں تم کو پکاروں گا نہیں۔ میں نے کہا: اے ابو علی، تم جو چاہو نام رکھ لو۔ اس نے کہا تم کو عبداللہ سے پکاروں؟ میں کہا: ہاں۔ لہٰذا جب میں اس سے ملتا یا گزرتا وہ مجھے عبداللہ کہہ کر پکارتا اور میں اس سے بات چیت کرتا۔[2]

ابن اسحاق میں غزوہ بدر میں ان دونوں کے قتل اور حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے بچانے اور اپنی سلب ادراع اور قیدیوں کے فدیہ سے محروم رہنے کی تفصیل کافی مختلف ہے۔ اس میں معاہدہ کی کتابت اور اس کی شروط کا ذکر بھی نہیں ہے۔

۱- کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل المسلم حربیا فی دارالحرب او فی دارالاسلام جاز، کتاب المغازی باب قتل ابی جھل، بالترتیب احادیث :۲۳۰۱،۳۹۷۱۔ موخر الذکر بہت مختصر ہے اور صرف معاہدہ کی کتابت اور قتل امیہ بن خلف وعلی عجمی اور نعرہ بلالی کا ذکر کرتی ہے۔ اس باب اول میں حربی کو مسلم کے وکیل بنانے کا خواہ دارالحرب میں ہو یا دارالاسلام میں جواز کا فتویٰ دیا ہے

۲- بخاری / فتح الباری، مذکورہ بالا؛ ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۸۰-۱۷۹: مقتل امیۃ بن خلف؛ واقدی کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونس، عالم الکتب بیروت ۲۰۰۶ء ۹۲-۹۱ ومابعد: متعدد ومتصادم روایات۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی شرح بخاری کے دونوں ابواب وکتب میں خاصی تفصیلات دی ہیں۔ ان میں دونوں مشرکوں کے قتل میں شریک مجاہدین اسلامی کے اسماء ہیں۔

امام سیرت وحدیث واقدی نے کتاب المغازی میں امیہ بن خلف جمحی کے قتل کے حوالے سے ابن اسحاق والی روایت اپنی سند سے معمولی لفظی اختلافات کے ساتھ نقل کرنے کے بعد کئی اور روایات بھی نقل کی ہیں۔ ان میں قتل مشرک کے علاوہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے بعض اکابر سے اس کے تعلقات سماجی کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے مصادر سیرت وحدیث سے بھی متعدد معلومات اور قیمتی جہات کا سراغ ملتا ہے۔ ان سب سے سماجی تعلقات میں نبوی عدل گستری اور اسلامی وسیع القلبی کا جو جہان محبت وآشتی اور ظرف موانست ویگانگی ملتے ہیں، وہ قرآن کریم کی آیات عدل معاشرتی بالخصوص دشمنی وعداوت کے باوجود انصاف پسندی اور عدل خیزی کرنے کے اطلاق عام کا اثبات کرتے ہیں۔ ان میں سے چند زاویے بہت اہم ہیں:

اول: یہ کہ اختلاف عقائد اور تصادم مذاہب کے باوجود سماجی تعلقات اپنے وسیع ترین تناظر میں اور بلند ترین پیمانے پر قائم کرنے ہی کے لیے نہیں ان کو استوار وتابندہ کرنے کے لیے بھی اور ان کو مزید استحکام دینے اور دوسرے افراد وطبقات امت وملت کے لیے مثال بنانے کی حتی الامکان کوششیں کرنی لازمی ہیں۔ صحابہ کرام نے اوران کے آقا ومولیٰ نے اپنے کافر عزیزوں او موذی اقربا کے ساتھ سماجی تعلقات نہ صرف جوڑے رکھے بلکہ ان کو ہر طرح استحکام بخشا۔ اسلام اسی بنا پر سماجی تعلقات منقطع کرنے کی اجازت نہیں دیتا حتی کہ کھلی دشمنی اور برملا مخالف مذہب ودین کی صورت میں بھی ان کو بنائے رکھنے کی سفارش کرتا ہے اور یہ تو کفر وشرک کے ماروں کا وتیرہ تھا اور ہمیشہ رہا ہے کہ وہ اختلاف دین وعقیدہ کی بنا پر سب سے پہلے سماجی تعلقات اور معاشرتی روابط یہاں تک کہ خون وگوشت کے رشتوں کو کاٹ کر پھینک دینے کی سب سے پہلے کوشش کرتے ہیں جیسا کہ بیشتر موذی اکابر مکہ اور طبقات مشرکین نے کیا تھا۔

دوم: یہ کہ رسول اکرم ﷺ کے خلاف یاوہ گوئی، دشنام طرازی، تکلیف دہی، ستم رانی اور آخر کار قتل وغارت گری اور دربدر کرنے کی تمام مجرمانہ سازشوں اور غیر انسانی حرکتوں کے باوجود صحابی جلیل حضرت عبد الرحمن بن عوف زہری رضی اللہ عنہ نے ایک بدقماش موذی رسول سے دیرینہ دوستی کے تعلقات استوار رکھے، اس کے ساتھ مجالست وموانست جاری رکھی۔ اور قرب وقرابت کے سماجی روابط

برقرار رکھے اور جلاوطنی سے ذرا قبل اس سے ایک دوسرے کے مال ومنال اور خاندان واعزہ کی حفاظت ومدافعت کا ایک نیا اور تحریری معاہدہ کیا جو دونوں قریوں کے علاقوں میں کارگرو کارساز تھا۔ اور جنگ وجدال کے زمانے میں اسی معاہدہ تحفظ ومدافعت کی پاسداری میں مسلم صحابی نے کافر ومشرک حملہ آور کی شکست کے بعد جانی ومالی تحفظ کی سرتوڑ کوشش کی۔ اپنے ہم مذہبوں اور محبت ورافت کے ساتھیوں کی مخالفت مول لی اور کافر دوست ندیم کی حفاظت میں اپنی جان جوکھم میں ڈال دی اور کاری زخم کھائے۔ یہی وہ مشرک موذی تھا، جس نے ایک بے بہا گھوڑا خرید کر اسے بہترین چارہ کھلاتا تھا، تاکہ وہ فربہ اور تیز رفتار ہو جائے اور وہ اس پر سوار ہو کر رسول اکرم ﷺ سے جنگ کرے اور آپ کو قتل کرے۔ یہ اس کے دل کی چھپی ہوئی آرزو اور تمنائے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ برملا آپ کو قتل وجدال کی دھمکی دیا کرتا تھا اور اس کے جواب میں آپ عمل مکافات کا اظہار فرماتے کہ آپ ہی اس کا کام تمام کریں گے اور وہ آپ کی صدق وصفا کی وجہ سے ہراساں تھا کہ وہ خود سچ مچ مارا جائے گا اس لیے وہ غزوہ بدر میں جانے سے گریزاں تھا مگر قوم کے دباؤ میں حالات کے جبر سے گیا اور بشارت نبوی کے عین مطابق تہہ تیغ ہوا کہ تیغ بلالی میں جلال نبوی کی جلوہ گری تھی۔

اس ضمن میں ایک اور صحابی جلیل حضرت سعد بن معاذ اوسی رضی اللہ عنہ مدنی کے امیہ بن خلف جمحی سے تعلقاتِ مہر ووفا اور روابطِ کاروبار وصفا کا ذکر بھی مناسب ہے۔ دونوں دوست اور تجارتی شراکت کے ندیم تھے۔ ایک دوسرے کے علاقہ میں جاتے تو ایک دوسرے کے گھروں میں قیام کرتے اور ان کی مدارات سے شاد کام ہوتے۔ غزوہ بدر سے قبل مدنی صحابی مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے گئے تو اپنے مکی مشرک ندیم کے مہمان رہے اور اس کی حفاظت اور نگہداشت میں عمرہ کے مناسک ادا کیے۔ راستہ میں فرعون امت ابوجہل مخزومی سے اچانک مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے نہ صرف رسول اکرم ﷺ کو مدینہ میں پناہ وتحفظ دینے پر سختی سے کلام کیا بلکہ اہل مدینہ کے لیے حج وعمرہ اور زیارت کا راستہ بند کرنے کی بھی دھمکی دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب میں اس کی سخت کلامی اور دھمکی کا ترکی بہ ترکی جواب دیا اور قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنے کا صاف اشارہ دیا جس سے وہ اور زیادہ تلملا گیا۔ امیہ بن خلف جمحی نے دونوں کو ٹھنڈا کیا اور معاملہ رفع دفع کیا۔ اس واقعہ میں سماجی انصاف اور عدل گستری کا یہ پہلو ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے مدنی صحابی کو اپنے ایک موذی مشرک مکی شیخ سے سماجی وتجارتی روابط برقرار رکھنے کی اجازت دی اور ان پر قیام کے دوران خانہ مشرک کی مداراتوں سے نہ روکا اور حضرت صحابی

اختلاف فکر و دین کے باوجود نہ رکے۔ ان کو بھی امیہ بن خلف جمحی جیسے موذی کی حرکات ناشائستہ اور مجرمانہ سازشوں کا علم تھا، بلکہ ایک روایت کے مطابق انھوں نے ہی اس کو رسول اکرم ﷺ کی وعید قتل کی خبر سنائی تھی اور اسے وحشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مدنی صحابی اور مکی مشرک، مسلم جاں نثار اور کافر دشمن جاں کے درمیان سماجی یگانگت کے تعلقات برقرار رہے۔ یہ نبوی سماجی عدل وانصاف کا بلند ترین آدرش ہے۔[1]

سوم: سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کا عام قانونی اور روایتی پیمانہ بہت ہی محدود و مختصر ہے اور اس میں صرف پہلوئے منفی کی سمائی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی عدل گستری اور آپ کے صحابہ کرام کی عدالت پروری نے اسلام کا ایک وسیع وبلند ترین معیار قائم کیا اور اسے مثالی بنا دیا۔ وہ انسانیت نواز ہے، اکرام بندگان رب العالمین کی ضمانت ہے، دینی داعی اور وحدت فکری کے بلند اقبال کا اعلان ہے کہ عدل الٰہی اور عدل نبوی سب کے لیے سایہ رحمت ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی صفت عالمگیر رحمۃ للعالمین قرار دی گئی کہ رحمن ورحیم رب العالمین کے پرتو عدل وانصاف گستری ہے۔ اسے قرآنی اور نبوی زبان میں داعی و مدعو کے درمیان عدم ارتباط اور حجاب تعبیر کیا گیا ہے۔ دعوت اور دین کسی حجاب اور روک ٹوک کو قبول نہیں کر سکتے۔

خالص قانونی اور معاشرتی ومالی عدل نوازی کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ خیبر کی پیداواروں کی تقسیم کے وقت رسول اکرم ﷺ کے سفیر و نمائندے حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی رضی اللہ عنہ مدینہ سے خیبر جاتے اور پیداواروں / فصلوں کے دو دو برابر کے ڈھیر بناتے اور پھر یہودی کاشتکاروں اور بٹائی والوں سے کہتے کہ وہ جس کو چاہیں لے لیں، دوسرا اسلامی و نبوی حصہ ہوگا۔ ان کے حسن عدل وانصاف پر خیبر کے عام باسیوں کے علاوہ ان کے اکابر واحبار بھی بے ساختہ پکار اٹھتے کہ یہی وہ عدالت گستری ہے جس کی وجہ سے آسمان وزمین اپنے محور پر قائم ہیں۔ یہ شہادت اعداء تھی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ایسا مثالی انصاف وعدل کرنے کے لیے زیادہ دنوں نہیں جیے۔ اوران کے جانشین عمال نبوی نے ان کا کام وطریق معدلت سنبھال لیا اور روایات کے مطابق وہ بھی اسی طرح

1- ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۴۹ وغیرہ؛ بخاری / فتح الباری، ج ۷، ص ۳۵۵-۳۵۱: حدیث ۳۹۵۰؛ واقدی، ص ۶۲-۶۱ ومابعد۔ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، قرطاس، کراچی ۲۰۱۱ء، ص ۲۹۴، نے ایک خاص فصل میں ان عورتوں کا ذکر کیا ہے، جو مسلم شوہروں سے طلاق کے بعد اپنے کافر شوہروں سے جا ملیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا مہر اپنے پاس سے ادا کیا۔

انصاف کے دونوں پلے برابر رکھتے رہے اور غیر مسلم / یہودی کاشتکاروں اور ان کے عالموں کے لیے مثال بنتے رہے۔ رسول اکرم ﷺ کی عدالت گستری اور انصاف پروری صرف ذات عالی تک محدود نہیں تھی۔ اور صرف آپ کی ذات والا صفات سے سب کو فیض نہیں پہونچا تھا بلکہ آپ نے اپنے صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات کے دلوں میں بھی عدل وانصاف ذاتی وسماجی کا ایسا ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ عدالت صحابہ نہ صرف ایک اصول وعقیدہ بن گئی بلکہ ایک ضرب المثل اور ایک عملی مثال بن گئی۔ اور اس نے پورے نبوی سماج میں عدل وانصاف سماجی کے وسیع تر معانی وجہات سمجھادے۔[1]

یہودی افراد وطبقات خیبر وغیرہ کے باب میں رسول اکرم ﷺ نے متعدد دوسرے سماجی عدل گستری کے علائم قائم فرمائے جیسے:

- ایک مسلم صحابی کی چند نامعلوم افراد کے ہاتھوں شہادت کا واقعہ قسامہ کا اصول عدالت بن گیا۔ یہودی، براءت کا اظہار کرتے اور مقتول کے وارث شہادت وگواہی پیش کرنے سے قاصر تھے۔ آپ نے شہید کی دیت بیت المال سے ادا کی اور عرب روایات کے مطابق کی۔[2]
- فتح خیبر کے بعد ایک یہودیہ زینب نامی کی دعوت طعام قبول کرلی۔ اس ظالمہ جہاں نے زہر آلود گوشت کھلانے کے ذریعہ سرکار دو جہاں کا کام تمام کرنا چاہا۔ وحی حدیث جبریلی نے آپ کو سازش سے باخبر کیا اور آپ نے ہاتھ روک لیا لیکن آپ کے ایک صحابی سخت بھوک کی وجہ سے لقمہ نگل گئے اور جاں بحق ہوئے۔ تفتیش نبوی پر مجرمہ نے اقرار جرم کیا مگر وجہ جرم یہ بتائی کہ وہ آپ کی نبوت کی صداقت کا تجربہ کرنا چاہتی تھی: اگر آپ صادق ہیں تو واقف ہو جائیں گے اور کاذب کا انجام تو موت ہونا ہی چاہیے۔ آپ نے عام روایات کے مطابق اسے سزا نہ دی۔[3]

۱۔ ابن اسحاق، ج ۳، ص ۲۱۵ بالخصوص ۲۲۶: حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی رضی اللہ عنہ کے جانشین عامل حضرت جبار بن صخر بن امیہ سلمی وغیرہ تھے۔

۲۔ ابن اسحاق / ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۲۷-۲۲۶: ایک عامل صدقات حضرت عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ مقتول ہوئے تھے۔ ان کے برادر اصغر عبدالرحمن بن سہیل رضی اللہ عنہ ولی الدم ہوئے اور عدالت نبوی میں مقدمہ کی پیروی حضرات حویصہ و محیصہ فرزندان مسعود رضی اللہ عنہ نے کی۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے سو اونٹ کی دیت ادا کی۔

۳۔ ایضاً، ج ۳، ص ۶۱۲-۲۱۵۔

- یہودِ مدینہ کے ساتھ آپ کا طریق معدلت بھی آدرش اور انسانیت کے لیے قابل تقلید ہے: جنگ جو قبائل بنی قینقاع، بنی النضیر اور بنی قریظہ کے صلح پسندوں اور بے گناہوں کو معاف فرمادیا۔ ان میں سے متعدد کو ان کے اموال لوٹا دیے۔ تحقیق جدید کے مطابق بنو قریظہ کے صرف مجرم سرداروں کو غداری کی سزادی اور عام آبادی کو معاف کر کے ان کو جلاوطنی سے معاف کر دیا۔ متعدد اخلاقی اور سماجی جرموں میں ان کے بعض مجرموں کو آیات واحکام تورات کے مطابق سزادی کہ وہ عدل کا تقاضا تھا۔ اسی کے ساتھ دیت وقصاص کے معاملہ میں یہودی انحراف شریف ورذیل، عزیز وفروتر کو ختم کر کے تمام قبیلوں کو یکساں سطح پر رکھا اور ان کو سماجی عادلانہ مساوات دی۔ جلاوطن ہونے والے قبیلوں اور طبقوں کو اسلحہ کے سوا سارا سامان لے جانے دیا اور یہاں تک صحابہ کرام سے ان کے قرض کی رقوم ادا کروائیں، صرف سود کی ادائیگی ممنوع قرار دی کہ وہ یہودی دین وشریعت میں بھی حرام ہے اور عیسائی دین وشریعت میں بھی۔ اس لیے عیسائی طبقات نجران وغیرہ کو ایک / متعدد تحریری معاہدوں کے ذریعہ سودی کاروبار کرنے سے روک دیا تھا۔ سودی نظام سماجی ظلم ہے اور اس سے نجات دلانا معاشرتی عدل وانصاف ہے اور اس باب میں آپ نے تمام ساکنان ریاست اسلامی کو مساوی، منصفانہ اور محسنانہ عدل سماجی سے سرفراز کیا تھا۔[1]

- تجزیاتی میزان عدل میں: عدل نبوی ہو یا انصاف صحابہ، سماجی عدل وقسط کا ایک بلند ترین آدرش ملتا ہے جو اپنے بیگانے، عزیز و بعید، مسلم وغیر مسلم، ملکی وآفاقی غرض کہ سب کے لیے ہے اور جس میں کسی قسم کی ترجیح، جانبداری اور کجی نہیں ہے۔ عہد نبوی میں سماجی انصاف وعدل کا تصور وعمل دراصل عدل الٰہی سے نکلتا ہے اس اصولی اور نظریاتی اور مابعد الطبیاتی کائناتی عدل وانصاف کو رسول اکرم ﷺ نے اپنی شخصی حیثیت میں بعثت سے قبل اور رسول آخر الزماں ﷺ کی حیثیت سے بعد نبوت برت کر اور نافذ کر کے دکھادیا۔ سماجی عدل وانصاف کا سب سے عظیم ومشکل مرحلہ اس وقت آیا جب سید المرسلین ﷺ امام امت وریاست بنے اور اس آخری اور بلند ترین حیثیت سے قیام عدل اور نفاذ انصاف کا سیاسی، آفاقی، انتظامی وریاستی نظام پیش فرمایا اور ان سب کو اسوہ کاملہ بنادیا۔ سید المرسلین اور خاتم النبیین ﷺ کی

1- غزوات بنی قینقاع وبنی قریظہ کے بیانات وروایات مصادر سیرت وحدیث میں ملاحظہ ہوں۔

حیثیت سے تمام انبیائے کرام، صالحین امم وطبقات کے سماجی عدل اور انصاف کا جامع نظام قائم وجاری ساری کر کے دکھادیا۔ امام العادلین ﷺ کے سماجی عدل وانصاف میں روحانی اور مادی جہات بشری میں توازن واعتدال پیدا کیا جو عدل وقسط کا صحیح سرمایہ اور لب لباب ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں توازن واعتدال اور ایک دوسرے کی نفی واثبات میں انسانی عجلت پسندی اور فطری تخلیق کی جلد بازی کو عادلانہ لگام لگائی۔ عام انسانی قوانین عدل وانصاف میں صرف مادی اور قانونی جہات کو مد نظر رکھنا کافی ہی نہیں بڑا خسروانہ سمجھا جاتا ہے اور روحانی واندرونی تقاضوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ عہد نبوی کے عدل سماجی میں ان دونوں میں مثالی اعتدال پیدا کیا۔ اعتدال بھی تو عدل سے ہی ماخوذ ومستنبط ہے جس میں کوشش وسعی سے عدل پیدا کیا جاتا ہے۔ سید المرسلین ﷺ اور خاتم النبیین ﷺ کا نفاذ وقیام عدل وانصاف تا قیامت باقی رہنا تھا لہٰذا صرف امام العادلین کی شخصی ومنصبی عدل گستری کافی نہ تھی۔ امت وصحابہ کرام کی اس باب میں بھی تربیت ضروری تھی لہٰذا آپ کی عدالت گستری نے امت مرحومہ کو عدل وانصاف کا خوگر بنایا اور صحابہ کرام کو عدالت نبوی سے متصف کیا۔ وہ خیر امت کے آدرش طبقہ کی حیثیت سے اسلامی نبوی عدل گستری کے اپنے زمانے میں پیکر بنے اور سماجی انصاف کرتے رہے اور ان کے خلف الرشید طبقات وافراد امت اسی کے پیرو اور اس پر عامل ہیں اور جو کسی طرح کے بھی انحراف کے مجرم ہیں وہ خیر امت کے حصے نہیں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ اور عہد نبوی کا سماجی عدل وانصاف دراصل اپنی تمام ابعاد وجہات اور اطراف ومقاصد میں احسانی عدلِ معاشرتی ہے۔

فلاحی معاشرہ کے لئے سماجی بصیرت کی ضرورت واہمیت

سیرت النبی ﷺ کا ایک مطالعہ

Need and Significance of Social Insightedness for a Welfare Society in the Light of Sīrat Al-Nabi (SAW)

سعید الرحمن*

In religious literature foresightedness, deep understanding, sanity and similar words reflect the fact that Islam doesn't encompass shallow way of thinking instead deep understanding has been acknowledged as endless bliss by the Holy Quran .

The Holy Sīrah of Allah's messenger reflects deep understanding, consciousness and full awareness. The Holy Quran addresses the Holy Prophet as a teacher of mankind. He (SAW) observed practical obligations towards the society. He also comprehended reformative changes. He chalked out a considerable and rational policy and strategy for revolutionary changes. By this way he laid a foundation stone for a welfare society which ultimately established a system with healthy traditions. The non-Islamic social system was reformed. The activities of livelihood and earning-bread were also Islamized. He (SAW) also introduced a calculated system of physical and spiritual purification. He also falsified and nullified all obnoxious factors and forces which might be harmful and dangerous for a pure Islamic society. He developed and nourished the abilities of positive thinking. He also brought into existence the proper utilization of limited resources to reap maximum benefits. He incorporated and inculcated the respect and dignity for human rights. This research throws light upon the themes and ideas of Sīrat Al-Nabi in this regard.

دینی لغت میں بصیرت، حکمت اور فراست جیسے الفاظ اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دین اسلام سطحی، ظاہری اور نمائشی انداز فکر نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنی تعلیمات میں روشنی، دوررسی، گہرائی، وسعت فکری اور پائیدار نتائج پر نظر رکھنے کی ہدایت سے مالامال ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں حکمت کو خیر کثیر (بہت زیادہ بھلائی)

* پروفیسر موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1] حکمت کے مفہوم میں علم و عقل کے ذریعہ درست اور سچی بات تک پہنچنا، ہر شئ کو اس کے مناسب موقع و محل میں رکھنے کی صلاحیت، عقلی رہنمائی اور قلبی بصیرت، برائیوں کی درست نشاندہی کے بعد اس کے علاج کی صحیح تدابیر جیسے امور شامل ہیں۔ ابن قیم الجوزیہ کہتے ہیں: "بصیرت، دل کی زمین میں سچی معاملہ فہمی پیدا کرتی ہے، یہ ایک نور کا نام ہے جو اللہ دل میں ڈالتا ہے جس کے ذریعہ حق و باطل اور سچے و جھوٹے کے درمیان فرق کیا جا سکے۔"[2] اس ضمن میں ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آیت سے بھی استدلال کیا ہے ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾[3] کہ معروف تابعی مفسر مجاہد بن جبیر نے اس کا مفہوم یوں بیان کیا ہے کہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو فراست والے ہیں۔[4]

قرآن حکیم میں صاحب اختیار کے لئے جسم اور علم میں صاحب "بسطہ" ہونے کی مطلوبہ صفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ جسمانی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس میں کام و مقام کی مناسبت سے ذہانت و فراست اور فہم و تدبر کی استعداد ہو۔[5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، بصیرت و حکمت اور شعور و فراست کی بھرپور عکاسی کرتی ہے اور آپ دیگر امور حیات کی طرح ان امور میں بھی اسوہ حسنہ کی لازوال حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم میں آپ کو معلم حکمت قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے موجود سماج کا گہرا عملی مطالعہ کیا، معاشرتی تشکیل نو کے لئے دستیاب مواقع سے استفادہ کی حکمت عملی واضح کی، ان مواقع میں توسیع کے طریقے دریافت کئے اور متبادل مواقع تلاش کئے۔ یوں

۱۔ سورۃ البقرۃ: ۲۶۹۔

۲۔ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ (۷۵۱ھ)، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین (تحقیق: محمد المعتصم باللہ البغدادی)، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۶ھ، ج ۱، ص ۱۴۸۔

۳۔ سورۃ الحجر: ۷۵۔

۴۔ مجاہد بن جبیر التابعی (۱۰۴ھ)، تفسیر القرآن (تحقیق: دکتور محمد عبد السلام)، دار الفکر الاسلامی الحدیثۃ، مصر ۱۹۸۹م، ج ۱، ص ۴۱۷؛ علاء الدین علی بن محمد الخازن (۷۴۱ھ)، لباب التاویل فی معانی التنزیل (تحقیق: محمد علی شاہین)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۵ھ۔

۵۔ ملاحظہ ہو: محمد تقی امینی، قیادت کی خصوصیات، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان، ص ۸۔

یک فلاحی معاشرہ کی تاسیس فرمائی جس میں کثیر القبائلی معاشرہ کو پر امن بقاء باہمی کے ماحول سے روشناس کرایا، جہالت زدہ معاشرہ کو علم و حکمت سے آراستہ کیا، حصول رزق حلال کو دینی فریضہ قرار دے کر معاشی سرگرمیوں کی اہمیت اجاگر کی اور حفظان صحت کے لئے جسم، لباس اور ماحول کی پاکیزگی پر مشتمل جامع نظام طہارت متعارف کرایا، نیز سماجی تشکیل میں دراندازی کرنے والے داخلی عناصر کو اپنی سماجی بصیرت کے ذریعہ غیر مؤثر بنایا۔ انسانی صلاحیتوں اور ان کی نفسیات سے آگہی کی بنیاد پر درست مواقع پر درست افراد کے انتخاب میں عملی فراست سے کام لیا، معاشرہ میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ محدود وسائل کے متنوع استعمال کی حکمت عملی سے روشناس کرایا اور انسانی حقوق کے احترام کا شعور انسانی ذہنوں میں راسخ کیا۔

(۱) رسول اللہ ﷺ آغاز وحی کے بعد بعثت کے عظیم الشان کام کی اہمیت کے پیش نظر دعوت دین (جس کے نتیجہ میں فلاحی معاشرہ کی تشکیل ناگزیر تھی) کے لئے اپنی سماجی بصیرت کو کام میں لائے اور اس حوالہ سے اپنے بااعتماد حلقہ کو مخاطب کیا تاکہ اس کو ہمنوا بنا کر اگلا قدم اٹھایا جائے کہ پہلے مرحلہ کی صورت گری کے بعد ہی اگلے مرحلہ تک رسائی، دنیا کے نظام اسباب کا تقاضہ قرار پاتا ہے اور اس کو نظر انداز کر کے کسی بھی عمومی اقدام سے فساد معاشرہ کے باعث مقتدر عناصر کو طوفان بدتمیزی کے ذریعہ تعمیر معاشرہ کے مشن کو سبوتاژ کرنے کا سازگار موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر آپ نے تین سال اپنے پیغام کو مؤثر طریقہ سے اپنے قریبی حلقہ میں منتقل کر کے اس کو اپنا دست و بازو بنایا،[1] یوں دستیاب موقع سے آپ نے حکیمانہ استفادہ کیا۔ اس سے اس امر کی رہنمائی واضح ہے کہ معاشرہ کو فلاحی بنانے کے طریق کار میں سماجی ساخت کی نوعیت کو ملحوظ رکھ کر حکمت عملی وضع کرنا ہی درحقیقت سماجی بصیرت کا تقاضہ ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ نے اپنے قریبی حلقہ میں سے بااعتماد افراد کو مکمل طور پر ہمنوا بنانے کے بعد علانیہ دعوت دین کا آغاز کیا تو آپ کو مکہ کے غالب نظام کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جس کے جواب میں آپ نے بلا کسی مداہنت کے صبر و ضبط کی سماجی حکمت عملی اختیار کی جس کا حکم آپ کو اس آیت مبارکہ میں دیا گیا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾[2]

۱۔ ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی (۲۱۳ء)، **فقہ السیرۃ النبویہ** (ترجمہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی)، نشریات لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۱۔

۲۔ سورۃ الحجر: ۹۴۔

کہ اللہ کے دیے گئے حکم کا برملا اظہار و ابلاغ اس طور کیا جائے کہ اس کے رد عمل میں ہونے والے اشتعال انگیز اقدامات میں الجھنے کی بجائے اعراض اور نظر انداز کرنے کی حکمت عملی اختیار کی جائے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے مخالفین کے جبر و تشدد کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی اور سماج میں مسلّم طریقوں کو استعمال کیا۔ عربوں کے ہاں جوار، ولاء اور حلف جیسے معاہدوں کو سماجی پذیرائی حاصل تھی،[۱] جن میں منسلک ہونے والے افراد اپنے عقائد و خیالات سے قطع نظر امن کے مستحق ہوتے تھے، اس لئے جو نو مسلم اپنے قبیلے یا علاقے میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے انتہائی جسمانی و ذہنی دباؤ میں ہوتے ان کو مذکورہ مسلّم طریق ہائے سکونت میں کسی ایک کے ذریعہ اس دباؤ سے حفاظت مہیا کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے قریب ترین صحابہ کرام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی نظام وقت کے جبر کے مقابلہ کے لئے ان سماجی معاہدوں سے استفادہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا جناب ابو طالب کی وفات کے بعد بنو نوفل کے سردار مطعم بن عدی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے احابیش کے سردار مالک بن الدغنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عاص بن وائل سہمی کے جوار سے منسلک ہو کر اپنی سماجی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔[۲]

۱- دو مختلف قبائل باہمی معاہدہ کے تحت جب یکجا سماجی زندگی اختیار کرتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک قبیلہ کی مانند ہو جاتے تو اس کو حلف کہا جاتا ہے، اور جب کوئی فرد کسی قبیلہ کی پناہ میں میں آجاتا اور قبیلہ اس کی پشت پر کھڑا ہو جاتا، اس کو "جوار" سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اگر وہ شخص مستقل اس قبیلہ کا حصہ بن جاتا اور اس کی نسبت اختیار کر لیتا تو اسے "ولاء" کہا جاتا ہے (عمر فروخ، **تاریخ الجاهلیة**، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۲۴ء، ص ۱۵۰)۔

۲- عبد الرحمن بن عبد اللہ السہیلی (۵۷۱ھ)، **الروض الانف فی شرح السیرة النبویة لابن هشام** (تحقیق: عمر عبد السلام السلامی) دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۱ھ، ج ۳، ص ۲۲۴-۲۲۵؛ عبد الملک ابن ہشام (۲۱۳ھ)، **السیرة النبویة** (تحقیق: مصطفی السقاو غیرہ)، مطبعة مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۷۵ھ، ج ۱، ص ۳۷۲؛ بدر الدین محمود بن احمد العینی (۸۵۵ھ)، **عمدة القاری شرح صحیح البخاری**، باب اسلام عمر بن خطاب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ج ۱۷، ص ۴۔

(۳) رسول اللہ ﷺ نے اپنی سماجی بصیرت کے ذریعہ دستیاب مواقع میں توسیع کو بھی پیش نظر رکھا۔ چنانچہ بیرون مکہ سے جو حضرات مکہ آکر اسلام قبول کرتے تو آپ ان کو ضروری تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کے بعد مکہ میں ٹھہرانے کی بجائے ان کو اپنے قبائل میں جاکر دینی دعوت کی اشاعت کے لئے مامور کرتے تاکہ مکہ کے گردوپیش میں ایک ایسا سماجی ماحول تشکیل پاجائے کہ مستقبل میں تشکیل پانے والے فلاحی معاشرہ کے لئے ممد و معاون ثابت ہو۔ چنانچہ غفار و اسلم کے قبائل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ذریعہ، اشعری قبیلہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اور اسی طرح دیگر کئی قبائل اس وقت کی تشکیل پانے والی امت مسلمہ کے لئے اثاثہ ثابت ہوئے۔[۱]

(۴) سماجی بصیرت کا تقاضا ہوتا ہے کہ فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے محض موجود مواقع پر ہی انحصار نہ کیا جائے بلکہ متبادل مواقع بھی تلاش کئے جائیں۔ اسی سبب رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں ہونے والی مزاحمت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے جبر و تشدد کے جواب کے لئے محض مکہ کے سماجی ڈھانچہ میں موجود مواقع کو استعمال نہیں کیا بلکہ آپ نے دیگر علاقوں کے سماجی ماحولیات کے سازگار ہونے کا بھی جائزہ لیا تو آپ نے حبشہ کے نظام کو اس حوالہ سے موزوں تصور کیا کہ وہاں کا بادشاہ (نجاشی)، سماجی معاملات میں انصاف پیشہ ہے۔ جب کہ مکہ کے لوگ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی حبشہ کو نفع بخش منڈی تصور کرتے تھے اور وہاں کے امن و امان کی صورتحال بھی حکومت وقت کے قابو میں تھی۔ یوں ہجرت حبشہ کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک بہتر ماحول مہیا ہوا۔ جس سے مستقبل میں تشکیل پانے والے اسلامی تمدن اور حبشہ کے نظام کے مابین قریبی تعلقات کی اساس بھی مہیا ہوئی۔ چنانچہ نجاشی حبشہ، اصحمہ نے اسلام قبول کیا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے عقد نکاح کا اہتمام کیا اور اپنی طرف سے آپ کا مہر چار سو دینار بھی ادا کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔[۲]

۱۔ مسلم بن الحجاج النیشاپوری (۲۶۱ھ)، **الجامع الصحیح**، باب من فضائل ابی ذر، رقم الحدیث ۲۴۷۳؛ محمد ابن سعد (۲۳۰ھ)، **الطبقات الکبری** (تحقیق: احسان عباس)، دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء، ج ۶، ص ۱۶۔

۲۔ ابن سعد، **الطبقات الکبری** (تحقیق محمد عبد القادر عطاء)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ، ج ۱، ص ۱۶۲۔

رسول اللہ ﷺ نے محض مذکورہ سماجی حکمت عملی پر انحصار نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ کی دوررس بصیرت نے موسم حج کو موزوں وقت تصور کیا جس میں بیرون مکہ سے مختلف قبائل اور علاقہ جات کے لوگ حج کی عبادت کی انجام دہی کے لئے آتے تھے، آپ ﷺ نے نبوت کے گیارہویں سال سے لے کر تیرہویں سال تک ہر سال اس کثیر القبائلی سماجی ماحول سے براہ راست رابطہ پیدا کیا، اور نہایت عمدہ سماجی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے سن ۱۲ نبوی میں یثرب سے آنے والوں سے فلاحی معاشرہ کے بنیادی خدوخال استوار کرنے کا معاہدہ کیا جو تاریخ میں بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتا ہے، اس معاہدہ کا مقصد ایک پاکیزہ فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے نظریاتی وسماجی تقاضوں کی تکمیل تھی۔ جن کی تفصیل یوں ہے کہ (۱) ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ (۲) ہم چوری نہیں کریں گے۔ (۳) ہم زنا کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ (۴) ہم اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ (۵) ہم کسی پر کوئی بہتان نہیں باندھیں گے۔ (۶) ہم کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اسی معاہدہ کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو یثرب میں فلاحی معاشرہ کی تنظیم کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنا نمائندہ مقرر کیا جو نومسلموں کے لئے معلم بھی تھے اور دیگر افراد کے لئے مبلغ بھی۔[۱]

سن ۱۳ نبوی میں عقبہ اولیٰ کے اصحاب معاہدہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی کاوشوں سے ایک بڑا وفد موسم حج میں رسول اللہ ﷺ سے براہ راست ملاقات کے لئے آیا جو اس امر کی علامت تھا کہ اب یثرب کے حالات اگلے دور میں جانے کے لئے سازگار ہو چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر اس وفد کی سماجی ساخت کے مطابق ان میں بارہ نمائندوں کا تقرر کیا جو اپنے حلقے کے نہ صرف سربراہ ہوں گے بلکہ رسول اللہ ﷺ سے ہونے والے معاہدہ پر عمل درآمد کے بھی ذمہ دار ہوں گے، اس موقع پر ہونے والا معاہدہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ سے فلاحی معاشرہ کے مندرجہ ذیل نمایاں خدوخال سامنے آتے ہیں۔

۱- سیاسی نظم وضبط: ہر صورت میں نظم وضبط کا لحاظ رکھا جائے گا خواہ طبیعت آمادہ ہو یا کسل مند (السمع والطاعة فی النشاط والکسل)

۱- محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶ھ)، **الجامع الصحیح**، کتاب مناقب الانصار، باب وفود الانصار الی النبی ﷺ بمکة۔

۲۔ معاشی وسائل میں عمومی شرکت: معاشی تنگدستی ہو یا خوشحالی، بہرصورت وسائل کو مفاد عامہ میں استعمال کیا جائے گا (النفقة فی العسر والیسر)

۳۔ سماج میں بھلائی کا فروغ اور بدی کا انسداد: (الامر بالمعروف والنهی عن المنکر)[1]

۴۔ دفاع میں ممکنہ حد تک مستعدی کہ جب رسول اللہ ﷺ یثرب آئیں گے تو آپ کی بھرپور تائید اور اس طرح حفاظت کی جائے گی جیسے اہل یثرب اپنی جانوں، اپنے شریک حیات اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں (ان تنصرونی اذا قدمت علیکم یثرب الخ)[1] گویا یہ معاہدہ، یثرب میں تشکیل پذیر معاشرہ کے فلاحی اور ارتقائی پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے، جس میں سیاسی، معاشی، معاشرتی اور دفاعی جیسے اہم شعبہ ہائے زندگی شامل ہیں۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر فلاحی معاشرہ کی سماجی قدریں تھیں، کیونکہ انسانی سماج کے عناصر کا باہمی تعلق اگر صحت مند خطوط پر استوار ہو تو وہ اپنی ترقی کی مادی بنیادوں کو بھی متوازن انداز میں بہتر طور پر آگے بڑھاتا ہے اور ان کو انسانیت کے حق میں استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ فلاحی معاشرہ کی اٹھان باہمی بھائی چارہ کے اصول پر رکھی گئی۔ یہ اصول جہاں اپنی ایک نظریاتی اساس رکھتا ہے، وہاں اس کی سماجی پہچان بھی ہے۔ اس لئے مکی معاشرہ ہو یا مدنی سماج، دونوں میں "مواخات" کو ایک رہنما سماجی اصول کے طور پر اختیار کیا گیا۔ مکہ مکرمہ میں جہاں خاندانوں کے سماجی پس منظر کو ملحوظ رکھ کر مواخات کے اصول کی تشکیل کی گئی، جیسے حضرات شیخین ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات، حضرت عثمان غنی اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات وغیرہ[2] اسی طرح سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو معاشرہ کے سربرآوردہ افراد کے ساتھ مواخات میں منسلک کر کے ایک نئے سماج کے خدوخال کی نقاب کشائی کی گئی مثلاً حضرت حمزہ بن عبد المطلب اور حضرت زید

۱۔ ابنِ حجر احمد بن علی العسقلانی (۸۵۲ھ)، **فتح الباری شرح صحیح بخاری**، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۷۹ھ، ج ۷، ص ۲۲۲ ومابعد۔

۲۔ ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی، **مکی اسوہ نبوی**، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۸۔

بن حارثہ رضی اللہ عنہما نیز حضرت عبیدہ بن حارث ہاشمی اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات نے اس دور کی طبقاتی سوچ کو سخت زک پہنچائی جو ہمیشہ فلاحی معاشرہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور ہوتی ہے، بعد ازیں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو یہاں مکی و مدنی صحابہ کے درمیان مواخات کے سماجی معاہدہ سے یثرب کے تمدن کو ارتقاء بخشا جس نے فلاحی معاشرہ کو وجود بخشا اور یوں تجارتی وزرعی پس منظر رکھنے والے افراد نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک خود انحصار معیشت اور مضبوط سماج کی بنیاد رکھی جس میں دونوں فریقوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنا کردار ادا کیا۔

۶۔ کسی بھی فلاحی معاشرہ کی سماجی بصیرت، اظہار رائے کی آزادی اور دوسرے کی رائے کے احترام سے پروان چڑھتی ہے کیونکہ اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ ساتھ دوسرے کی رائے کی معقولیت کے سامنے اپنی ذاتی صوابدید سے دستبرداری کے جذبہ کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وحی الٰہی کے ماسوا دیگر تمام امور میں بامعنی مشاورت کو سماجی ارتقاء کا لازمی اصول بنا دیا، اور اس میں سماج کے تمام حلقوں کو بالاہتمام شریک کیا۔ غزوہ بدر کے موقع پر جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی دسترس سے بچ نکلا اور اس کی بجائے قریش کے مسلح لشکر کی تیاری کی اطلاعات آئیں تو رسول اللہ ﷺ نے وسیع تر مشاورت کا اہتمام کیا۔ باوجودیکہ بیعت عقبہ ثانیہ کے تحت انصار مدینہ آپ کی معاونت ونصرت اور حمایت ومدافعت کے لئے کمربستہ تھے لیکن جب تک حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے نئی درپیش صورتحال میں انصار کی طرف سے دوٹوک حمایت کا اعلان نہیں کیا، آپ نے جنگ بدر کی حکمت عملی مرتب نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر مشاورت کے عمل کو کسی نے اختیار نہیں کیا اور اس مشاورت میں کتنی بار ایسے مواقع آئے کہ آپ نے اپنی رائے پر اپنے ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دے کر ان کی فکری وتجزیاتی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور ان میں اجتماعی سوچ کو پروان چڑھایا۔[1]

۱۔ غزوہ بدر کے موقع پر حبابؓ بن منذر کی رائے کو، غزوہ احد کے موقع پر اور غزوہ خندق میں حضرت سعدؓ بن معاذ کی رائے کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے کے برعکس قبول کیا۔ اسماعیل بن عمر ابنِ کثیر (۷۷۴ھ)، **البداية والنهاية** (تحقیق: علی شیری)، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۸ھ، ج ۳، ص ۳۲۶-۳۲۷؛ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (۷۴۸ھ)، تاریخ الاسلام ووفیات المشاهیر، الاعلام، المکتبة التوفیقیة، ج ۲، ص ۱۶۲۔

۷۔ کسی بھی معاشرہ کے لئے درپیش سب سے بڑا چیلنج اس کے داخلی استحکام کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ فلاحی معاشرہ کا اس کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں موجود منفی سوچ رکھنے والوں کو مؤثر سماجی حکمت عملی کے ذریعہ غیر مؤثر کر کے ان کی سماجی ساکھ کو ختم کر دیا جائے تاکہ معاشرہ کا فلاح کی جانب ارتقائی سفر جاری رہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں منافقین کے گروہ کے بارے میں نہایت اعلیٰ درجہ کی سماجی بصیرت کام میں لائے اور عسکری طاقت استعمال کئے بغیر ان کو معاشرہ میں ناکام بنا دیا۔ سن ۵ ہجری میں غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر جب ایک انصاری اور مہاجر صحابی کے مابین مریسیع کے چشمہ پر تنازعہ ہوا اور قریب تھا کہ یہ تنازعہ گروہی جنگ میں تبدیل ہو جائے لیکن چند سمجھ دار افراد نے درمیان میں پڑ کر اس تنازعہ کو رفع دفع کرایا۔ مگر جب عبد اللہ بن ابی کو خبر ہوئی تو اس نے شدید رد عمل کا اظہار کیا اور قریبی لوگوں کی موجودگی میں مہاجرین صحابہ کے بارہ میں بدزبانی کی اور یہ قسم کھائی کہ جب ہم مدینہ واپس ہوں گے تو وہاں کے معزز افراد (یعنی اس کا گروہ) ذلیل لوگوں (یعنی مہاجرین) کو نکال باہر کریں گے اور اتفاق سے یہ بات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لی اور رسول اللہ ﷺ کے علم میں لائے۔[1] جب اس موقع پر موجود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان ناپاک ارادوں اور فساد انگیز عزائم کے سبب آپ عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو حکم دیں کہ وہ جا کر اس شخص کی گردن اڑا دیں تو آپ ﷺ نے اس کے سماجی طور پر منفی نتائج کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا (اے عمر! کیا تم پسند کرو گے کہ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ نہیں (میں ایسا نہیں کروں گا))۔ پھر آپ نے اس موقع پر لشکر کے کوچ کرنے کا حکم دے دیا اگرچہ ایسے وقت میں آپ عموماً سفر نہیں کیا کرتے تھے۔ اور یہ سفر مسلسل شب و روز ہوا، حتی کہ اگلے دن جا کر پڑاؤ کیا، جہاں پہنچتے ہی لوگ سفر کی تکان کے سبب نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کا مقصد یہ تھا کہ عبد اللہ بن ابی کی گفتگو موضوع بحث نہ بنے۔ اسی دوران سورۃ المنافقون کا نزول ہوا جس سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی اطلاع کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مدینہ پہنچ کر عبد اللہ بن ابی کے صاحبزادہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو ایک مخلص صحابی تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ میرے باپ کو سزائے موت دینے کا ارادہ رکھتے

۱۔ البخاری، **الجامع الصحیح**، سورۃ المنافقون، ج ۴، ص ۱۸۶۳، رقم الحدیث ۴۶۲۴۔

ہیں تو یہ موقع مجھے ہی دیں، کسی اور کو حکم دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ کہیں غیرت میں آکر اپنے باپ کے مسلمان قاتل کو قتل کرنے کا جرم کر کے جہنم کا مستحق نہ بن جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے، بلکہ وہ جب تک ہمارے درمیان ہے ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور اچھا سلوک کریں گے۔ آپ ﷺ کی اس سماجی بصیرت پر مبنی حکمت عملی نے عبداللہ بن ابی کو معاشرتی طور پر تنہا کر کے رکھ دیا اور وہ اپنی سماجی ساکھ کھو بیٹھا، یوں آپ نے معاشرہ کو خانہ جنگی سے محفوظ رکھا۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا (اے عمر! تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اس دن اسے قتل کرنے کی اجازت دے دیتا جس دن تم نے مشورہ دیا تھا تو اس کے حمایتی طوفان کھڑا کر دیتے لیکن اگر آج میں اس کے قبیلہ کو بھی اسے قتل کرنے کا حکم دوں تو فوراً وہ اس کی تعمیل کریں گے)۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بخدا مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ میری رائے سے زیادہ بابرکت (مؤثر اور دوررس) تھا۔[1]

۸۔ سماجی بصیرت کا ایک اہم مظہر، معاشرہ میں مردم شناسی یعنی افراد کی صلاحیتوں کی درست جانکاری رکھنا ہوتا ہے تاکہ معاشرتی فلاح کیلئے درست موقع پر ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے مشکل اور نامساعد حالات میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ عمر بن خطاب اور ابو جہل میں سے جو اسے محبوب ہو اس کے ذریعے اسلام کو تقویت عطا کرے۔[2] جس کے نتیجہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے سے مسلمانوں کے عزائم میں تازگی کی لہر دوڑ گئی اور ان کی سماجی تنظیم کو تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سفر ہجرت میں اپنے ہمراہی کے طور پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا تو مکہ میں لوگوں سے امانت کے معاملات طے کرنے کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ذمہ داری سونپی۔[3] سن ۶ ہجری میں قریش سے گفت وشنید

۱۔ علی محمد الصلابی، **السیرۃ النبویۃ**، عرض وقائع وتحصیل احداث، المبحث السادس، غزوۃ بنی المصطلق، ج۳، ص۲۹۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو البوطی، **فقہ السیرۃ النبویہ** (مترجم)، ص۳۷۵ومابعد۔

۲۔ محمد بن عیسی ابو عیسی الترمذی (۲۷۹ھ)، **السنن** (تحقیق: ابراہیم عطوۃ)، باب فی مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب، رقم الحدیث ۳۶۸۱۔

۳۔ ابن ہشام، **السیرۃ النبویۃ**، مطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۳۶م، ج۲، ص۱۲۹۔

کے لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنے نمائندہ کے طور پر حدیبیہ سے مکہ روانہ کیا کہ اس وقت مکہ میں ابوسفیان کی حکومت تھی اور ان دونوں کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ مکہ میں خون خرابہ نہ ہو، چنانچہ مر الظہران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مع لشکر پڑاؤ ڈالا اور وہیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کہنے پر ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو حضرت عباس نے عرض کیا کہ ابوسفیان ایسے آدمی ہیں جو فخر پسند کرتے ہیں، ان کے لئے باعث فخر چیز کا اعلان کر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سماجی و سیاسی اثر ورسوخ کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کے لئے امان ہے۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لئے امان ہے۔ اور جو مسجد میں چلا جائے، اس کے لئے امان ہے۔ چنانچہ ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں داخل ہونے سے قبل پہنچ کر مذکورہ امان کے اعلان کر دیے جس کے نتیجہ میں مکہ شدید مزاحمت کے بغیر فتح ہو گیا اور بڑے خون خرابہ سے محفوظ رہا، بعد ازیں مختلف مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو مسلموں کی سماجی ساکھ کے مطابق ان کو دل کھول کر عطیات بھی دیے اور تالیف قلوب کا بھرپور اہتمام کر کے ان کو مسلم سماج میں ضم کر دیا۔[1]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد محرم سن ۷ ہجری میں مختلف حکمرانوں کی طرف خطوط ارسال کرنے کے لئے ان سفراء کا انتخاب کیا جو ان علاقوں کی زبانوں سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، ان میں حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی (برائے ہرقل روم) حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی (برائے کسریٰ فارس) حضرت عمرو بن امیہ ضمری (برائے نجاشی حبشہ) اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہ (برائے مقوقس مصر) رضی اللہ عنھم شامل تھے۔[2]

۹۔ فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے محض درست اقدامات کافی نہیں ہوتے بلکہ درست موقع کا انتخاب بھی ضروری ہوتا ہے اور اگر اس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بسا اوقات اس سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے بلکہ دیگر منفی رخ جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد غالب حیثیت میں ہونے کے باوجود اپنی رائے کے مطابق بیت اللہ کی بنیاد ابراہیمی پر از سر نو تعمیر نہیں کی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: البوطی، **فقه السيرة النبوية**، ص ۴۹۳، ۵۳۴۔

۲۔ البوطی، **فقه السيرةالنبويه**، ص ۴۲۶۔

فرمایا تمہاری قوم کے لوگوں کے کچھ وقت پہلے جاہلیت کا شکار رہنے کے سبب مجھے دیواروں (حطیم) کے بیت اللہ میں داخل کرنے اور اس کے دروازہ کو زمین کی سطح پر لانے میں یہ اندیشہ ہے کہ ان کے دل اسلام سے پلٹ جائیں گے۔[1] آپ کا یہ عمل اس امر کی رہنمائی کرتا ہے کہ معاشرہ کی فلاح میں درست وقت میں درست فیصلہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہی سماجی بصیرت اور معاشرتی حکمت کا تقاضا کہلاتا ہے اور اگر اس کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس سے فتنہ اور معاشرتی اضطراب جنم لینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں ایک مرتبہ ایک شخص نماز عشاء میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی طول قراءت کے سبب نماز باجماعت سے باہر نکل آیا اور اس نے اگلے دن جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ہم دن بھر کاشتکاری کرنے والے ہیں اور رات کو معاذ رضی اللہ عنہ آکر سورۃ البقرۃ (قرآنِ حکیم کی طویل ترین سورت) کی قراءت کرتے ہیں جس کے ہم متحمل نہیں ہوتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو قابل ملامت نہیں سمجھا بلکہ حضرت معاذؓ کو تنبیہ کی۔ اور پھر آپ نے سورۃ الشمس، سورۃ الضحیٰ جیسی سورتیں پڑھنے کا حکم دیا۔[2] نیز آپ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص تم میں سے نماز کی امامت کرائے تو اپنی نماز کو ہلکی رکھے کہ لوگوں میں بزرگ، کمزور اور مریض بھی ہوتے ہیں۔[3] درحقیقت انسانی سماج کی نفسیات سے واقفیت، معاشرتی رجحانات پر نظر اور الاھم فالاھم کا درست ادراک سماجی بصیرت کے وہ بنیادی عناصر ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے بروئے کار لائے۔

۱۰۔ فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اپنے محدود وسائل کو بہتر اور متنوع استعمال کے لئے اپنی سماجی بصیرت اور معاشی حکمت عملی کو بروئے کار لایا جائے۔ عہد نبوی میں ایک انصاری صحابی نے اپنی معاشی ضرورت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا سوال پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وقتی ضرورت پوری کرنے کی بجائے یہ دریافت کیا کہ اس کے گھر میں کوئی اثاثہ ہے تو اس نے اپنی انتہائی

۱۔ محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الحج، باب فضل مکة، رقم الحدیث ۱۶۱۔

۲۔ مسلم بن الحجاج القشیری، **الجامع الصحیح** (محمد نواز عبدالباقی)، باب القراءة فی العشاء، رقم الحدیث ۴۶۵۔

۳۔ البخاری، الجامع الصحیح، باب اذا صلی لنفسه فلیتول ما شاء، رقم الحدیث ۷۰۳۔

ضرورت کی دو بنیادی چیزوں کا ذکر کیا کہ ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ بچھاتے ہیں اور کچھ حصہ اوڑھتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس سے پانی پیتے ہیں۔ گویا اس کا اپنی معاشی ضرورت کے لئے تقاضا مکمل طور پر جواز رکھتا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوا کر ان کی مجلس میں نیلامی کرائی تو ایک صاحب نے ایک درہم میں دونوں کی خریداری کی پیش کش کی تو آپ نے حاضرین مجلس کو کئی بار متوجہ کیا کہ کوئی شخص اس سے زائد رقم دینے کے لئے تیار ہو تو ایک اور شخص ان اشیاء کو دو درہم میں لینے کے لئے تیار ہو گیا تو آپ نے اس سے دو درہم لے کر دونوں اشیاء اس کے حوالہ کر دیں اور یہ درہم اس انصاری صحابی کے حوالہ کئے اور ان کے استعمال کی منصوبہ بندی بھی بتائی کہ ایک درہم سے گھر کے کھانے پینے کا سامان لے لو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، آپ نے اپنے ہاتھ سے اس میں لکڑی کا ایک دستہ لگایا اور فرمایا جاؤ، اس سے لکڑی کاٹو اور فروخت کرو۔ پندرہ دنوں تک میرے سامنے نہ آنا، چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور لکڑی کاٹ کر فروخت کرنے کا کام کرتا رہا۔ پھر جب آپ کے پاس آیا تو اس وقت تک وہ دس درہم کما چکا تھا۔ ان میں سے کچھ کے کپڑے خریدے اور کچھ سے کھانا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس سے اچھا ہے کہ قیامت کے دن تیرے چہرے پر داغ نظر آئیں۔ مانگنا صرف تین افراد کے لئے روا ہے، جو شدید افلاس میں ہو یا ناقابل برداشت قرض کے بوجھ تلے ہو یا جس کے ذمہ دیت ہو اور وہ ادائیگی کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔[1] رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ رہنمائی ایسی سماجی بصیرت کی رہنمائی کرتی ہے کہ معاشرہ اور اس کے افراد اپنے موجودہ وسائل کو بہتر حکمت عملی سے استعمال کر کے خود انحصاری کی منزل پا سکتے ہیں۔

۱۱- فلاحی معاشرہ کے قیام کے لئے وسعت نظری کا ہونا از بس ضروری ہے، جس کے بغیر سماجی بصیرت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرہ کے تمام افراد کے انسانی حقوق کو تحفظ اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی تفریق نہ برتی جائے۔ مدینہ منورہ کے معاشرہ میں یہودی سرداروں کی اس بدعہدی کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ماننے والوں میں یہ بصیرت منتقل کی کہ وہ مذہبی اختلاف کو کسی صورت انسانی

۱- ابو داؤد سلیمان بن اشعث (۲۷۵ھ)، السنن (تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید)، باب ما تجوز فیه المسئلة، رقم الحدیث ۱۶۴۱۔

احترام میں حائل نہ ہونے دیں۔ صحیح روایت ہے کہ حضرت قیس بن سعد اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہما قادسیہ میں تھے تو ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو یہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں کہا گیا کہ یہ اس زمین کا باشندہ ہے یعنی مجوسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے تو ان دونوں صحابہ کرام نے بتایا کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے اور جب آپ کو بتایا گیا کہ وہ یہودی کا جنازہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہیں ہے۔[1] گویا آپ نے انسانی احترام کی اساس اور وحدت انسانیت کی معاشرتی اہمیت واضح کر کے اس کے سماجی رہنما اصول ہونے کی نشاندہی کی۔

بلا تفریق مذہب و نسل انسانی حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ امر بھی معاہدہ کا حصہ بنا کہ جزیرۃ العرب کے دیگر قبائل میں سے جو قبیلہ بھی صلح کے فریقین میں سے کسی کا حلیف بنے گا تو وہ بھی صلح کی تمام دفعات کا پابند ہو گا۔ چنانچہ خزاعہ، مسلمانوں کے اور بنو بکر قریش کے حلیف کے طور پر اس معاہدہ کا حصہ بن گئے، قبل ازیں یہ دونوں غیر مسلم قبائل ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھے۔ سن ۸ ہجری میں بنو بکر کے بنو نفاثہ قبیلہ کے افراد نے خزاعہ پر شب خون مار کر بیس افراد ہلاک کر دیئے تو خزاعہ کے چالیس شہسوار عمرو بن سالم کی قیادت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حالات سے آگاہ کیا تو آپ اپنی رداء مبارک سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا (اگر میں بنو کعب پر ہونے والے ظلم کے خلاف اس طرح مدد نہ کروں جس طرح اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا دفاع کرتا ہوں تو میں اللہ کی تائید و نصرت سے محروم رہوں)، نیز آسمان پر موجود بادل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ (بنو کعب کی ضرور مدد کی جائے گی)۔ پھر آپ نے قریش کو اس معاملہ کی سنگینی کی طرف متوجہ کیا اور اپنے ایلچی کے ذریعہ قریش کے سامنے تین باتوں میں سے کسی ایک بات کو قبول کرنے کا الٹی میٹم دیا کہ خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کی جائے یا بنو نفاثہ کے حلیف ہونے سے علیحدہ ہو جائیں یا معاہدۂ حدیبیہ کی تنسیخ کا اعلان کر دیں تو قریش کی طرف سے قرط بن عمرو نے پہلی دو باتوں کو قبول کرنے کی بجائے معاہدہ کی تنسیخ پر رضامندی ظاہر کر دی۔[2] جس کے نتیجہ میں فتح مکہ جیسا عظیم الشان

۱۔ مسلم بن الحجاج، **الجامع الصحیح**، کتاب الجنائز، باب القیام للجنائز، رقم الحدیث ۹۶۱۔

۲۔ ابنِ سعد، **الطبقات الکبری**، ج ۲، ص ۱۳۴؛ البوطی، **فقہ السیرۃ النبویہ**، ص ۴۸۹۔

واقعہ وقوع پذیر ہوا، گویا بلا تفریق مذہب و نسل مظلوم انسانیت کے حق میں رسول اللہ ﷺ کے اقدام نے ہی فتح مبین کی راہ ہموار کی اور تاریخ میں یہ بات امر ہو گئی کہ مسلمانوں کی طرف سے مظلوم غیر مسلموں کی دادرسی نے جزیرۃ العرب کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔

الغرض مسلم معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں سماجی بصیرت اور معاشرتی حکمت کو رہنما اصول کے طور پر ملحوظ رکھنے سے ہی اس کو حقیقی فلاحی معاشرہ میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار ہوتی ہے، اسی انداز بصیرت کے سبب رسول اللہ ﷺ کو جس ملت حنیفیہ پر مبعوث کیا گیا، اس کو "سمحہ" یعنی سہل اور آسان ہونے سے تعبیر کیا گیا جس کے سبب غلو فی الدین ممنوع اور مسترد قرار پایا۔[1] کیونکہ معاشرتی صلاح و فلاح میں سماجی بصیرت کو ملحوظ نہ رکھنے سے غلو اور تطرف کے رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔ چنانچہ ماضی میں جن اہل مذاہب نے سماجی بصیرت سے انحراف کیا تو ان کے مذاہب انتہا پسند، جمود و تنگ نظری اور سماجی پسماندگی کے نمائندہ بن کر رہ گئے۔ آج بھی بعض مسلم حلقوں میں تصلب فی الدین کو سماجی بصیرت کے منافی اور متضاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے سبب انسانی معاشروں میں تنگ نظری، انتہا پسندی، جمود فکری اور گروہی علیحدگی پسندی کو دین اسلام سے منسوب کر کے اس کو مطعون و مجروح کرنے کی روش، غالب علمی حلقوں کا مہلک ہتھیار بن چکا ہے۔ جس کے ذریعہ مسلم آبادیوں پر آئے دن عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اسلامی تعلیمات اور نبوی ہدایات اس بات کا بھرپور تقاضا کرتی ہیں کہ مسلم معاشرہ کے تمام افراد کو علم و شعور اور حکمت و بصیرت سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ ان کے جوش و جذبہ اور حمیت و جرأت کی درست خطوط میں رہنمائی کر سکیں اور آج کی سنجیدہ تحدیات کا درست انداز میں تجزیہ کر کے متوازن راہ عمل کی نشاندہی ہو سکے۔

1- احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)، المسند، عن عائشہ بنت الصدیق (تحقیق، شعیب الارنووط)، رقم الحدیث ۲۴۸۵۵۔

وإنك لعلى خلق عظيم
١٣٣٥

عہدِ حاضر میں تہذیب و شائستگی کے تصوّرات اور اسوۂ نبی ﷺ

Concept of Decency and Decorum in Contemporary Time in the Light of Prophetic (SAW) Life

ثمینہ سعدیہ*

For centuries the Muslim-Ummah has been ruling all over the known world due to its academic excellence, statesmanship, economic and military power. After 17th century, the Muslim-Ummah gradually started moving towards its decline. On the other side, the western civilization captured the horizon of the world. It was the beginning of the 19th century when the Muslims around the world went under the influence of the western civilization. The values and traditions of Islamic civilization were considered as hackneyed both mentally and practically. In Turkey, due to the impact of Ataturk and in the sub-continent due to the influence of English imperialism, the Muslims started to imitate western civilization in its dress, food, dialect, values and way of living etc. Western values and traditions became benchmark of decency and courtesy. In the contemporary era, modern means of communication have played a negative role in this respect. TV Dramas and commercials have made female-sex only a show-piece. Oriental traditions are openly criticized. On the other hand, Islam teaches its followers a life based on decency and discipline in all walks of life under Sīrat Al-Nabi (SAW). This research article throws light on the best example set by Prophet Muhammad (SAW).

اقوام و ملل کی تاریخ میں ملت اسلامیہ اپنے عقائد و افکار، اعمال و اخلاق اور معاشرت و معاملات کے اعتبار سے دنیا کی ممتاز ترین قوم رہی ہے قرون وسطی میں جب کہ یورپ پر وحشیانہ جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مسلمانوں نے مغربی دنیا کے ہر ملک کو علوم و شائستگی کے آفتاب کی کرنوں سے منور کر دیا تھا لیکن انیسویں صدی میں ترکوں کے تنزّل وانحطاط کے بعد دنیا کی رہنمائی کا منصب مغرب نے سنبھال لیا۔ مغربی تہذیب ایک سیلاب کی مانند اٹھی اور تمام روئے زمین پر چھاگئی۔ مغرب کی سائنسی ومادّی ترقی اور چکاچوند کر دینے والی مادر پدر آزاد تہذیب سے مسلمان ممالک بُری طرح متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کی ذہنی غلامی کی تصویر سیّد مودودیؒ کے الفاظ میں: "ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم وفنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان۔

مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہر صورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلّط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین وایمان، اپنے افکار وتخیلات، اپنی تہذیب وشائستگی اپنے اخلاق وآداب سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔[1]

خود مسلمانوں میں سے ہی ایسے افراد اٹھے جو مغربی تہذیب کے علمبردار بن گئے۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک جنہیں مغربی تہذیب سے حد درجہ عشق وشیفتگی تھی، عرفان اورگا نے اپنی کتاب "Ataturk" میں ان کے متعلق لکھا ہے: "وہ کہتا تھا کہ ہم کو ہر پہلو سے مرد بننا ہے۔ ہم نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ہماری مصیبتوں کا سبب یہ تھا کہ ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ دنیا کس راستہ پر جارہی ہے۔ ہم کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی کیا کہتا ہے۔ ہم مہذب وشائستہ بن رہے ہیں اور ہم کو اس پر فخر کرنا چاہئے"۔[2]

تہذیب سے متعلق اس کا کیا تخیّل تھا اور وہ ترکی قوم کو کیا دیکھنا چاہتا تھا۔ "مصطفےٰ کمال اپنی قوم سے کہتا تھا ہم کو مہذّب وشائستہ قوم کا سالباس پہننا چاہئے۔ ہم کو دنیا کو دکھانا چاہئے کہ ہم ایک بڑی قوم ہیں۔ ہم کو دوسری قوم کے ناواقف لوگوں کو اپنے پرانے فیشن کے لباس پر ہنسنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔ ہم کو زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔"[3]

اسی طرح ہندوستان میں سرسیّد احمد خان جو کہ ایک نہایت مخلص مسلمان تھے لیکن وہ بھی تہذیب وشائستگی کے مغربی طور طریقوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے رسالہ "احکامِ طعام اہل کتاب" میں کھانے پینے اور طرزِ معاشرت میں انگریزوں کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "پس اے مسلمانوں! اس پر عمل کرو، خود پسندی وتکبّر کی نیت سے نہیں بلکہ اس نیّت سے کہ مسلمانوں کی حالت میں رفعت وبلندی پیدا ہو جائے

۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۶۔

2- Irfan Orga Margarete, ATTATURK Michael Jeseph ltd, London, 1962, p 297

3- Ibid, p 360

تاکہ اسی ذلّت و مسکنت کی بناء پر جس کے لوگ عادی ہو گئے ہیں۔ کوئی قوم ان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمارے سینوں کا حال معلوم ہے اور وہ ہمارے قلوب کے متعلق صحیح فیصلہ کرتا ہے"۔ (۱)

تہذیب و شائستگی کے بدلتے تصوّرات اور ذرائع ابلاغ کا کردار:

اسلامی ممالک میں مغربی تہذیبی تصوّرات کے فروغ میں ذرائع ابلاغ کا بہت بڑا کردار ہے۔ عالمی اطلاعات کے اس نظام میں نوّے فی صد ذرائع ابلاغ پر ترقی یافتہ مغربی سامراجی ممالک کی اجارہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات تمام دنیائے عالم میں پہنچ رہے ہیں۔ اسلامی ممالک کے ذرائع ابلاغ پر یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے تہوار ایسے دکھائے اور منائے جاتے ہیں گویا کہ یہ مسلمانوں کے بھی تہوار ہوں۔ ویلنٹائن ڈے، بسنت، اپریل فول اور ہیپی نیو ائیر کے پروگراموں کا جوش و خروش کے ساتھ اظہار کیا جاتا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ مسلمانوں کو تہذیب و تمدّن سے عاری، دہشت گرد، وحشی اور جنونی قوم کے طور پر پیش کرتے ہیں اور خود کو انسانیت کا نجات دہندہ اور حقوق کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ دعویٰ ان کے اخلاق و کردار کے بالکل برعکس ہے۔ یہ اپنے رحم و شفقت کے تمام دعوؤں میں قطعاً منافق ہیں۔ مغرب کا اصل چہرہ اور حقیقت ڈاکٹر مصطفی السباعی کے الفاظ میں "گزشتہ دو عالمی جنگوں میں مغربی اقوام کی سنگدلی کے آثار اور اسلامی مشرقِ وسطیٰ میں ان کے اخلاق و اعمال واضح شہادت دے رہے ہیں کہ حکمرانی اور جنگ کے میدان میں ان لوگوں کا کردار حد درجہ ظالمانہ اور بربریّت کا نمونہ تھا۔ ان لوگوں کی یہ منافقانہ پالیسی اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ بین الاقوامی مجالس میں تو اپنی تہذیب و تمدّن، انسانیت دوستی اور محبت و شفقت کا یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں لیکن اپنی لڑائیوں میں، اپنے مقبوضات میں اور اپنی کالونیوں میں وہ کھلے بندوں اپنے وحشی پن اور خون آشامی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"(۲) اس کے برعکس اسلام تو جنگوں میں بھی تہذیب و شائستگی ملحوظ رکھنے کا درس دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی

۱۔ سرسید احمد خان، تہذیب الاخلاق، ۲/۵، بحوالہ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام کراچی، جون ۱۹۷۰ء، ص ۹۷۔

۲۔ مصطفی السباعی، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، مترجم معروف شاہ شیرازی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور فروری ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۳۔

کئی ایک احادیث جہاد کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کرتی ہیں۔[1] اسی طرح کافروں کی لاشوں کا مثلہ کرنے سے بھی منع کیا ہے۔[2] حالانکہ اس وقت عرب میں دشمنوں کا مثلہ کرنے کا عام رواج تھا۔

مغرب کا تصورِ الحاد اور مادہ پرستی کے تہذیبی اثرات:

الحاد و دہریت اور مادہ پرستی کے تصورات نے اہلِ مغرب کو خدا اور کلیسا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اللہ سے انکار اس تہذیب کی بنیادوں میں شامل ہے۔ جین پال لکھتا ہے: "خدا ایک عفریت ہے خدا مر چکا ہے، خدا نہیں انسان مختار مطلق ہے۔"[3] ہمیں الٰہی قوانین اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔ کوئی مستقل دینی اور اخلاقی اقدار نہیں ہوتیں۔[4] عبادات اور کلیسا کی مغربی معاشرے میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ بقول سید قطب شہید: "جب سے لوگوں نے کلیسا کو چھوڑ دیا، اجتماعی زندگی کلیسا سے کٹ گئی۔ اور جب سے دورِ احیاء عصر روشن اور موضوعی مادی فلسفہ نے لوگوں کو کلیسا سے متنفر بنایا، اس وقت سے کلیسا معاشرے اور لوگوں کے پیچھے کھینچا چلا آرہا ہے۔ اب کلیسا کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ معاشرے اور لوگوں کو مذہب کی طرف مائل کرے۔ بلکہ اب مقصد یہ ہے کہ وہ کسی طرح عوام کی خوشنودی حاصل کرے۔"[5]

مغربی تہذیب کے برعکس اسلامی تہذیب ایک مکمل، مستقل اور عالمگیر تہذیب ہے۔ جس کا الٰہی تعلیمات پر مشتمل اپنا ضابطہء حیات ہے۔ قرآن کریم میں اس ضابطہء حیات کو دین کا نام دیا گیا ہے۔ دینِ اسلام اپنے ماننے والوں کو ایمانیات، عبادات اور طہارت کے ذریعے ہر دائرہ حیات میں تہذیب وشائستگی کی تعلیم دیتا ہے۔

۱۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الجهاد والسیر، باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب، رقم الحدیث ۱۷۶۶۔

۲۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب الجهاد، باب فی النهي عن المثلة، رقم الحدیث ۲۶۶۷۔

3- Jean Paul Sartre, Existentialisms as Humanism, (Tr. Philip Maifrt Rutledge, London, 1997, p 284.

4- Jean Paul Sartre, Being and Nothingness, Philosophical Library, New York 1956, p122.

۵۔ سید قطب شہید، **اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل**، مترجم، ساجد الرحمن صدیقی، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، جون ۱۹۷۵ء، ص ۸۹۔

ایمانیات کے ذریعے تہذیب وشائستگی کی تربیت:

اسلامی تہذیب میں افرادِ انسانی کے تزکیہ نفس اور تعمیرِ شخصیت میں سب سے اہم چیز ایمانیات ہے۔ یعنی توحید، رسالت، آخرت، فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا۔ اسلام کا نظامِ ایمانیات ایک مسلمان کو مہذّب وشائستہ بنانے میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ سیّد مودودیؒ کے الفاظ میں: "اسلام کے نظامِ تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی آبادیوں اور ان کی زندگی کے مخفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قائم رکھنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف انہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے۔"(۱)

نظامِ عبادات کے ذریعے تہذیب وشائستگی کی تربیت:

افرادِ معاشرہ کی ذہنی وفکری تطہیر اور جسمانی طہارت ونظافت میں اسلام کے نظامِ عبادات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بقول امام ابن تیمیہ "فبالقيام بالصلوة والزكاة والصبر يصلح حال الراعي والرعية"(۲) (یعنی نماز زکوۃ اور صبر کے قیام سے راعی اور رعایا دونوں کے احوال درست رہتے ہیں)۔

اسلام کے نظامِ عبادات کا سب سے پہلا رکن نماز ہے۔ نماز دین کا ستون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف نماز کے ساتھ ہی تہذیب وشائستگی کے حکیمانہ اصول وطریقے وابستہ ہیں۔ غیر مسلموں میں طہارت ونظافت کا وہ تصوّر ناپید ہے جو اسلام نے دیا ہے۔ اسلام نے ہر نماز سے پہلے وضو کو فرض قرار دے کر مسلمانوں کو پاک وصاف رہنے کا خوگر بنایا۔ استنجا، بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج بھی دنیا کی تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قومیں نابلد ہیں۔ دانتوں اور منہ کی صفائی کے لیے ہر نماز سے قبل مسواک کی تاکید فرمائی۔(۳)

۱۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی**، اسلامک پبلی کیشنز، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

۲۔ ابن تیمیۃ احمد بن عبد الحکیم (م ۷۲۸ھ)، **السياسة الشرعية فى اصلاح الراعي والرعية**، وزارۃ الشؤن الاسلامیۃ والأوقاف والدعوۃ، المملکۃ العربیۃ السعودیہ، ۱۴۱۸ھ، ج ۱، ص ۱۰۶۔

۳۔ ملاحظہ ہو: ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، كتاب الطهارة، باب السواک۔

وقت کی پابندی مہذب اور بااصول لوگوں کی خصوصیت ہے۔ پانچ وقت نماز کی پابندی کے ساتھ ادائیگی سے اوقاتِ کار خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ نماز کے دوران صف بندی کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا (سووا صفوفکم أو لیخالفن اللہ بین وجوھکم)[1] نمازیوں کا ایک امام کی اقتداء میں اکٹھے رکوع وسجود اور قیام کرنا ان کے اندر نظم وضبط کی صفت پیدا کرتا ہے جو کہ مہذّب اور شائستہ زندگی کا خاصہ ہے۔ مہذّب معاشروں کے افراد شرم وحیا جیسے اعلیٰ اوصاف سے آراستہ وپیراستہ ہوتے ہیں۔ شرم وحیا کا وصف پیدا کرنے کے لیے ستر پوشی نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدّو اس تہذیب سے ناواقف تھے۔ حتی کہ عرب کے بعض لوگ خانہ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کیا کرتے تھے۔[2] آج مغربی تہذیب کے زیرِ اثر مسلمان عورتوں نے بھی نیم برہنہ، باریک اور چست لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔ نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ: (ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی)۔[3]

نبی اکرم ﷺ نے نماز کی ادائیگی میں اطمینان وسکون کو ملحوظ خاطر رکھنے کی تاکید فرمائی۔[4] حضور اکرم ﷺ کے ارشاد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں شامل ہوتے وقت بھی وقار واطمینان کا لحاظ رکھا جائے۔ بھاگ دوڑ نہ کی جائے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: (وعلیکم بالسکینة فما ادرکتم فصلوا)[5] (سکون ووقار اختیار کرو اور جتنا حصہ نماز سے مل جائے اسے ادا کرو)۔

نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا تہذیب وشائستگی کے منافی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: (نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا کے آمنے سامنے ہوتا ہے)۔[6]

۱- ابن ماجہ، **سنن ابن ماجة**، کتاب الصلوة، باب اقامة الصفوف، رقم الحدیث ۹۹۴۔

۲- محمّد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الحج، باب لا یطوف بالبیت عریان، رقم الحدیث ۱۶۲۲۔

۳- ابوداؤد، **السنن**، کتاب الصلوة، باب المرأة تصلی بغیر خمار، ۶۴۱۔

۴- ابوداؤد، السنن، **کتاب الصلوة**، باب الصلاة من لا یقیم صلبه فی الرکوع والسجود، رقم الحدیث ۸۵۶۔

۵- مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الصلوة، باب استحباب اتیان الصلوة بوقار وسکینة، رقم الحدیث ۲۶۳۔

۶- النسائی، **السنن**، کتاب المساجد، باب النهي عن ان یتنخم الرجل فی قبلة المسجد، رقم الحدیث ۷۲۵۔

سید سلیمان ندوی نماز کی تہذیبی اعتبار سے اہمیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ "نماز تو در حقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدّنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق و تمدّن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدّن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ ملک کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذّب و متمدّن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیّل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے۔ اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکسیر بن جاتا ہے"۔ (۱)

مغربی تہذیب و ثقافت کے تصور حصول لذت اور مادہ پرستی نے شخصیت کے سنوارنے، اچھا لباس پہننے، اچھی سواری رکھنے اور گھر کو آراستہ کرنے کی آرزو نے مسابقت کی ایسا فضا پیدا کر دی ہے کہ جس کی وجہ سے معاشرے میں مفادات کا تصادم، اور تقسیم دولت میں گہری ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ دولت مندی کی برق رفتار اڑان نے معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ایسا منظر پیش کر دیا ہے جسے ماہرین سماجیات سوشل ڈراونزم (Social Darwinism) کا نام دیتے ہیں۔ یعنی ایسا نظام جس میں مقاصد کے حصول کے لیے ہر ذریعہ اختیار کرنا جائز ہے۔ (۲)

اس کے برعکس اسلام کا نظامِ زکوۃ دولتمند افراد کو خود غرضی، خود پسندی اور عیش پرستی جیسے رذائل اخلاق اور مفلس افراد کو گداگری، دنائت، ذلّت پرستی اور کم ہمّتی جیسے پست اخلاق سے بچانے کے لیے دونوں طبقوں کی اصلاح و شائستگی میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔

افرادِ معاشرہ کے دلوں کی پرہیز گاری اور صفائی کے لیے روزہ جیسی اہم عبادت مشروع کی گئی۔ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان جذبات کی شدّت کو کمزور کرنے کے لیے روزہ تہذیب نفس میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بقول محمد السیّد الشیخون: "ان الصّیام وسیلة الی اصلاح

۱۔ علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۲۰۰۲ء، ج ۴/ ۵، ص ۱۰۰۔

2- J.M. Kenzz, The End cy laissez Faire, Howgerth Press, 1926, P13,14.

النفوس وتهذيبها انه يرى فى الانسان فضيلة الصدق والوفاء والاخلاص والامانة والصبر عند الشدائد"[1] (روزہ نفوسِ انسانی کی اصلاح اور تہذیب کا وسیلہ ہے۔ اس سے انسان میں سچائی، وفاء، اخلاص، اَمانت اور تکالیف کے وقت صبر کرنا جیسے فضائل پیدا ہوتے ہیں)۔

حج کی صحیح آداب وشرائط کے ساتھ ادائیگی مسلمانوں میں اجتماعی اور آفاقی سطح پر نیکی پر ہیز گاری، صلح وآشتی اور اخوّت وبھائی چارہ جیسے اوصافِ حمیدہ پیدا کرتی ہے۔ مہذّب وشائستہ انسان کبھی جھگڑالو نہیں ہوتا۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾[2] (تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے)

الغرض اسلام کا نظامِ عبادات افرادِ معاشرہ کی فکری وذہنی تطہیر اور جسمانی پاکیزگی وصفائی کے ذریعے ان میں اعلیٰ درجے کی تہذیب وشائستگی کو ترویج دیتا ہے کہ اس نظامِ عبادات میں ڈھلے ہوئے افراد ایک متمدّن اور فلاحی معاشرہ کی تشکیل کے ضامن بن جاتے ہیں۔

اسلام کے نظامِ طہارت کے ذریعے تہذیب وشائستگی کی تربیت:

مہذّب معاشروں کے افراد باوقار، شائستہ اور نفیس زندگی گزارنے کے لیے معمولاتِ زندگی میں ایسے عمدہ قواعد وضوابط اپناتے ہیں جو متمدّن ومہذب زندگی کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور جن کی پابندی سے افرادِ معاشرہ کی زندگی پرسکون اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔ قبل از اسلام عرب کا معاشرہ طہارت ونظافت اور تہذیب وتمدّن سے عاری وبیگانہ تھا۔ طہارت ونظافت کے لیے اللہ ربّ العزت نے نبی اکرم ﷺ کو یہ اصولی حکم ارشاد فرمایا: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾[3] (اور اپنے کپڑوں کو صاف رکھئے اور گندگی سے دور رہئے)۔

اس حکمِ الٰہی کے تحت نبی اکرم ﷺ نے امّت مسلمہ کی تہذیب وتربیت کے لیے معمولاتِ زندگی میں ایسے آداب کی تعلیم دی ہے جن کے اپنانے سے انسان مہذّب، باوقار اور شائستہ بن جاتا ہے۔ دینِ اسلام نے بدن کی

۱۔ محمد السید الشیخون، **العبادات فی الاسلام واثرها فی اصلاح المجتمع**، الجامعہ الاسلامیہ، ۱۹۷۷ء، ص۹۵۔

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۱۹۷۔

۳۔ سورۃ المدثر: ۴-۵۔

تہذیب وشائستگی اور اس کی وضع وساخت کو فطرت پر قائم رکھنے کے لیے "خصائل فطرۃ" کے نام سے ایک مکمل دستور العمل پیش کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: (خصال فطرت پانچ چیزیں ہیں۔ ختنہ کرانا، موئے زیرِناف، بغل کے بال صاف کرنا، ناخن اور مونچھ ترشوانا)۔[1] ایک اور حدیث میں خصالِ فطرت دس تک پہنچ گئے ہیں۔ (مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، زیرِناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنا ہوگی)۔[2]

مونچھیں بڑھانے کا فیشن تہذیب مغرب کی وجہ سے کم ہو گیا ہے۔ لیکن داڑھی بڑھانے کی بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح موجود ہے۔ یہ اسلامی شعار کے خلاف ہے۔ کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: (مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ)۔[3] آج کل مسلمان عورتوں میں ناخن بڑھانے اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنے اور سنوارنے کا فیشن موجود ہے، جو کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہے۔ خصالِ فطرت کی پابندی سے انسان نہ صرف مہذّب اور باوقار نظر آتا ہے۔ بلکہ طبّی لحاظ سے بھی متعدد بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

اسلام کے نظامِ طہارت میں ہر نماز سے قبل وضو اور جنابت وناپاکی کی صورت میں غسل کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے جمعہ کے دن غسل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مسلمان ہمیشہ صاف ستھرا رہے اور اسکے گندا رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کے اجتماع میں کسی دوسرے کو تکلیف وپریشانی نہ ہو۔

عصر حاضر میں پاکستانی معاشرہ میں ایک طرف فیشن کے دلدادہ لمبے اور بکھرے بالوں والے نوجوان، مغربی تہذیب کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں، دوسری طرف میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس جعلی پیروں، فقیروں کا وہ طبقہ بھی ہے جو الجھے، بکھرے اور لمبے بالوں کو نیکی اور تقوٰی کی علامت بنائے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ ایک بار نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں

۱۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الطهارة، باب خصائل الفطرة، رقم الحدیث ۲۵۷۔

۲۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الطهارة، باب خصائل الفطرة، رقم الحدیث ۲۶۱۔

۳۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الطهارة، باب خصائل الفطرة، رقم الحدیث ۲۵۹۔

تو فرمایا کہ اس کے پاس بالوں کو ہموار کرنے کا سامان نہ تھا۔[1] ایک دوسرے شخص کو دیکھا کہ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہے تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا کہ جس سے وہ اپنے کپڑوں کو دھولیتا۔[2]

عرب کے لوگ تہذیب وتمدّن سے کم آشنا تھے۔ مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے۔ آپ ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے۔ دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔ ایک انصاری عورت نے دھبہ مٹایا اور اس جگہ خوشبو لاکر ملی، آپ ﷺ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین فرمائی۔[3]

نبی اکرم ﷺ کی اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی نہ صرف اہلِ عرب بلکہ تمام امّتِ مسلمہ کو طہارت ونظافت سے متعلق ایسے آداب سکھادیئے جن سے آج کی متمدّن قومیں محروم ہیں۔ طہارت ونظافت سے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ان ہدایات کی روشنی میں بحیثیت مسلمان ہر فرد کو اپنے کپڑوں، گھروں، گلیوں اور محلّوں کو صاف رکھنا نیز جہازوں، ریل گاڑیوں اور پبلک مقامات پر موجود غسل خانوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا اور صاف کرنا لازم ہے۔ جو صحابہ کرامؓ طہارت کا اہتمام کرتے تھے اللہ تعالی نے ان کی مدح یوں فرمائی: ﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا﴾[4] (ان میں سے ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاکیزہ رہیں)۔

نظام تعلیم پر مغربی تہذیبی اثرات:

اسلامی نظریہ کے مطابق علم، تربیت سے علیحدہ نہیں۔ عہدِ حاضر میں مغربی تہذیب کے غلبہ اور اثرات کی وجہ سے ہمارا نظامِ تعلیم، تعلیم یافتہ لیکن بے کردار نسل تیار کررہا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے نجی تعلیمی ادارے ایسے ہیں جن میں انگریزی نظامِ تعلیم رائج ہے۔ ان اداروں سے مغربی طور طریقوں اور سانچوں میں ڈھلے

۱- ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب اللباس، باب فی غسل الثوب، رقم الحدیث ۴۰۶۲۔

۲- ایضاً، ۴۰۶۳۔

۳- النسائی، **سنن النسائی**، کتاب المساجد، باب تخلیق المساجد، ۷۲۹۔

۴- سورۃ التوبہ: ۱۰۸۔

ہوئے افراد فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔ جن کے نزدیک اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات فرسودہ اور دقیانوسیت پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے مطابق:

> Ever since the western type of education has been introduced in Muslim lands... a development which in most cases followed the dominance of European colonial powers... it has generally been resented as a potent for the destruction of Islamic socio-cultural identity. (1)

سرکاری تعلیمی ادارے بھی تعلیم و تربیت سے قطع نظر مجرد حصولِ علم پر زور دے رہے ہیں۔ چنانچہ طالب علموں کا مقصدِ زندگی زیادہ سے زیادہ نمبر لینا یا ڈگری کا حصول بن گیا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات کی بناء پر استاد اور شاگرد کے مابین احترام و تقدس کا تعلق ناپید ہو رہا ہے۔ لہٰذا استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ خود اپنی نگاہ میں معزز و محترم ہو۔ اپنے منصب و پیشے کو قابلِ تکریم سمجھتا ہو۔ قول و فعل میں ہم آہنگی رکھتا ہو۔ تاکہ اس کی سیرت و کردار طالب علم کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

ہمارے نصابِ تعلیم میں مغربی تہذیب کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اکثر نجی تعلیمی اداروں میں مغربی اداروں کی تیار کردہ کتابیں نصاب میں شامل ہیں حالانکہ ضروری ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں ایسا نصابِ تعلیم رائج ہو جو اسلامی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتا ہو۔ بقول پروفیسر محمد سلیم: "درسی کتب کا مجموعہ تہذیبی پس منظر اسلامی ہو۔ صرف لسانیات و ادب سے ہی نہیں ہر کتاب سے، حتیٰ کہ ریاضی کی کتاب سے بھی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے کہ عبارتی سوالات میں کس طرح کے تصوّرات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دیگر کتابوں میں ناموں، مثالوں، قصوں اور کہانیوں اور علامتوں کے انتخاب سے مسلمانوں کی اپنی تہذیب و تمدّن کا اظہار ہو۔"(۲)

1- Dr. Zafar Ishaq Ansari, Teachers training (The Islamic persecution) institute of policy studies, and international institute of Islamic thought, 1996, p:7.

۲- پروفیسر محمد سلیم، **اسلامی ریاست میں نظام تعلیم**، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۶۔

قوموں کا رسم الخط اور تحریر ان کے مخصوص مزاج اور ذہنیتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلامی معاشروں میں رسم الخط اور فنّ خطاطی کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ نے جنگِ بدر کے ان اسیر ان سے جو فدیہ نہیں ادا کر سکتے تھے ان کو اس شرط پر رہا کیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں۔[1] صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنّ خطاطی بھی سکھاتے تھے۔[2]

پاکستان میں اردو اور اسلامیات کے سوا باقی تمام مضامین میں ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی زبان ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم نہ اردو میں ماہر ہوتے ہیں اور نہ ہی انگریزی تحریر پر عبور حاصل کر پاتے ہیں۔

خوش خطی جو مدارس کی تعلیم کا لازمی جزو تھا اب مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ خوبصورت تحریر، خوبصورت شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ خطاطی سے سمجھداری، خود اعتمادی، قوتِ ارادی اور تعلیمی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دینِ اسلام فن تحریر میں نفاست اور خوبصورتی پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ادبیات میں تحریر و کتابت میں نفاست اور صفائی کے اصول بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈال کر خشک کر لو،[3] حرف "س" کے شوشے برابر دیا کرو اور اس کو شوشوں کے بغیر نہ لکھا کرو۔[4] لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہئے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے۔ کیونکہ اس سے لکھنے والے کی زیادہ آسانی سے یاددہانی ہو جاتی ہے۔[5]

۱۔ محمد بن سعد بن منیع الزہری (م ۲۳۰ھ)، **الطبقات الکبری**، تحقیق محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء، ج ۲، ص ۱۶۔

۲۔ ابن عبد البر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی (م ۴۶۳ھ)، **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**، مکتبہ دار الباز مکہ المکرمہ، ج ۲، ص ۱۸۳؛ ابن الاثیر، (م ۶۳۰ھ) محمد بن محمد عبد الکریم، **اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ**، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ج ۳، ص ۱۰۴۔

۳۔ عبد الحیٔ الکتانی، **نظام الحکومۃ النبویۃ المسمی بالتراتیب الاداریۃ**، دار احیاء التراث العربی، ج ۱، ص ۱۲۹۔

۴۔ ایضاً، ۱۲۵۔

۵۔ ایضاً، ج ۱، ص ۱۲۵؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں اگرچہ اوپر کی تینوں باتیں مجھے صحیح حدیثوں میں نہیں ملیں لیکن یہ ناممکن یا غیر معقول چیزیں نہیں ہیں۔ (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی، ص ۲۵۲)

عام بول چال میں انگریزی زبان کا بے تحاشا استعمال پاکستانی قوم کا نہ صرف وطیرہ بن چکا ہے بلکہ اسے تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بول چال کے علاوہ رفتہ رفتہ تحریروں میں بھی انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال لمحہ فکریہ ہے۔ اردو مضامین ناول اور کہانیوں میں انگریزی الفاظ کا بکثرت استعمال قوم کی ذہنی غلامی کی عکاسی کرتا ہے۔ دودو زبانوں میں لکھی جانے والی تحریر لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کی شخصیتوں کو متلون مزاج اور ملمع ساز بنادیتی ہے۔ مہذب اور شائستہ انسان کبھی متلوّن مزاج اور ملمع ساز نہیں ہوتا۔ لہٰذا اردو رسم الخط، فن تحریر اور خوش خطی کو ترویج دینے کی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔

سماجی روابط اور مغرب کا تصور انفرادیت:

مغرب کے تصورِ انفرادیت (Individualism) نے معاشروں کی شکست وریخت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس کے مطابق فرد کو اجتماع پر زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔[1]

مغرب کے تصور انفرادیت کے برعکس اسلام اجتماعیت پر زور دیتا ہے۔ علاّمہ ابن مسکویہ رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اجتماعیت انسانیت کی فطرت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "تہذیب الاخلاق" میں لکھتے ہیں "انسان طبعًا انسانیتِ عامہ کی بہتری چاہتا ہے۔ کسی ایک انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ تنہا انسانی تمدّن اور تہذیب کے تمام مطالبات کو پورا کرے۔ اس لئے انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ کثیر تعداد میں بیک وقت اپنی مشترکہ بہتری کے لیے جمع ہو جائیں اور باہمی تعاون سے انسانی ترقی کے لیے کام کریں۔"[2]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اجتماعی نظم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہر فرد انسانی اپنی تخلیق کی رو سے تنہا نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اجتماعی نظام بنانے پر مجبور ہے۔"[3] اسی لیے دینِ اسلام نے ہر ان دوانسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمّہ داری رکھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے اس زرّیں

1- David Cooper, The death of the family, Penguin Harmonds work, 1972, p: 342.

۲- ابو علی احمد بن محمد ابن مسکویہ، (م ۴۲۱ھ)، **تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق**، تحقیق ابن الخطیب، مکتبہ الثقافہ الدینیہ، ج ۱، ص ۲۳-۲۲۔

۳- ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، (م ۵۰۵ھ) **احیاء علوم الدین**، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، ج ۳، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

اصول سے آج کل کی مہذّب سوسائٹیاں عاری ہیں۔ ان میں بسنے والے لوگ عموماً ایک دوسرے سے لاتعلق اپنی اپنی زندگیوں میں مگن رہتے ہیں۔ دینِ اسلام کی تعلیم اس کے برعکس ہے۔ وہ مستقل ہمسائے کے ساتھ حسنِ سلوک پر زور دینے کے ساتھ ساتھ مختصر وقت کے ساتھی کے ساتھ بھی شائستہ سلوک کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾[1] (اور اللہ نے ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ، پہلو کے ساتھی اور مسافر کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے)۔

ہمسائیوں سے بہترین تعلقات اور روابط قائم کرنے کے لیے یہ ایک اصولی ہدایت ہے۔ اس کی مزید تائید نبی مکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے)۔[2]

مغرب کا تصورِ حریت اور جدت پسندی کے تہذیبی اثرات:

مغرب کے تصور حریت (Liberalism) جدت پسندی اور روشن خیالی کے تصورات نے اسلامی معاشروں پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ انہی تصورات نے تحریکِ آزادیِ نسواں کو جنم دیا، جو حقوق کے تحفظ کے نام پر اخلاقی قدروں کے ایک حصے کو ناقابل عمل سمجھتی ہے۔ جنسی مساوات (Gender Equality) کے نظریہ نے عورت کو ہر میدان میں مردوں سے مسابقت، برابری اور مردوں کے دائرہ کار ہی میں اپنی صلاحیتوں کا جوہر دکھانے کی ذہنیت پیدا کی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر عورت مرد کی طرح بن کر کچھ کرنے میں تو ناکام رہتی ہے، مگر اپنے مدارِ حیات سے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ نتیجۃً خاندانی نظام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ خاندان کے لیے انتظامی سربراہ کو قرآن نے قوام کا منصب عطا کیا ہے۔ جنسی مساوات کے نام پر یہ تصورِ قوامیت ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور اسقاطِ حمل جیسی برائیاں اسی تصورِ آزادی کی پیدا کردہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر خالد علوی: "مسلمان معاشرے مغرب کی نقالی میں اور مغرب کے دباؤ کی وجہ سے اپنی عورتوں کو آزادی پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس کا انجام معاشرتی اداروں کی تباہی اور اخلاقی فساد کے سوا کچھ اور نہیں ہو گا۔"[3] چنانچہ

۱۔ النساء، ۳۶۔

۲۔ الترمذی، سنن ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی حق الجوار، رقم الحدیث ۱۹۴۴۔

۳۔ ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۳۰۔

مغرب کے تصور حریت اور جدت پسندی نے ہمارے معاشرے کے تین اخلاقی آداب واطوار یعنی کھانے پینے، طرزِ لباس اور طرزِ گفتگو پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

کھانے پینے میں مغربی طور طریقے:

آج کل جدت پسندی کے نام پر کھانے پینے میں بھی نئے انداز اور طور طریقے اپنائے جارہے ہیں۔ جو نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں بلکہ طبّی لحاظ سے بھی ضرر رساں ہیں۔ مثلاً کھڑے ہو کر کھانا، چلتے پھرتے فاسٹ فوڈ کی کثرت وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کھانے کی کوئی چیز نیچے گر گئی ہے تو اسے جھاڑ کر صاف کر کے کھالینا چاہئے[1] جبکہ آج کل اسے بد تہذیبی خیال کیا جاتا ہے۔

کھانا کھانے کے سلسلہ میں تہذیب وشائستگی کی تربیت کے لیے حضرت رسول اکرم ﷺ کی واضح ہدایات مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کی زیرِ پرورش تھا۔ کھانا کھانے کے دوران میرا ہاتھ برتن میں چاروں طرف حرکت کر رہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (یاغلام سمّ اللہ وکل بیمینک وکل مما یلیک)[2] اس حدیثِ مبارکہ میں حضور ﷺ نے کھانے کے تین آداب بیان فرمائے ہیں۔ پہلا ادب یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، دوسرا ادب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ، تیسرا ادب یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔ ادھر ادھر ہاتھ نہ لے جاؤ۔ نبی اکرم ﷺ نے قران یعنی دو دو کھجوریں ایک ساتھ کھانے سے منع فرمایا ہے[3] کہ جو کھجوریں رکھی ہیں اس میں سب کا برابر حق ہے۔ دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔

اس حدیث کی شرح میں مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں: آج کل کی دعوتوں میں سیلف سروس کا رواج ہے کہ آدمی خود اٹھ کر جائے اور اپنا کھانا لائے اور کھانا کھائے۔ اب اسی کھانے میں تمام کھانے والوں کا مشترک حق ہے۔ اب اگر ایک شخص جا کر بہت سارا کھانا اپنے برتن میں ڈال کر لے آیا اور دوسرے اس کو دیکھتے رہ گئے تو یہ بھی

۱۔ ترمذی، السنن، کتاب الفتن، باب ما جاء اذا ذهب كسرى فلا كسرى بعده، رقم الحدیث ۲۱۴۲۔

۲۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الاطعمة، باب الاكل مما يليه، رقم الحدیث ۵۳۷۷۔

۳۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الاطعمة، باب القران فی التمر، رقم الحدیث ۵۴۴۶۔

اس اصول کے تحت ناجائز ہے اور اس قران میں داخل ہے جس سے حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔[1] پانی پینے کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ پانی بیٹھ کر پیا جائے اور تین سانس میں پیا جائے۔[2] چند ایک مرتبہ آپ ﷺ سے کھڑے ہو کر پانی پینا بھی ثابت ہے۔[3]

لباس کی آزادی اور جدت پسندی:

دنیا میں بسنے والی تمام اقوام اپنے ماحول اور روایات کے مطابق مخصوص وضع قطع کا لباس اختیار کرتی ہیں۔ جو ان قوموں کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لباس کے انسان کے اخلاق واعمال پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا لباس جو ستر پوشی کا کام دے وہ انسان میں حیا کا وصف پیدا کرتا ہے جبکہ نیم عریاں اور نیم برہنہ لباس سے بے حیائی اور بہیمانہ صفات پیدا ہوتی ہیں۔

برصغیر پر طویل عرصہ تک انگریز سامراج کے تسلّط کے باعث مسلمانوں نے لباس و پوشاک میں مغربی طور طریقے اختیار کر لئے۔ دیکھا گیا ہے کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں میں بھی انتہائی چست، باریک اور نیم عریاں لباس کا فیشن ہے۔ نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات کی نمائش کے لیے ماڈلنگ شوز منعقد کیے جاتے ہیں اور ٹی وی چینلز ان پروگراموں کو دکھاتے ہیں۔ ٹی وی ڈراموں اور دیگر کئی پروگراموں میں عورتیں جینز شرٹ میں ملبوس مغربی تہذیب کی نقالی کرتی نظر آتی ہیں۔ نیم عریاں یا مغربی طرز کے لباس کا کچھ عرصہ قبل تک اونچے طبقوں کی عورتوں میں یا شوبز سے وابستہ عورتوں میں رواج تھا۔ مگر اب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے گھروں کی لڑکیاں بھی ایسا لباس بغیر جھجک کے زیب تن کرتی ہیں۔ مغرب سے متاثر لوگ اسلامی لباس کی شرعی حدود و قیود کو ضیق اور تنگی کہہ کر حدیث "الدّین یسر"[4] (یعنی دین آسان ہے) سے ردّ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے لباس کی آسانی تو ثابت ہوتی ہے لیکن آزادی اور بے قیدی نہیں۔ یہ لوگ پروپیگنڈہ بھی کرتے ہیں کہ آدمی اگر اپنی مرضی

۱۔ **اسلامی زندگی کے سنہری آداب**، ص ۵۰

۲۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الاشربة، باب کراهیة التنفس فی نفس الاناء، رقم الحدیث ۳۷۸۲۔

۳۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الحج، باب ما جاء فی زمزم، رقم الحدیث ۱۵۶۹، **سنن نسائی**، کتاب المناسک الحج، باب الشرب من زمزم قائما، رقم الحدیث ۲۹۱۶، **مسند احمد**، رقم الحدیث ۲۱۷۴، **صحیح مسلم**، کتاب الاشربة، باب کراهیة الشرب قائما، رقم الحدیث ۳۷۷۶۔

۴۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الایمان، باب الدین یسر، رقم الحدیث ۳۹۔

اور ماحول کے مطابق کوئی لباس اختیار کرلے تو اس کے بارے میں شریعت کو بیچ میں لانا اور شریعت کے احکام سنانا تنگ نظری ہے۔ حالانکہ دنیا کے تمام مذاہب نے برہنگی کو قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ دین اسلام نے ستر پوشی کو فرض قرار دیا ہے کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ (کبھی برہنہ نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں۔ جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو)۔[1] اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ درس دیا: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ﴾[2] (اے آدم کے بیٹو! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور زینت ہے اور پرہیز گاری کا یہ لباس بہتر ہے)۔

حریت اظہارِ رائے:

تہذیب وشائستگی کے معیار کو پرکھنے کے لیے انسان کی زبان ایک ایسا آلہ ہے جو مہذّب وغیر مہذّب اور شائستہ وناشائستہ لوگوں کے درمیان فرق وامتیاز قائم کرتا ہے۔ مغرب کے تصوّرِ حریت اظہار رائے نے گفتگو میں تہذیب وشائستگی کے معیار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ غیر مہذّب اور ناشائستہ گفتگو کی ترویج میں ٹی وی چینلز نہایت منفی کردار ادا کر رہے ہیں۔

اکثر ٹاک شوز میں ایک دوسرے کے خلاف تند وتیز اور نازیبا الفاظ کہے جاتے ہیں جو سنجیدہ اور غیر مہذّب گفتگو کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ان ٹاک شوز میں تمام اشخاص ایک ہی وقت میں دوسرے کی بات سننے کی بجائے اپنے مؤقف کو تیز انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹاک شوز دوسرے کو بولنے کا موقع نہ دینا جیسے منفی طرزِ عمل اور طرزِ گفتگو کو متعارف کروا رہے ہیں۔

دینِ اسلام ایک دوسرے پر لعن طعن اور دشنام طرازی کرنے کی بجائے شائستگی ونرمی اور اچھی بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾[3] (اور تم لوگوں سے اچھی بات کہو) نیز ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذیّ)۔[4]

۱۔ ترمذی، **السنن**، ابواب الادب، باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع، رقم الحدیث ۲۸۰۰۔

۲۔ سورۃ الاعراف: ۲۶۔

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۸۳۔

۴۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الادب، باب ما ینهي من السباب واللعن، رقم الحدیث ۶۰۴۴۔

ٹی وی چینلز کے کئی پروگرام مزاحیہ گفتگو، ہنسی مذاق اور لایعنی گفتگو پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ لایعنی گفتگو سے بچا جائے جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه)[1] بعض اوقات انسان دوسروں کو ہنسانے اور دل لگی کے لیے مزاحیہ گفتگو کرتا ہے۔ لیکن وہی گفتگو اس کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (ویل للذی یحدث بالحدیث لیضحک به فیکذب فویل له فویل له)[2] (ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو ہنسانے کی غرض سے جھوٹی بات کہتا ہے۔ پس اس کے لیے ہلاکت ہے۔ پس اس کے لیے ہلاکت ہے)۔ لایعنی ہنسی مذاق والی گفتگو سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے منافی ہے، گفتگو کا یہ طرز انسانوں کے اندر سے سنجیدگی، بردباری اور وقار جیسے اعلیٰ اوصاف کو ختم کرتا جا رہا ہے۔ جبکہ دینِ اسلام سنجیدگی، تدبر اور میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سرجس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "سنجیدگی، تدبّر اور میانہ روی نبوّت کا چوبیسواں حصہ ہے۔"[3] حدیث میں مذکور الفاظ "السمت الحسن" سے مراد اچھا روّیہ، بہتر طور طریقہ اور سنجیدگی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: (ان فیک خصلتین یحبهما الله الحلم والأناة)[4] (بے شک تمہارے اندر دو عادتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ ایک حلم و عقل اور دوسری وقار و تدبّر)۔

عام بول چال میں انگریزی زبان کا بے تحاشا استعمال بھی لمحہء فکریہ بن چکا ہے۔ بعض لوگ ہر جملے میں دو تین الفاظ انگریزی کے بول جاتے ہیں بسا اوقات آدھا فقرہ اردو میں اور آدھا انگریزی میں بولتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کی شیرینی، ادبیت اور لطافت ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ ایک وقت میں دو دو زبانوں میں گفتگو کرنے سے انسان کی شخصیت بھی متلوّن مزاج ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زبان کا انسان کی شخصیت اور کردار پر گہرا اثر

۱۔ ترمذی، **السنن**، کتاب الزهد، باب ما جاء فی تکلم بالکلمة لیضحک الناس، رقم الحدیث ۲۳۱۰۔

۲۔ ترمذی، **السنن**، کتاب الزهد، باب ما جاء فی تکلم بالکلمة لیضحک الناس، رقم الحدیث ۲۳۱۰۔

۳۔ ترمذی، **السنن**، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی التانی والعجلة، رقم الحدیث ۲۰۱۰۔

۴۔ ایضاً، رقم الحدیث ۲۰۱۱۔

ہوتا ہے۔ زبان میں ایک نیا بگاڑ موبائل فون میں SMS کے ذریعے بھی آرہا ہے۔ جس میں انگریزی رسم الخط میں اردو کے الفاظ تحریر کیے جاتے ہیں۔ بقول خالد جامعی: "کیا موبائل فون صرف ایک آلہ ہے یا ایک تہذیب، تمدّن، ثقافت، تاریخ، زبان، بیانِ اسلوب اور نیا طرزِ زندگی بھی ہے۔ SMS کے ذریعے ایک نئی زبان، نئی تہذیب، غلط رویے، غلیظ معاشرت، عامیانہ طرزِ زندگی، بے ہودہ اشارے کنائے اور جملے ایجاد کیے گئے ہیں۔ زبان وبیان کی نزاکت ولطافت کو ختم کر دیا ہے۔ اور سہولت کے نام پر زبان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ تاکہ کم سے کم وقت میں، کم سے کم الفاظ میں یاوہ گوئی کی جاسکے۔"(۱)

زبان کی تہذیب وشائستگی سے متعلق بھی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تھا تو گن سکتا تھا۔(۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل وترسیل پائی جاتی تھی۔ یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا۔ اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے۔(۳) ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (اللہ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑ تا موڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے)۔(۴)

الغرض زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور برائی کا آلہ بھی۔ اس کے صحیح استعمال سے دین ودنیا دونوں سدھر جاتے ہیں اور برے استعمال سے دنیا کے معاملات بھی خراب ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی انجام برا ہوگا۔

معمولاتِ زندگی میں تہذیب وشائستگی کی تربیت:

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے امّت مسلمہ کی تہذیب وتربیت کے لیے معمولاتِ زندگی میں ایسے آداب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے جن کے اپنانے سے انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی منظم ومنضبط ہو جاتی ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو جامعی کا مضمون "موبائل فون، مضرات ونقصانات"، ماہنامہ البرہان، جنوری ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۔

۲۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب العلم، باب تکریر الحدیث، رقم الحدیث ۳۶۵۴-۳۶۵۵

۳۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب الادب، باب الھدی فی الکلام، رقم الحدیث ۴۸۳۸

۴۔ ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ما جاء فی المتشدّق فی الکلام، رقم الحدیث ۵۰۰۵

تہذیب وشائستگی کے امور میں سے سب سے اہم چیز طہارت وصفائی ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (الطهور شطر الایمان)[1] (صفائی نصف ایمان ہے)۔ بحیثیت مسلمان ہر فرد کو اپنے کپڑے، گھر، گلیوں اور محلّوں کو صاف رکھنا، نیز جہازوں، ریل گاڑیوں اور پبلک مقامات پر موجود غسل خانوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا اور صاف کرنا لازم ہے۔ اس مقالہ میں تمام آداب کو بیان کرنا دشوار ہے۔ نمونے کے طور پر چند اہم آداب درج ذیل ہیں۔

انسان کی بعض حرکات وسکنات تہذیب وشائستگی کے خلاف ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً جمائی لینا، اسی لیے آپ ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرلے کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے"۔[2]

بعض لوگ چھینک کر الحمدللہ کہنے کی بجائے (Excuse me) کہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ نے چھینک آنے پر الحمدللہ اور جواب میں یرحمک اللہ کہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ڈکار کے متعلق سنن ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ڈکار لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو۔ کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے۔[3] اس حدیث سے ضمناً ڈکار کی کراہیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

مجلس میں تہذیب ووقار کی شکل پیدا کرنے کے لیے فرمایا کہ کوئی شخص مجمع کو چیر کر آگے بیٹھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جائے۔ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طرح بیٹھتے تھے۔[4]

راستے کے آداب سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ایاکم والجلوس فی الطرقات، صحابہ نے عرض کیا ہماری مجبوری ہے کہ ہم محفل جماتے ہیں اور آپس میں گپ شپ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اتنی

۱۔ شعب الایمان، باب الصلاۃ، رقم الحدیث ۲۵۴۸

۲۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب الادب، باب ما جاء فی التثاؤب، رقم الحدیث ۵۰۲۶۔

۳۔ **سنن ابن ماجة**، کتاب الاطعمة، باب الاقتصاد فی الاکل وکراهة الشبع، رقم الحدیث ۳۳۵۰۔

۴۔ البخاری، الادب المفرد بالتعلیقات، مکتبة المعارف للنشر والتوزیع، ۱۴۱۹ھ، باب یجلس الرجل حیث انتهی، رقم الحدیث ۱۱۴۱۔

مجبوری ہے تو راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا نظروں کو جھکا کر رکھو، تکلیف دہ چیز کو دور کرو، سلام کا جواب دو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرو)۔[1] یہ حدیث ٹریفک کے نظام میں نظم وضبط کی پابندی اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی معمولی چیز بن گئی ہے حدیث کے الفاظ میں "کف الأذی" یعنی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ایک جامع کلمہ ہے۔ چنانچہ گاڑی چلاتے وقت غلط انداز میں اوور ٹیکنگ کرکے دوسرے کو تکلیف پہنچانا، ٹریفک سگنلز کی خلاف ورزی کرنا، خوامخواہ ہارن بجاتے رہنا، جارحانہ انداز میں گاڑی چلانا، گاڑی کو غلط جگہ پارک کرنا، ناجائز تجاوزات قائم کرنا یہ سب چیزیں کف الأذی کے تحت آتی ہیں۔

دینِ اسلام اجتماع کے مواقع پر نظم وضبط اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسے مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نظم وضبط اور سکون کی تلقین فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سے فارغ ہو کر ظہر اور عصر کی نماز اکٹھے ادا کی۔ غروبِ آفتاب کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اونٹ پر پیچھے بٹھالیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی۔ لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا لوگوں کو دستِ راست اور بخاری میں ہے کہ کوڑے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کرتے جاتے تھے کہ "آہستہ آہستہ" اور زبان مبارک سے ارشاد فرمارہے تھے: (السکینة یاایھاالناس السکینة یاایھاالناس)[2] جہاں بہت سے لوگوں کو باری باری کوئی کام انجام دینا ہو وہاں فطری طریقہ یہی ہے کہ آنے والوں کی ترتیب سے ایک قطار بنالی جائے۔ ایسے موقع پر لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا یا اس کے لیے دھینگا مشتی کرنا، اس سے دوسروں کی شدید حق تلفی ہوتی ہے جو بداخلاقی اور ناشائستگی ہونے کے علاوہ گناہ بھی ہے۔ آج غیر مسلم قومیں اس بات کا لحاظ رکھتی ہیں بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا ہے کہ جہاں دو آدمی جمع ہوں گے فوراً آگے پیچھے ہو کر قطار بنالیں گے۔

۱۔ ابوداؤد، السنن، کتاب الادب، باب فی الجلوس فی الطرقات، رقم الحدیث ۴۸۱۵۔

۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الحج، باب امر النبی ﷺ بالسّکینة عند الافاضة و اشارته الیه بالسّوط، رقم الحدیث ۱۶۷۱۔

دینِ اسلام تو جنگوں میں بھی تہذیب وشائستگی اور صف بندی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان مجاہدین کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾[1] (جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسی طور) پر پرے جما کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں وہ بیشک محبوب مددگار ہیں۔)

بہت سے اسلامی ممالک پر ایسا طبقہ برسرِ اقتدار ہے جو ایک طرف اسلامی طریقوں سے ناآشنا ہے اور دوسری طرف مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔ حالانکہ امت مسلمہ کے حکمرانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی خودداری، حیثیت اور غیرت کو پیشِ نظر رکھ کر مغرب کو نمونہ تقلید بنانے کی بجائے اس اسوۂ حسنہ کی طرف لوٹیں جس کی پیروی میں ان کی اخروی اور دنیوی فوز وفلاح مضمر ہے۔ اسلامی تہذیبی اقدار کی ترویج واشاعت کے لیے حکمرانوں کو دو اہم محاذوں پر توجہ دینا ہوگی۔ پہلا محاذ نظامِ تعلیم ہے، قرآن وسنّت کی روح کے مطابق ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جائے جس میں مقاصدِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم تینوں اسلامی اقدار وروایات کی عکاسی کرتے ہوں۔

دوسرا اہم معاملہ ذرائع ابلاغ کی تطہیر واصلاح ہے۔ اسلامی ممالک کے ٹی وی چینلز پر دکھائی جانے والی فلمیں، ڈرامے اور اشتہارات مغربی ثقافت کو ترویج دے رہے ہوتے ہیں۔ حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ ٹی وی اور کیبل پر ان بے ہودہ اور لہوولعب کی طرف مائل کرنے والے پروگراموں کی بجائے مثبت اور مقصد سے بھرپور مہذّب پروگراموں کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو عملی زندگی میں تہذیب وشائستگی اور نظم وضبط کی پابندی قائم رکھنے کی تربیت کریں۔ تاکہ وہ ایک مہذب اور منظم فلاحی معاشرہ قائم کر سکیں۔ اگر حکمران خود مغربی تہذیب کے پیروکار ہوں اور اسلامی تعلیمات سے منحرف ہوں تو اس صورت میں معاشرہ کے صالح افراد اور اسلامی جماعتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تبلیغ وتلقین اور نصیحت کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے افرادِ معاشرہ کو نام نہاد تہذیب وشائستگی کے تصوّرات کے گرداب سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں۔

1- سورۃ الصف: ۴۔

قحط سالی اور دیگر قدرتی آفات: تدارک اور عملی اقدامات

(اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں)

Famines and Natural Disasters: Termination and Practical Steps in the Light of Sīrat Al-Nabi (SAW)

عبد الغفار*

Pakistan is under the cloud of famines and natural disasters. Specially, most of the regions of Baluchistan and Sindh are directly affected. Land is barren due to shortage of water. Load shedding has shattered daily routine of life. Lack of food and environmental pollution has given birth to numerous diseases. There is a dire need to discover real causes and remedial measures. When the Holy Prophet (SAW) laid down the foundation stone of Madīna as an Islamic State, the problems of lack of food, over population and issues of immigrants were common, which were settled with strong planning. As a result, in a few years, Madīna Munawwrah emerged on the map of the world as a perfect welfare state. In this article, different suggestions are given for making Pakistan such a safe and developed country by keeping in mind those practical implications and planning adopted by the mercy for mankind, Muhammad (SAW).

اقوام متحدہ کے ادارۂ برائے خوراک و زراعت (FAO) کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ موسمیاتی تبدیلیوں کے مضر اثرت کے باعث سب سے زیادہ وسائل خوراک کی سلامتی شدید زد میں ہے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی خبردار کیا گیا ہے کہ دنیا کی آبادی ۲۰۵۰ء تک ۹.۶ بلین ہو جائے گی، جس کیلئے مطلوبہ غذائی وسائل کو یقینی بنانے کیلئے موسمیاتی تبدیلیوں کے مہلک اثرات پر قابو پانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جسے نظر انداز کرنے والے ممالک بری طرح غذائی قلت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ روز بروز بڑھتی ہوئی آلودگی میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ بڑے چھوٹے شہر تو درکنار دنیا بھر میں سالانہ ۱.۸ بلین ڈالرز کی مہلک زہروں کے فصلوں پر اندھا دھند

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور۔

سپرے سے دیہی علاقوں کی فضا بھی بری طرح آلودہ ہو رہی ہے۔ مہلک زہروں کے بڑھتے ہوئے سپرے اور کیمیاوی کھادوں کے اثرات ماحولیاتی آلودگی کو بڑھاتے ہوئے سانس کی بیماریوں میں دمہ، ٹی بی، سینے میں درد، نزلہ، زکام، بلڈ پریشر، ہیپاٹائٹس، جلدی امراض، امراض چشم، الرجی اور کینسر جیسے مہلک امراض میں انسان ہی کو مبتلا کرنے کا سبب نہیں بن رہے بلکہ حیوانوں میں بھی کئی خطرناک امراض کو جنم دے رہے ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر درختوں کی اندھا دھند کٹائی اور نئی شجر کاری میں توازن بہت بری طرح بگڑ رہا ہے۔ جنگلات کے حوالے سے مطلوبہ تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے درخت اگانا ضروری ہے، مگر ہمارے ہاں یہ تناسب بہت کم ہو رہا ہے۔

ارضِ پاکستان پر اس وقت بھوک اور پیاس کے بادل منڈلا رہے ہیں، ملک کے کئی حصے خشک سالی کی زد میں ہیں۔ خاص طور پر صوبہ سندھ اور بلوچستان کے اکثر حصے قحط کی لپیٹ میں ہیں۔ کئی ہزار ایکڑ زرعی رقبہ بنجر ہو چکا ہے۔ گھاس اور پانی کی کمی سے مویشیوں کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ صنعت اور زراعت پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ اس کے اسباب اور ان کے حل کیلئے عملی اقدامات کیا ہیں؟ اس پر بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ماضی کی طرح اس عذابِ الٰہی کی توجیہ اور اس کے اسباب و عوامل اور علاج کی تدبیریں بھی خالصتاً مادّی اور ظاہری رخ کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہیں اور اس طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے کہ اس ساری صورتحال کے پیچھے قدرت کا ہاتھ بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔

اصل اسباب اور وجوہات کی طرف توجہ دینا اور ان کو حل کرنا شاید کوئی اپنی ذمہ داری ہی تصور نہیں کرتا۔ حسبِ روایت ہر نئی حکومت سابقہ حکمرانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر بزعم خود اپنا فرض پورا کر لیتی ہے اور اس حوالے سے ٹی وی اور ریڈیو پر چند مذاکرے کروا کر، اخبارات میں چند خبریں لگوا کر اور قومی خزانے سے قحط زدگان کی اِمداد کم اور تشہیر زیادہ کر کے حکومتیں گویا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیتی ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے بہرحال ہمارا فرض ہے کہ ان مشکلات کے سدباب اور عملی اقدامات کے لئے ہم اپنے دین سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس غرض سے مقالہ ہذا میں قحط سالی اور قدرتی آفات کے تدارک کیلئے عملی اقدامات اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں جاننے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ تاہم اس کے کچھ باطنی اسباب ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں۔ جن میں سے بہت ہی اہم، برے اعمال اور ربّ کی نافرمانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں

فرمایا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾[1] (خشکی اور تری میں لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے فساد پھیل گیا تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے بعض برے اعمال کی سزا انہیں دنیا میں چکھادے، شاید کہ لوگ برے اعمال سے باز آجائیں)۔

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾[2] (اور تم پر جو مصیبت آتی ہے تو تمہارے ہاتھوں نے جو کیا اس کی سزا میں اور وہ (اللہ) بہت (سے قصور) معاف کر دیتا ہے)۔

﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾[3] (اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن واطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا۔ تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے)۔

مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ دنیا میں خشک سالی، قحط، سیلاب، زلزلے، طوفان، اندرونی و بیرونی جھگڑے اور فسادات یا معاشی و اقتصادی اور اخلاقی بدحالی کی کوئی بھی شکل ہو، یہ سب انسان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہے اور یہ ساری مصیبتیں اور آزمائشیں انسان پر اس لئے آتی ہیں کہ انسان ان سے عبرت حاصل کرے اور انہیں اپنی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہوئے اپنے حالات میں مثبت تبدیلی پیدا کرے۔

آج اگر ہم اپنے حالات پر نظر ڈالیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لیں تو حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی برائی نہیں جسے ہم نے من حیث القوم سینے سے نہ لگایا ہو۔

آج وطن عزیز قحط سالی اور قدرتی آفات کی لپیٹ میں ہے۔ کئی زمینیں اور بستیاں ویران و غیر آباد ہو چکی ہیں۔ بعض علاقوں میں انسان اور جانور پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہے ہیں قرآن ہمیں یہ بات یاد دلاتا رہتا

۱۔ سورۃ الروم، ۴۱۔

۲۔ سورۃ الشوریٰ، ۳۰۔

۳۔ سورۃ النحل، ۱۱۲۔

اس اصول کے تحت ناجائز ہے اور اس قران میں داخل ہے جس سے حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔[1] پانی پینے کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ پانی بیٹھ کر پیا جائے اور تین سانس میں پیا جائے۔[2] چند ایک مرتبہ آپ ﷺ سے کھڑے ہو کر پانی پینا بھی ثابت ہے۔[3]

لباس کی آزادی اور جدت پسندی:

دنیا میں بسنے والی تمام اقوام اپنے ماحول اور روایات کے مطابق مخصوص وضع قطع کا لباس اختیار کرتی ہیں۔ جو ان قوموں کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لباس کے انسان کے اخلاق واعمال پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا لباس جو ستر پوشی کا کام دے وہ انسان میں حیا کا وصف پیدا کرتا ہے جبکہ نیم عریاں اور نیم برہنہ لباس سے بے حیائی اور بہیمانہ صفات پیدا ہوتی ہیں۔

برصغیر پر طویل عرصہ تک انگریز سامراج کے تسلّط کے باعث مسلمانوں نے لباس و پوشاک میں مغربی طور طریقے اختیار کر لئے۔ دیکھا گیا ہے کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں میں بھی انتہائی چست، باریک اور نیم عریاں لباس کا فیشن ہے۔ نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات کی نمائش کے لیے ماڈلنگ شوز منعقد کیے جاتے ہیں اور ٹی وی چینلز ان پروگراموں کو دکھاتے ہیں۔ ٹی وی ڈراموں اور دیگر کئی پروگراموں میں عورتیں جینز شرٹ میں ملبوس مغربی تہذیب کی نقالی کرتی نظر آتی ہیں۔ نیم عریاں یا مغربی طرز کے لباس کا کچھ عرصہ قبل تک اونچے طبقوں کی عورتوں میں یا شوبز سے وابستہ عورتوں میں رواج تھا۔ مگر اب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے گھروں کی لڑکیاں بھی ایسا لباس بغیر جھجک کے زیب تن کرتی ہیں۔ مغرب سے متاثر لوگ اسلامی لباس کی شرعی حدود و قیود کو ضیق اور تنگی کہہ کر حدیث "الدّین یسر"[4] (یعنی دین آسان ہے) سے ردّ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے لباس کی آسانی تو ثابت ہوتی ہے لیکن آزادی اور بے قیدی نہیں۔ یہ لوگ پروپیگنڈہ بھی کرتے ہیں کہ آدمی اگر اپنی مرضی

۱۔ **اسلامی زندگی کے سنہری آداب**، ص ۵۰

۲۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الاشربة، باب کراهیة التنفس فی نفس الاناء، رقم الحدیث ۳۷۸۲۔

۳۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الحج، باب ما جاء فی زمزم، رقم الحدیث ۱۵۶۹، **سنن نسائی**، کتاب المناسک الحج، باب الشرب من زمزم قائما، رقم الحدیث ۲۹۱۶، **مسند احمد**، رقم الحدیث ۲۱۷۴، **صحیح مسلم**، کتاب الاشربة، باب کراهیة الشرب قائما، رقم الحدیث ۳۷۷۶۔

۴۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الایمان، باب الدین یسر، رقم الحدیث ۳۹۔

اور ماحول کے مطابق کوئی لباس اختیار کرلے تو اس کے بارے میں شریعت کو بیچ میں لانا اور شریعت کے احکام سنانا تنگ نظری ہے۔ حالانکہ دنیا کے تمام مذاہب نے برہنگی کو قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ دین اسلام نے ستر پوشی کو فرض قرار دیا ہے کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ (کبھی برہنہ نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں۔ جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو)۔[1] اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ درس دیا: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ﴾[2] (اے آدم کے بیٹو! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور زینت ہے اور پرہیز گاری کا یہ لباس بہتر ہے)۔

حریت اظہارِ رائے:

تہذیب وشائستگی کے معیار کو پرکھنے کے لیے انسان کی زبان ایک ایسا آلہ ہے جو مہذّب وغیر مہذّب اور شائستہ وناشائستہ لوگوں کے درمیان فرق وامتیاز قائم کرتا ہے۔ مغرب کے تصوّرِ حریت اظہار رائے نے گفتگو میں تہذیب وشائستگی کے معیار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ غیر مہذّب اور ناشائستہ گفتگو کی ترویج میں ٹی وی چینلز نہایت منفی کردار ادا کر رہے ہیں۔

اکثر ٹاک شوز میں ایک دوسرے کے خلاف تند وتیز اور نازیبا الفاظ کہے جاتے ہیں جو سنجیدہ اور غیر مہذّب گفتگو کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ان ٹاک شوز میں تمام اشخاص ایک ہی وقت میں دوسرے کی بات سننے کی بجائے اپنے مؤقف کو تیز انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹاک شوز دوسرے کو بولنے کا موقع نہ دینا جیسے منفی طرزِ عمل اور طرزِ گفتگو کو متعارف کروا رہے ہیں۔

دینِ اسلام ایک دوسرے پر لعن طعن اور دشنام طرازی کرنے کی بجائے شائستگی ونرمی اور اچھی بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾[3] (اور تم لوگوں سے اچھی بات کہو) نیز ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذیّ)۔[4]

۱۔ ترمذی، **السنن**، ابواب الادب، باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع، رقم الحدیث ۲۸۰۰۔

۲۔ سورۃ الاعراف: ۲۶۔

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۸۳۔

۴۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الادب، باب ما ینهي من السباب واللعن، رقم الحدیث ۶۰۴۴۔

ٹی وی چینلز کے کئی پروگرام مزاحیہ گفتگو، ہنسی مذاق اور لایعنی گفتگو پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ لایعنی گفتگو سے بچا جائے جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه)[1] بعض اوقات انسان دوسروں کو ہنسانے اور دل لگی کے لیے مزاحیہ گفتگو کرتا ہے۔ لیکن وہی گفتگو اس کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (ویل للذی یحدث بالحدیث لیضحک به فیکذب فویل له فویل له)[2] (ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو ہنسانے کی غرض سے جھوٹی بات کہتا ہے۔ پس اس کے لیے ہلاکت ہے۔ پس اس کے لیے ہلاکت ہے)۔ لایعنی ہنسی مذاق والی گفتگو سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے منافی ہے، گفتگو کا یہ طرز انسانوں کے اندر سے سنجیدگی، بردباری اور وقار جیسے اعلیٰ اوصاف کو ختم کرتا جا رہا ہے۔ جبکہ دینِ اسلام سنجیدگی، تدبر اور میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سرجس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "سنجیدگی، تدبّر اور میانہ روی نبوّت کا چوبیسواں حصہ ہے۔"[3] حدیث میں مذکور الفاظ "السمت الحسن" سے مراد اچھا روّیہ، بہتر طور طریقہ اور سنجیدگی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: (ان فیک خصلتین یحبهما الله الحلم والأناة)[4] (بے شک تمہارے اندر دو عادتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ ایک حلم و عقل اور دوسری وقار و تدبّر)۔

عام بول چال میں انگریزی زبان کا بے تحاشا استعمال بھی لمحہء فکریہ بن چکا ہے۔ بعض لوگ ہر جملے میں دو تین الفاظ انگریزی کے بول جاتے ہیں بسا اوقات آدھا فقرہ اردو میں اور آدھا انگریزی میں بولتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کی شیرینی، ادبیت اور لطافت ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ ایک وقت میں دو دو زبانوں میں گفتگو کرنے سے انسان کی شخصیت بھی متلوّن مزاج ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زبان کا انسان کی شخصیت اور کردار پر گہرا اثر

۱۔ ترمذی، **السنن**، کتاب الزهد، باب ما جاء فی تکلم بالکلمة لیضحک الناس، رقم الحدیث ۲۳۱۰۔

۲۔ ترمذی، **السنن**، کتاب الزهد، باب ما جاء فی تکلم بالکلمة لیضحک الناس، رقم الحدیث ۲۳۱۰۔

۳۔ ترمذی، **السنن**، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی التانی والعجلة، رقم الحدیث ۲۰۱۰۔

۴۔ ایضاً، رقم الحدیث ۲۰۱۱۔

ہوتا ہے۔ زبان میں ایک نیا بگاڑ موبائل فون میں SMS کے ذریعے بھی آرہا ہے۔ جس میں انگریزی رسم الخط میں اردو کے الفاظ تحریر کیے جاتے ہیں۔ بقول خالد جامعی: "کیا موبائل فون صرف ایک آلہ ہے یا ایک تہذیب، تمدّن، ثقافت، تاریخ، زبان، بیانِ اسلوب اور نیا طرزِ زندگی بھی ہے۔ SMS کے ذریعے ایک نئی زبان، نئی تہذیب، غلط رویے، غلیظ معاشرت، عامیانہ طرزِ زندگی، بے ہودہ اشارے کنائے اور جملے ایجاد کیے گئے ہیں۔ زبان وبیان کی نزاکت ولطافت کو ختم کر دیا ہے۔ اور سہولت کے نام پر زبان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ تاکہ کم سے کم وقت میں، کم سے کم الفاظ میں یاوہ گوئی کی جاسکے۔"(۱)

زبان کی تہذیب وشائستگی سے متعلق بھی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تھا تو گن سکتا تھا۔(۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل وترسیل پائی جاتی تھی۔ یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا۔ اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے۔(۳) ارشادِ نبوی ﷺ ہے: (اللہ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑ تا موڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے)۔(۴)

الغرض زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور برائی کا آلہ بھی۔ اس کے صحیح استعمال سے دین ودنیا دونوں سدھر جاتے ہیں اور برے استعمال سے دنیا کے معاملات بھی خراب ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی انجام برا ہوگا۔

معمولاتِ زندگی میں تہذیب وشائستگی کی تربیت:

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے امّت مسلمہ کی تہذیب وتربیت کے لیے معمولاتِ زندگی میں ایسے آداب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے جن کے اپنانے سے انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی منظم ومنضبط ہو جاتی ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو جامعی کا مضمون "موبائل فون، مضرات ونقصانات"، ماہنامہ البرہان، جنوری ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۔

۲۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب العلم، باب تکریر الحدیث، رقم الحدیث ۳۶۵۴-۳۶۵۵

۳۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب الادب، باب الھدی فی الکلام، رقم الحدیث ۴۸۳۸

۴۔ ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ما جاء فی المتشدّق فی الکلام، رقم الحدیث ۵۰۰۵

تہذیب وشائستگی کے امور میں سے سب سے اہم چیز طہارت وصفائی ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (الطهور شطر الایمان)[1] (صفائی نصف ایمان ہے)۔ بحیثیت مسلمان ہر فرد کو اپنے کپڑے، گھر، گلیوں اور محلّوں کو صاف رکھنا، نیز جہازوں، ریل گاڑیوں اور پبلک مقامات پر موجود غسل خانوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا اور صاف کرنا لازم ہے۔ اس مقالہ میں تمام آداب کو بیان کرنا دشوار ہے۔ نمونے کے طور پر چند اہم آداب درج ذیل ہیں۔

انسان کی بعض حرکات وسکنات تہذیب وشائستگی کے خلاف ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً جمائی لینا، اسی لیے آپ ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرلے کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے"۔[2]

بعض لوگ چھینک کر الحمدللہ کہنے کی بجائے (Excuse me) کہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ نے چھینک آنے پر الحمدللہ اور جواب میں یرحمک اللہ کہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ڈکار کے متعلق سنن ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ڈکار لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو۔ کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے۔[3] اس حدیث سے ضمناً ڈکار کی کراہیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

مجلس میں تہذیب ووقار کی شکل پیدا کرنے کے لیے فرمایا کہ کوئی شخص مجمع کو چیر کر آگے بیٹھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جائے۔ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طرح بیٹھتے تھے۔[4]

راستے کے آداب سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ایاکم والجلوس فی الطرقات، صحابہ نے عرض کیا ہماری مجبوری ہے کہ ہم محفل جماتے ہیں اور آپس میں گپ شپ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اتنی

۱۔ شعب الایمان، باب الصلاۃ، رقم الحدیث ۲۵۴۸

۲۔ ابوداؤد، **سنن ابی داؤد**، کتاب الادب، باب ما جاء فی التثاؤب، رقم الحدیث ۵۰۲۶۔

۳۔ **سنن ابن ماجة**، کتاب الاطعمة، باب الاقتصاد فی الاکل وکراهة الشبع، رقم الحدیث ۳۳۵۰۔

۴۔ البخاری، الادب المفرد بالتعلیقات، مکتبة المعارف للنشر والتوزیع، ۱۴۱۹ھ، باب یجلس الرجل حیث انتهی، رقم الحدیث ۱۱۴۱۔

مجبوری ہے تو راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا نظروں کو جھکا کر رکھو، تکلیف دہ چیز کو دور کرو، سلام کا جواب دو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرو)۔[1] یہ حدیث ٹریفک کے نظام میں نظم وضبط کی پابندی اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی معمولی چیز بن گئی ہے حدیث کے الفاظ میں "کف الأذی" یعنی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ایک جامع کلمہ ہے۔ چنانچہ گاڑی چلاتے وقت غلط انداز میں اوور ٹیکنگ کرکے دوسرے کو تکلیف پہنچانا، ٹریفک سگنلز کی خلاف ورزی کرنا، خوامخواہ ہارن بجاتے رہنا، جارحانہ انداز میں گاڑی چلانا، گاڑی کو غلط جگہ پارک کرنا، ناجائز تجاوزات قائم کرنا یہ سب چیزیں کف الأذی کے تحت آتی ہیں۔

دینِ اسلام اجتماع کے مواقع پر نظم وضبط اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسے مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نظم وضبط اور سکون کی تلقین فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سے فارغ ہو کر ظہر اور عصر کی نماز اکٹھے ادا کی۔ غروبِ آفتاب کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اونٹ پر پیچھے بٹھالیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی۔ لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا لوگوں کو دستِ راست اور بخاری میں ہے کہ کوڑے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کرتے جاتے تھے کہ "آہستہ آہستہ" اور زبان مبارک سے ارشاد فرمارہے تھے: (السکینة یاایھاالناس السکینة یاایھاالناس)[2] جہاں بہت سے لوگوں کو باری باری کوئی کام انجام دینا ہو وہاں فطری طریقہ یہی ہے کہ آنے والوں کی ترتیب سے ایک قطار بنالی جائے۔ ایسے موقع پر لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا یا اس کے لیے دھینگا مشتی کرنا، اس سے دوسروں کی شدید حق تلفی ہوتی ہے جو بداخلاقی اور ناشائستگی ہونے کے علاوہ گناہ بھی ہے۔ آج غیر مسلم قومیں اس بات کا لحاظ رکھتی ہیں بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا ہے کہ جہاں دو آدمی جمع ہوں گے فوراً آگے پیچھے ہو کر قطار بنالیں گے۔

۱۔ ابوداؤد، السنن، کتاب الادب، باب فی الجلوس فی الطرقات، رقم الحدیث ۴۸۱۵۔

۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الحج، باب امر النبی ﷺ بالسّکینة عند الافاضة و اشارته الیه بالسّوط، رقم الحدیث ۱۶۷۱۔

دینِ اسلام تو جنگوں میں بھی تہذیب وشائستگی اور صف بندی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان مجاہدین کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾[1] (جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسی طور) پر پرے جما کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں وہ بیشک محبوب مددگار ہیں۔)

بہت سے اسلامی ممالک پر ایسا طبقہ برسرِ اقتدار ہے جو ایک طرف اسلامی طریقوں سے ناآشنا ہے اور دوسری طرف مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔ حالانکہ امت مسلمہ کے حکمرانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی خودداری، حیثیت اور غیرت کو پیشِ نظر رکھ کر مغرب کو نمونہ تقلید بنانے کی بجائے اس اسوۂ حسنہ کی طرف لوٹیں جس کی پیروی میں ان کی اخروی اور دنیوی فوز وفلاح مضمر ہے۔ اسلامی تہذیبی اقدار کی ترویج واشاعت کے لیے حکمرانوں کو دو اہم محاذوں پر توجہ دینا ہوگی۔ پہلا محاذ نظامِ تعلیم ہے، قرآن وسنّت کی روح کے مطابق ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جائے جس میں مقاصدِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم تینوں اسلامی اقدار وروایات کی عکاسی کرتے ہوں۔

دوسرا اہم معاملہ ذرائع ابلاغ کی تطہیر واصلاح ہے۔ اسلامی ممالک کے ٹی وی چینلز پر دکھائی جانے والی فلمیں، ڈرامے اور اشتہارات مغربی ثقافت کو ترویج دے رہے ہوتے ہیں۔ حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ ٹی وی اور کیبل پر ان بے ہودہ اور لہوولعب کی طرف مائل کرنے والے پروگراموں کی بجائے مثبت اور مقصد سے بھرپور مہذّب پروگراموں کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو عملی زندگی میں تہذیب وشائستگی اور نظم وضبط کی پابندی قائم رکھنے کی تربیت کریں۔ تاکہ وہ ایک مہذب اور منظم فلاحی معاشرہ قائم کر سکیں۔ اگر حکمران خود مغربی تہذیب کے پیروکار ہوں اور اسلامی تعلیمات سے منحرف ہوں تو اس صورت میں معاشرہ کے صالح افراد اور اسلامی جماعتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تبلیغ وتلقین اور نصیحت کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے افرادِ معاشرہ کو نام نہاد تہذیب وشائستگی کے تصوّرات کے گرداب سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں۔

1- سورۃ الصف: ۴۔

قحط سالی اور دیگر قدرتی آفات: تدارک اور عملی اقدامات

(اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں)

Famines and Natural Disasters: Termination and Practical Steps in the Light of Sīrat Al-Nabi (SAW)

عبد الغفار*

Pakistan is under the cloud of famines and natural disasters. Specially, most of the regions of Baluchistan and Sindh are directly affected. Land is barren due to shortage of water. Load shedding has shattered daily routine of life. Lack of food and environmental pollution has given birth to numerous diseases. There is a dire need to discover real causes and remedial measures. When the Holy Prophet (SAW) laid down the foundation stone of Madīna as an Islamic State, the problems of lack of food, over population and issues of immigrants were common, which were settled with strong planning. As a result, in a few years, Madīna Munawwrah emerged on the map of the world as a perfect welfare state. In this article, different suggestions are given for making Pakistan such a safe and developed country by keeping in mind those practical implications and planning adopted by the mercy for mankind, Muhammad (SAW).

اقوام متحدہ کے ادارۂ برائے خوراک و زراعت (FAO) کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ موسمیاتی تبدیلیوں کے مضر اثرت کے باعث سب سے زیادہ وسائل خوراک کی سلامتی شدید زد میں ہے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی خبردار کیا گیا ہے کہ دنیا کی آبادی ۲۰۵۰ء تک ۹.۶ بلین ہو جائے گی، جس کیلئے مطلوبہ غذائی وسائل کو یقینی بنانے کیلئے موسمیاتی تبدیلیوں کے مہلک اثرات پر قابو پانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جسے نظر انداز کرنے والے ممالک بری طرح غذائی قلت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ روز بروز بڑھتی ہوئی آلودگی میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ بڑے چھوٹے شہر تو درکنار دنیا بھر میں سالانہ ۱.۸ بلین ڈالرز کی مہلک زہروں کے فصلوں پر اندھا دھند

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور۔

سپرے سے دیہی علاقوں کی فضا بھی بری طرح آلودہ ہو رہی ہے۔ مہلک زہروں کے بڑھتے ہوئے سپرے اور کیمیاوی کھادوں کے اثرات ماحولیاتی آلودگی کو بڑھاتے ہوئے سانس کی بیماریوں میں دمہ، ٹی بی، سینے میں درد، نزلہ، زکام، بلڈ پریشر، ہیپاٹائٹس، جلدی امراض، امراض چشم، الرجی اور کینسر جیسے مہلک امراض میں انسان ہی کو مبتلا کرنے کا سبب نہیں بن رہے بلکہ حیوانوں میں بھی کئی خطرناک امراض کو جنم دے رہے ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر درختوں کی اندھا دھند کٹائی اور نئی شجر کاری میں توازن بہت بری طرح بگڑ رہا ہے۔ جنگلات کے حوالے سے مطلوبہ تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے درخت اگانا ضروری ہے، مگر ہمارے ہاں یہ تناسب بہت کم ہو رہا ہے۔

ارضِ پاکستان پر اس وقت بھوک اور پیاس کے بادل منڈلا رہے ہیں، ملک کے کئی حصے خشک سالی کی زد میں ہیں۔ خاص طور پر صوبہ سندھ اور بلوچستان کے اکثر حصے قحط کی لپیٹ میں ہیں۔ کئی ہزار ایکڑ زرعی رقبہ بنجر ہو چکا ہے۔ گھاس اور پانی کی کمی سے مویشیوں کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ صنعت اور زراعت پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ اس کے اسباب اور ان کے حل کیلئے عملی اقدامات کیا ہیں؟ اس پر بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ماضی کی طرح اس عذابِ الٰہی کی توجیہ اور اس کے اسباب و عوامل اور علاج کی تدبیریں بھی خالصتاً مادّی اور ظاہری رخ کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہیں اور اس طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے کہ اس ساری صورتحال کے پیچھے قدرت کا ہاتھ بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔

اصل اسباب اور وجوہات کی طرف توجہ دینا اور ان کو حل کرنا شاید کوئی اپنی ذمہ داری ہی تصور نہیں کرتا۔ حسبِ روایت ہر نئی حکومت سابقہ حکمرانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر بزعم خود اپنا فرض پورا کر لیتی ہے اور اس حوالے سے ٹی وی اور ریڈیو پر چند مذاکرے کروا کر، اخبارات میں چند خبریں لگوا کر اور قومی خزانے سے قحط زدگان کی اِمداد کم اور تشہیر زیادہ کر کے حکومتیں گویا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیتی ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے بہرحال ہمارا فرض ہے کہ ان مشکلات کے سدباب اور عملی اقدامات کے لئے ہم اپنے دین سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس غرض سے مقالہ ہذا میں قحط سالی اور قدرتی آفات کے تدارک کیلئے عملی اقدامات اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں جاننے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ تاہم اس کے کچھ باطنی اسباب ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں۔ جن میں سے بہت ہی اہم، برے اعمال اور ربّ کی نافرمانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں

فرمایا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾[1] (خشکی اور تری میں لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے فساد پھیل گیا تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے بعض برے اعمال کی سزا انہیں دنیا میں چکھادے، شاید کہ لوگ برے اعمال سے باز آجائیں)۔

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾[2] (اور تم پر جو مصیبت آتی ہے تو تمہارے ہاتھوں نے جو کیا اس کی سزا میں اور وہ (اللہ) بہت (سے قصور) معاف کر دیتا ہے)۔

﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾[3] (اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن واطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا۔ تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے)۔

مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ دنیا میں خشک سالی، قحط، سیلاب، زلزلے، طوفان، اندرونی و بیرونی جھگڑے اور فسادات یا معاشی و اقتصادی اور اخلاقی بدحالی کی کوئی بھی شکل ہو، یہ سب انسان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہے اور یہ ساری مصیبتیں اور آزمائشیں انسان پر اس لئے آتی ہیں کہ انسان ان سے عبرت حاصل کرے اور انہیں اپنی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہوئے اپنے حالات میں مثبت تبدیلی پیدا کرے۔

آج اگر ہم اپنے حالات پر نظر ڈالیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لیں تو حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی برائی نہیں جسے ہم نے من حیث القوم سینے سے نہ لگایا ہو۔

آج وطن عزیز قحط سالی اور قدرتی آفات کی لپیٹ میں ہے۔ کئی زمینیں اور بستیاں ویران و غیر آباد ہو چکی ہیں۔ بعض علاقوں میں انسان اور جانور پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہے ہیں قرآن ہمیں یہ بات یاد دلاتا رہتا

۱۔ سورۃ الروم، ۴۱۔

۲۔ سورۃ الشوریٰ، ۳۰۔

۳۔ سورۃ النحل، ۱۱۲۔

ہے کہ اجتماعی گناہ عذاب الٰہی کا سبب بنتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾[1] (آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی (قوم عاد) اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا (قوم ثمود) اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (قارون) اور کسی کو غرقِ آب کر دیا (فرعون، ہامان اور قوم نوح) ... اللہ تو ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے)۔ اور دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾[2] (بے شک اللہ کسی پر ذرّہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا)۔

جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر اُتر آئے اور اجتماعی سرکشی و بغاوت شروع کر دے تو وہ قوم صفحۂ ہستی سے جلد ہی مٹ جایا کرتی ہے: ﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾[3] (اور کتنی بستیاں ایسی گذر چکی ہیں جنہوں نے اپنے ربّ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہم نے سختی سے ان کا حساب لیا اور ان کو برے عذاب (بیماری قحط وغیرہ) میں پھنسا دیا، بالآخر انہوں نے اپنے برے اعمال کا وبال چکھ لیا اور ان کے برے کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملیامیٹ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے سخت ترین عذاب تیار کر رکھا ہے، عقل والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ)۔

اہم بنیادی اسباب جاننے کے بعد ذیل میں چند ایسے عملی اقدامات کا تذکرہ کیا جائے گا جن کو رسول اکرم حضرت محمد ﷺ نے اختیار فرمایا کہ جن کی وجہ سے ہم ایسے عذابوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

۱۔ سورۃ العنکبوت، ۴۰۔

۲۔ سورۃ النساء، ۴۰۔

۳۔ سورۃ الطلاق، ۸-۱۰۔

ناپ تول میں کمی بیشی سے بچنا، زکوٰۃ کی ادائیگی کو معاشرے میں پروان چڑھانا:

جو قوم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیروں کو پوجنے لگے اور ماپ تول میں کمی بیشی کرنا شروع کر دے تو ایسی قوم بھی بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہے۔ سورۂ ہود میں اللہ نے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دیتے رہے اور ماپ تول میں کمی بیشی سے منع کرتے رہے لیکن ان کی قوم نے صاف کہہ دیا کہ اے شعیب !عَلَیْہِ السَّلَام ہم تیرے کہنے پر اپنے آباؤ اجداد کے دین کو نہیں چھوڑ سکتے اور ماپ تول میں کمی بیشی سے بھی باز نہیں آسکتے حضرت شعیب عَلَیْہِ السَّلَام کے بار بار نصیحت کرنے اور سمجھانے کے باوجود جب قوم باز نہ آئی تو آپ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا: ﴿ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ﴾[1] (میری قوم! تم اپنی جگہ جو کرتے ہو، کرتے رہو اور میں اپنا کام کرنے والا ہوں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کن عذاب کی لپیٹ میں کون آتا ہے اور جھوٹا کون ہے)۔

پھر قوم شعیب پر عذابِ الٰہی کا کوڑا برسا اور زوردار آواز نے ان کے کلیجے چیر دیئے اور وہ ایسے ختم کر دیئے گئے جیسے وہ وہاں کبھی آباد ہی نہیں رہے تھے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ماپ تول میں کمی بیشی کوئی معمولی نہیں بلکہ سنگین جرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ پیداوار میں کمی کر کے قحط میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: (جو لوگ ماپ تول میں کمی بیشی کریں گے: اللہ تعالیٰ ان کی پیداوار کم کر دے گا اور ان پر قحط مسلط فرمادے گا)۔[2]

آج اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو بے شمار تاجر ایسے ملیں گے جو اس گھناؤنے جرم کو اپنی ذہنی ہوشیاری اور چالاکی سمجھتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم کے لئے دنیا میں قحط اور دنیا و آخرت میں عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ

۱۔ سورۃ ھود، ۹۳۔

۲۔ ابو محمد عبد العظیم المنذری، **الترغیب والترھیب**، باب فی الترغیب فی الکذب وعقابہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۷ھ، ص ۹۶، رقم الحدیث ۲۳۴۴۔

يُخْسِرُونَ﴾[1] (بڑی خرابی ہے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں)۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ما نقض قوم العهد إلا كان القتل بينهم ولا ظهرت الفاحشة في قوم إلا سلط الله عليهم الموت ولا منع قوم الزكاة إلا حبس عنهم المطر)[2] (جو قوم وعدے کی پاسداری نہیں کرے گی، ان کے درمیان قتل وغارت گری شروع ہو جائے گی اور جس قوم میں زناکاری عام ہو جائے گی، ان پر اللہ تعالیٰ موت مسلط فرمادے گا اور جو قوم زکوٰۃ روک لے گی، اللہ تعالیٰ ان سے بارانِ رحمت کو روک لے گا)۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لم ينقص قوم المكيال والميزان إلا أخذوا بالسنين وشدة المؤنة وجور السلطان عليهم ولم يمنعوا زكاة أموالهم إلا منعوا القَطْرَ من السماء ولو لا البهائم لم يمطروا)[3] (جو قوم ناپ تول میں کمی بیشی کرتی ہے، اس کو قحط سالی کی سخت مصیبتوں میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ظالم حکمران ان پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں اور جو لوگ اپنے مال سے زکوٰۃ روک لیتے ہیں، ان سے بارشیں روک لی جاتی ہیں۔ اگر جانور نہ ہوتے تو بالکل بارش نہ ہوتی)۔

بے حیائی اور فحاشی سے بچنے کی تلقین کرنا:

جس معاشرے میں بے حیائی، فحاشی اور عریانی بدکاری اور زناکاری عام ہو جائے وہ معاشرہ بھی قدرتی آفات کا نشانہ بن جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے سورۂ یوسف میں مصر کے عوام اور وہاں کے حکمرانوں کی بیگمات کی اخلاقی بدحالی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے شہادت دی کہ اس بدکاری اور فحاشی کی دلدل میں پھنسے ہوئے معاشرے پر اللہ تعالیٰ نے سات سال تک قحط مسلط کئے رکھا۔[4]

۱۔ سورۃ المطففین، ۱-۳۔

۲۔ المنذری، **الترغیب والترھیب**، باب فی الترغیب فی الکذب وعقابہ، رقم الحدیث ۲۳۴۴۔

۳۔ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی، **السنن**، کتاب الفتن، باب العقوبات، ناشر دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض، سعودی عرب، الطبع الثالث، ۲۰۰۰ء، رقم الحدیث ۴۰۱۹۔

۴۔ سورۃ یوسف: ۲۲، ۳۳، ۴۸۔

توبہ واستغفار اور نماز استسقاء:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے استغفار کو لازم کر لیا، اللہ اسے ہر تنگی سے نجات دیں گے اور ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائیں گے جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہو گا۔[1]

قحط سالی میں حضرت رسولِ کریم ﷺ نمازِ استسقاء ادا کرتے اور بڑے خشوع و خضوع سے توبہ و استغفار کرتے اور دعائیں مانگتے۔ جیسے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ (جب آپ ﷺ نمازِ استسقاء میں یہ دعائیں پڑھتے اور توبہ استغفار کرتے تو بارانِ رحمت شروع ہو جاتی)۔[2]

قدرتی آفات اور ریاستی ذمہ داریاں:

ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ:

قدرتی آفات سے نمٹنے کیلئے حکومتوں کو بعض خصوصی انتظامی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ریاست کو انتظامی لحاظ سے چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر دیا حتی کہ چودہ صوبے قائم ہوئے ہر ایک صوبے کا حکمران رسول کریم ﷺ کا متعین کردہ والی ہوتا جو مارکیٹ اور بازاروں کا دورہ بھی کرتا اور تاجروں کو باقاعدہ چیک کیا جاتا تھا ناپ تول میں کمی دھوکہ و فریب نرخوں میں بے جا اضافہ ایسی چیزوں پر احتساب کیا جاتا آپ ﷺ نے بازار کے محتسب بھی مقرر فرمائے بعض اوقات خواتین کو بھی اس کام پر مامور کیا جاتا۔

سعید بن عاص کو فتح مکہ کے بعد مکہ کے بازاروں کی نگرانی پر مامور فرمایا۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے بازاروں کی نگرانی کا کام حضرت عمر فاروق کے سپرد تھا۔[3] تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کیلئے آپ ﷺ خود بازاروں اور منڈیوں کا دورہ فرماتے اور معاملات کی تفتیش کرنے کے بعد تنبیہ اور ضروری کاروائی فرماتے۔[4]

۱۔ ابن ماجہ، **کتاب الادب**، باب الاستغفار، حدیث نمبر ۳۸۱۹۔

۲۔ مثلاً ملاحظہ ہوں قحط سالی کے خاتمے کیلئے دعائیں، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الاستسقاء، باب الدعا اذا کثر المطر حوالینا ولا علینا، ابوداود، السنن، کتاب صلاۃ الاستسقا، باب رفع الیدین فی الاستسقاء۔

۳۔ ابن عبدالبر، **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**، مطبع دار الکتب السلفیہ، ۱۹۶۰ء، ج ۱، ص ۱۰۷۔

۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ، **عہد نبوی میں نظام حکمرانی**، المطبعۃ الامیریۃ، بولاق، الطبعۃ الاولی ۱۳۲۱ھ، ص ۲۶۸۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دفعہ اپنے زمانہ خلافت میں غلہ منڈی میں گئے اور جا کر اناج کے ڈھیروں کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک جگہ آپ نے نہایت عمدہ اناج دیکھا اور فرمایا کہ اللہ اس غلے میں برکت عطا فرمائے اور اس کے لانے والے پر بھی رحم و کرم فرمائے۔ آپؓ کو بتایا گیا کہ اس غلہ کے مالکوں نے اس کو ذخیرہ کیا ہوا تھا۔ آپؓ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہیں جنہوں نے اُمت کی ضرورت کے وقت اس غلہ کو ذخیرہ کیا ہے۔ آپؓ کو بتایا گیا کہ فلاں فلاں آدمی ہیں۔ آپؓ نے ان کو طلب کر کے فرمایا: "میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے کہ جو آدمی امتِ مسلمہ کی ضرورت کے وقت اناج ذخیرہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے کوڑھ کی بیماری لگا دیں گے یا اسے غربت و افلاس میں مبتلا کر دیں گے۔"

ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے وہاں کھڑے ہی اللہ کے حضور توبہ کر لی اور آئندہ ذخیرہ اندوزی نہ کرنے کا اللہ سے وعدہ کر لیا لیکن دوسرے آدمی نے کہا کہ یہ ہمارا اناج ہے، ہم جب چاہیں اور جیسے چاہیں خرچ کریں کسی کو کیا اعتراض ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کو کوڑھ کی بیماری میں مبتلا کر دیا اور وہ اسی حال میں مر گیا۔[1]

کمزوروں کی کفالت:

عہد نبوی ﷺ میں ریاست مدینہ میں اہل ثروت سے دولت کی وصولی اور ضرورت مندوں میں اس کی تقسیم کا اہتمام کرنا سرکاری سطح پر کیا گیا اس سلسلہ میں باقاعدہ طور پر سرکاری تقرریاں کی گئیں۔ رسول کریم ﷺ نے صدقہ فطر کا حکم زکوۃ کی فرضیت سے بھی پہلے دیا اور مسلمانوں میں سے ہر آزاد اور غلام مرد و عورت پر فرض کیا۔ رسول کریم ﷺ نے معاشرے کو قحط سالی سے بچانے کیلئے عملی اقدامات فرمائے مجبور اور کمزور طبقے کی کفالت کا نظام وضع فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (انا ولی من لا ولی له)[2] (جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست میں ہوں)۔

۱- مسند احمد، **مسند عمر بن خطاب**، ناشر دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض، سعودی عرب، الطبع الثالث، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۰۔

۲- **نسائی**، کتاب الفرائض، ذکر اختلاف الفاظ الناقلین، یخیر لمقداد بن معدیکرب فی توریث الخال، رقم الحدیث ۶۳۲۳۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نہیں دیتا، قیامت والے دن اس کے مال کو آگ کی تختیاں بنا کر اس کے دونوں پہلو، پیشانی اور کمر کو داغا جائے گا۔ یہ دن پچاس ہزار سال کا ہو گا اور لوگوں کا فیصلہ ہونے تک اس کا یہی حال رہے، اس کے بعد اسے جنت یا جہنم میں لے جایا جائے گا)۔ (۱)

اشیائے خوردونوش کا اسراف اور ضائع کرنا:

حکومتوں کے لیے اپنے تمام ذرائع بروئے کار لا کر عوام کے اندر یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے وسائل ضائع نہ کریں کیونکہ کسی بھی چیز کے استعمال میں جب اسراف و تبذیر سے کام لیا جائے اور اسے ضائع کیا جائے تو اس کا نتیجہ اس شے کے قحط کے طور پر سامنے آئے گا۔ انسان کے پاس اگرچہ مال وزر کے خزانے ہی کیوں نہ موجود ہوں، اگر وہ ان کے استعمال میں اسراف سے کام لے گا تو بہت جلد ان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ مثلاً دنیا میں صاف پانی کی قلت کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تین چوتھائی حصے کو پانی سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود بھی اگر اس کا استعمال مناسب نہ ہو تو انسان اس کے ایک ایک قطرے کو ترس جاتا ہے۔ جن علاقوں میں پانی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے وہاں باشندے عموماً پانی کو مفت سمجھ کر اس کا بے بہا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ پانی کی سطح وہاں آہستہ آہستہ گرنا شروع ہو جاتی ہے اور پھر سارا علاقہ پانی کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو پانی کے سلسلہ میں بھی اسراف و تبذیر سے منع فرمایا ہے۔

سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ ایک دفعہ وہ دورانِ وضو ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کر رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ (ہاں! یہ بھی اِسراف میں شامل ہے، اگرچہ تم کسی جاری نہر کے کنارے پر ہی کیوں نہ بیٹھے ہو) یعنی پانی کو ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کیا کرو۔ (۲)

اس طرح غذائی اجناس کی حفاظت اور اسکی تقسیم کا درست انتظام بھی قحط سالی میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ وقت کو غذائی اجناس کی حفاظت اور تدبیر سے خرچ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (۳)

۱۔ مسلم بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم**، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۹ء، رقم الحدیث، ۲۲۹۲۔

۲۔ ابن ماجہ، ابواب الطھارۃ وسننھا، رقم الحدیث ۴۱۹۔

۳۔ سورۃ یوسف: ۴۷۔

غذائی منصوبہ بندی:

قدرتی آفات بالخصوص قحط سالی کی بنا پر جب بھی کوئی بے سرو سامانی کا ماحول پیدا ہو جائے تو اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ سرکاری خزانے سے وہ اس مشکل وقت میں متاثرین کی مدد کرے اس کی بڑی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے۔ جب ان کے زمانے میں قحط پڑا تو آپ نے بطور سربراہ حکومت، سرکاری سطح پر غلہ تقسیم کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عملی طور پر اسوۂ یوسفی کو پیش نظر رکھتے ہوئے خشک سالی کے دوران عوام الناس میں غلہ و خوراک تقسیم فرمایا۔ اور اس کی خوب منصوبہ بندی فرمائی، جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر میں منصوبہ بندی کا ذکر کیا۔ ﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ﴾ [1] (انہوں نے کہا کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے تو جو (غلہ) کاٹو تو تھوڑے سے غلے کے سوا جو کھانے میں آئے اُسے خوشوں میں ہی رہنے دینا۔ پھر اس کے بعد (خشک سالی کے) سات سخت (سال) آئیں گے کہ جو (غلہ) تم نے جمع کر رکھا ہو گا وہ اس سب کو کھا جائیں گے۔ صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تم اختیار سے رکھ چھوڑو گے۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ خوب مینہ برسے گا اور لوگ اُس میں رس نچوڑیں گے)۔

آفت زدہ معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے حکومت اور عوام کا اشتراک:

انسانی ہمدردی، اخوت اور جذبہ ایثار و قربانی کو معاشرے میں پروان چڑھا کر مصیبت و آفت زدہ رعایا کی امداد اور بحالی کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [2] (اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔)

۱۔ سورۃ یوسف، ۴۷۔۴۹؛ الجصاص، ابو بکر احمد الرازی، احکام القرآن، (یجب علی الامام ان یفعل مثلا ما فعله یوسف اذا اخاف هلک الناس من القحط)، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۹۹ء، ج ۳، ص ۲۵۸۔

۲۔ سورۃ الحشر، ۹۔

نبی کریم ﷺ نے ایسے موقعوں پر کفایت شعاری کا درس دیا۔ اور فرمایا کہ (دو افراد کا کھانا تین افراد کیلئے کافی ہے اور تین کا چار کیلئے کافی ہے)۔[1]

مذکورہ بالا نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط سالی یا قدرتی آفات کے وقت حکومت عوام میں سے صاحب حیثیت لوگوں سے اپیل کر سکتی ہے اور کسی قدر انھیں اس فلاحی کام میں شامل ہونے کیلئے مجبور بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے قحط سالی کے دوران ہر گھر میں اہل خانہ کی تعداد کے برابر قحط زدہ افراد کو داخل فرمادیا، اور فرمایا کہ آدھی غذا کر دینے سے کوئی شخص نہیں مرے گا۔[2]

آنحضرت ﷺ کے ایسے عملی اقدامات کیلئے اخوت مدینہ منورہ او راصحاب صفہ کی امثلہ آج کے معاشرہ کیلئے مینارۂ نور ہیں۔[3]

عوامی نقصانات کی تلافی کیلئے ریاستی ذمہ داریاں:

قحط سالی / قدرتی آفات کی وجہ سے ہونے والے نقصانات پورا کرنے کے حوالے سے مختلف تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں چند ایک کا تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔ اگر خرید کردہ مال قبضہ سے قبل ہی کسی قدرتی آفت کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو حاکم اس نقصان کے برابر قیمت کم کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے آفت کی وجہ سے ہونے والے نقصان کے برابر قیمت کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ امام مالک

۱۔ مالک، **موطا**، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الطعام والشرب، مطبعہ دار السلام للنشر والتوزیع، مصر، ۲۰۰۲م، ص۷۱۶۔

۲۔ ابو الفضل احمد بن علی ابن حجر عسقلانی، **الاصابة فی تمییز الصحابة**، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ج۲، ص۲۱۹۔

۳۔ مزید مطالعہ کے لئے، مسلم، **الجامع الصحیح**، کتاب اللقطة، باب استحباب المواساة بفضول المال، ص۹۸۴-۹۸۵؛ بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام، ص۲۹۱؛ کتاب الشرکة، باب الشرکة فی الطعام، رقم ۲۴۸۴-۸۵؛ کتاب التفسیر، باب النبی اولی بالمومنین من انفسهم۔

فرماتے ہیں کہ اسی پر ہمارا عمل ہے۔ امام مالک مزید بیان کرتے ہیں کہ وہ نقصان جس کی وجہ سے (قیمت) کم کی جاتی ہے وہ مال کا ایک تہائی یا اس سے زائد ہے، اس سے کم نقصان میں تباہی اور آفت نہیں مانی جائے گی۔ (۱)

۲۔ اگر خریدا ہوا سارا مال تلف ہو جائے تو حکومت بائع کو مشتری سے قیمت وصول کرنے سے روکے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اگر تم اپنے بھائی کو پھل فروخت کر دو۔ پھر ان پھلوں پر کوئی آفت آجائے تو تیرے لئے حلال نہیں کہ تو اس (مشتری) سے (قیمت میں سے) کچھ وصول کرے۔ تم اپنے بھائی کا مال (بطور قیمت) کسی حق کے بغیر کس چیز کے عوض لوگے؟)۔ (۲) اسی بات کو دوسری حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے: (عن جابر بن عبد الله ان النبی ﷺ امر بوضع الجائحة) (۳) (حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے قدرتی آفات سے ہونے والے نقصانات کو وضع کرنے یعنی گرانے کا حکم دیا ہے)۔

۳۔ آفت زدہ فرد یا گروہ اگر قرض کے بوجھ تلے دب جائے تو حکومت خوشحال لوگوں کو مقروض کی مدد کے لئے فرمان جاری کرے۔ لیکن اگر عوام کی مدد سے بھی آفت زدہ کا قرض نہ اترے تو پھر قرض خواہ سے معاف کروایا جائے۔ ان دونوں نکات پر درج ذیل حدیث مبارکہ دلیل ہے:

(عن ابی سعید الخدری قال اصیب رجل فی عهد رسول الله ﷺ فی ثمار ابتاعها فکثر دینه فقال رسول الله ﷺ تصدقوا علیه فتصدق الناس علیه فلم یبلغ ذالک وفاء دینه فقال رسول الله ﷺ لغرمائه خذوا ما وجدتم ولیس لکم إلا ذالک) (۴)

۱۔ مالک، موطا، کتاب البیوع، باب الجائحة فی بیع الثمار والزرع، ناشر دار السلام للنشر والتوزیع ریاض، السعودیہ، الطبع الثالث، ۲۰۰۰م، ص ۵۷۲۔

۲۔ مسلم، **الجامع الصحیح**، کتاب المساقاة والمزارعة، باب وضع الجوائح، ص ۹۴۸۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

(حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص کے پھلوں پر ناگہانی آفت آگئی جن کو اس نے خریدا تھا۔ پس اس کا قرض بہت زیادہ ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس (آفت زدہ) کو صدقہ دو۔ سو لوگوں نے اس پر صدقہ کیا۔ لیکن وہ رقم قرض اتارنے کے لئے کافی نہ تھی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا: تمہیں جو مل گیا ہے لے لو اس کے علاوہ تمہیں اور کچھ نہیں ملے گا)۔

۵۔ قدرتی آفات کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر اسلامی ریاست کے ذمہ ہے کیونکہ مصالح شریعت کا تحفظ کرتے ہوئے حفظ جان و مال اس کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اب اسلامی حکومت کو اس کے لئے مختلف تدابیر تلاش کرنا ہوتی ہیں۔

اہل مغرب نے آفات و حوادث کے نقصانات سے بچنے کی خاطر اپنے ہاں بیمہ کا نظام جاری کیا اور پھر اس کی متعدد شکلیں بنتی گئیں۔ موجودہ دور میں اس کا جو نظام اسلامی ممالک میں بھی مروج ہے، اس میں اگر مناسب ترامیم کر کے اسے اسلامی احکام کے مطابق کر لیا جائے، تو اسلامی ریاست میں اس تدبیر سے بھی مستقل بنیادوں پر قدرتی آفات وغیرہ کی صورت میں ہونے والے نقصانات کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔

اگر حکومت بیمہ کے نظام کو شرعی مفاسد سے پاک کرتے ہوئے آسان اور ہر کسی کے پہنچ کے مطابق بنا کر بطور قانون نافذ کر دے، تو اس سے قدرتی آفات کے وقت مدد مل سکتی ہے اور نقصانات کی تلافی بروقت ہو سکتی ہے۔

اس موجودہ نظام بیمہ کے علاوہ اسلام اور شریعت اسلامیہ اس وقت سے اپنے افراد کو ایک مخصوص طریقے سے انشورنس پالیسی دے چکی ہے، جب مغرب ابھی اس سے واقف بھی نہ تھا۔ وہ اس طرح کہ اسلامی ریاستوں میں بیت المال شرکۃ التامین یعنی بیمہ کمیٹی کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ حوادث زمانہ کا شکار ہر شخص اس کی پناہ لیتا ہے پس وہ اس میں مدد اور ٹھکانہ حاصل کر لیتا ہے۔[1] گویا اسلام کا معاشی نظام ایک قابل عمل انشورنس نظام فراہم کرتا ہے مگر معاشی مسائل کے حل کے لئے اس کو فعال بنا لینا کافی ہے یعنی معمول کے مطابق چلنے والے نظام زکوٰۃ و صدقات وغیرہ میں بھی اتنی صلاحیت رکھی گئی ہے کہ مشکل حالات میں زندگی کا تحفظ کیا جا سکے۔

۱۔ یوسف القرضاوی، **فقه الزكاة**، دار الارشاد للطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، ج ۲، ص ۹۰۷۔

آفت زدگان کی آبادکاری کے لئے اقدامات:

کسی قدرتی آفت کی وجہ سے اگر مکانات وغیرہ گر جائیں جس طرح کہ زلزلہ و سیلاب وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے تو یہ بڑا ضروری ہو جاتا ہے کہ متاثرین کو جلد از جلد رہائش جیسی بنیادی ضرورت فراہم کی جائے تاکہ وہ موسم کی شدت سے بچ سکیں اس چیلنج کو پورا کرنے کے لئے ایک اسلامی ریاست میں جو اقدامات اٹھائے جاسکتے ہیں ان میں سے چند ایک ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱- سب سے پہلے حکومتِ اسلامی کی بنیادی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے پاس موجود وسائل اس مقصد کیلئے خرچ کرے، اگر یہ وسائل ناکافی ہوں تو متمول افراد پر وقتی طور پر اضافی ٹیکس لگا کر فی الفور متاثرین کو تمام بنیادی ضروریات فراہم کرے کیونکہ اگر زکوٰۃ وغیرہ سے آفت زدگان کی معاشی حالت کو سنبھالا نہ دیا جارہا ہو، تو حکومت اغنیاء کو مجبور کر سکتی ہے کہ اپنے مسلمان متاثر بھائیوں کی مدد کریں اور انہیں خوراک، لباس اور رہائش فراہم کریں۔[1]

۲- رعایا میں جذبہ احسان اور ایثار و قربانی کو پروان چڑھا کر متاثرین کی آبادکاری میں مدد لی جاسکتی ہے۔ جس کی اعلیٰ ترین مثال ہجرت مدینہ کے موقع پر انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے قائم کی، مواخاۃ مدینہ کو اسلام کے اجتماعی نظام تکافل کا ایک عملی نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعے مہاجرین کی معاشی کفالت کا سامان ہوگیا اور متعلقہ معاشی مسائل حل ہوگئے اور قلیل عرصہ میں مہاجرین کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے اسباب اللہ تعالیٰ نے اس عقد مواخاۃ کے ذریعے پیدا کردیے۔ یوں وقتی بے روزگاری کا علاج تلاش کر لیا گیا اور معاشی وسائل کا مناسب استعمال کرایا گیا۔[2]

اسوۂ رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تقاضوں کے مطابق حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے جیسے بھی ممکن ہو آفت زدہ لوگوں کی آبادکاری کا اہتمام کرنا ایک ضروری اور فوری قدم ہے۔

۱- احمد بن علی ابن حجر عسقلانی، **الاصابة فی تمییز الصحابة**، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۲، ص ۲۱۹۔

۲- ڈاکٹر نور محمد غفاری، **نبی اکرم ﷺ کی معاشی زندگی**، مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری، لاہور، ص ۱۷۰- ۱۷۱۔

قدرتی آفات اور خصوصی حالات میں طبی امداد کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزوات کے موقع پر رسول گرامی حضرت محمد ﷺ نے ازواج مطہرات اور خواتین کو بھی مرد زخمیوں کو مرہم پٹی کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ جب جہاد کرتے تھے تو آپ کے ساتھ حضرت ام سلیم اور انصار کی کچھ عورتیں بھی ہوتی تھیں پس وہ (مجاہدین کو) پانی پلاتی اور زخمیوں کو دوائیں دیتی تھیں)۔ (۱)

اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ ہے: (عن ربیع بنت معوذ بن عفراء قالت: کنا نغزو مع رسول اللہ ﷺ نسقی القوم ونخدمهم ونرد القتلی والجرحی الی المدینة) (۲) (ربیع بنت معوذ بن عفراء سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شرکت کیا کرتی تھیں ہم لوگوں کو پانی پلاتی تھیں اور مقتولوں اور زخمیوں کو مدینہ لایا کرتی تھیں)۔

یعنی ہنگامی حالات میں عفت و پاکدامنی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضرورت پڑے تو خواتین سے بھی معاونت لی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے انہیں مناسب تربیت دی گئی ہو۔

رسول کریم ﷺ کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ متاثرین قدرتی آفات کو ضرورت اور موقع محل کے مطابق طبی امداد فراہم کرنا ضروری ہے۔ ایسے مواقع پر ضروری اقدامات کی اہمیت کے ضمن میں جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں مجبور شخص کی جان بچانے کی حد تک مدد کرنا واجب ہے۔ اسی طرح اسے ڈوبنے یا جل جانے جیسی تمام ہلاکتوں سے بچانا صاحب قدرت شخص پر واجب کفایہ ہے یعنی اگر قدرت رکھنے والوں میں سے کوئی اس فریضے کو انجام دے دیں تو باقی بری الذمہ ہو جائیں گے وگرنہ تمام صاحب استطاعت افراد گناہ گار ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان مجبوروں اور بے کسوں کی امداد و معاونت نہ صرف حکومتی بلکہ عوام کی بھی ذمہ داری ہے۔

۱۔ مسلم، **الجامع الصحیح**، کتاب الجهاد، باب غزوة النساء مع الرجال، رقم الحدیث ۱۰۰۲۔

۲۔ البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الطب، باب هل یداوی الرجل المرأة والمرأة الرجل، رقم الحدیث ۴۸۶۔

المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في السيرة النبوية

Responsibilities of Person for Welfare of Society in the Light of Sīrat Al-Nabi (SAW)

محمد عبد الرزاق أسود*

The Messenger of Allah, Ḥazrat Muḥammad (SAW) has presented his life and character as an example for man and society. A Muslim should play his due role at every stage for reformation and benevolence of society. The respected Holy Prophet (SAW) declared it a great virtue to be affectionate, co-operative and resourceful for each other. He proclaimed that no Muslim can be a perfect Muslim unless he desires same for the other Muslim which he desires for himself. The best of the Muslims is one who is more useful and kinder for society and his fellow beings. The term "Social Responsibilities" is not visible and found in the books of old authentic great writers. It is a modern term and it means that every member of society must feel his responsibility. He must play his role for positive changes in society and take part in all virtuous deeds and activities. He may not be involved in violation of law and order. The Holy Prophet (SAW) has made every member of society responsible for leading the life of purpose and mission. This research article thoroughly throws light upon this theme.

الحمد لله ربّ العالمين وأفضل الصلاة وأتم التسليم على سيدنا محمد النبي الأمي وعلى آله وصحبه أجمعين، ورضي الله عن العلماء المخلصين إلى يوم الدين، أما بعد:

فتمثل المسؤولية الاجتماعية موقعاً مهماً في السيرة النبوية في توجيه المسلم للعمل على سعادة الأمة والمجتمع، ورسول الله صلى الله عليه وآله وسلم هو الأسوة الحسنة، والنموذج العملي الأمثل، لأفراد المجتمع المسلم في المساهمة في العمل الاجتماعي وتبنيه، وتحمل مسؤولياته، إذ إن المسلم يعي معاني النفع العام، ويحس بمسؤولياته نحو أبناء أمته، حين يندمج بهم، ويلامس قضاياهم، ويشاركهم همومهم، ويدرك عظم المسؤولية تجاههم.

وتجعل المسؤولية الاجتماعية قيمة لمن يحملها بقدر تحمّلها، وهي قاسم مشترك بين كل فئات المجتمع، يتحمّلها كل فرد في المجتمع حسب مكانته، وبقدر إمكانيته، وفي حدود وسعه واستطاعته، ولا يُعفى أحد منها البتة، مهما بلغت منزلته، وقلّت أو تسامت رتبته.

---

* أستاذ السنة النبوية وعلومها المشارك في كلية الآداب بجامعة الدمام بالمملكة العربية السعودية.

والمسؤولية الاجتماعية أمانة في عنق المسلم يحملها بإخلاص، ويعمل بها في ثبات، ويراقب الله تعالى في أدائه لها، ومتى أدّاها على الوجه الصحيح كسب رضا الله تعالى، وثقة الناس به، وحقق السعادة والطمأنينة لنفسه، والخير والفلاح لمجتمعه وأمته.

واستشعار المسؤولية الاجتماعية في قلب المسلم وفكره وعقيدته، تجعله يغيّر مسيرة مشواره، ويصحح اتجاه إبرة دورة حياته، للتسامي فوق حطام القيم المادية البائدة لهذه الدنيا الفانية، سعياً إلى تحصيل القيم الخالدة للحياة الآخرة، وهنا تمكن أهمية البحث في الاقتداء بسيرة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم؛ ولأهمية هذا الموضوع في حياة الفرد والمجتمع، أياً كانت أوطانهم، وجنسياتهم، وأديانهم، تلك المسؤولية التي تتمثل في تحمّل القادرين من أبناء المجتمع لكثير من الأعباء المادية أو المعنوية، التي تعجز الفئات الأخرى عن احتمالها، ومن هنا اهتمت المجتمعات الإنسانية بتنمية هذه المسؤولية لدى أفرادها، والبحث عن العوامل التي تؤدي إلى غرسها وتطويرها في نفوس أفرادها، ولأنها إحدى الآليات للنهوض بالمجتمع والارتقاء به، وشكل من أشكال تحقيق العدالة، والمساواة، والتعاون بين المجتمعات، وقد حفلت السيرة النبوية بما يدعو إلى تحمل المسؤولية تجاه المجتمع، وذلك في أحاديث كثيرة، ومن هنا تأتي أهمية هذا الموضوع.

قبل أن نلج في بيان أثر المسؤولية الاجتماعية في سعادة المجتمع؛ لا بد من تعريف السيرة النبوية وتناول مصطلح المسؤولية الاجتماعية بالتعريف.

المطلب الأول: تعريف المسؤولية الاجتماعية لغة واصطلاحاً:

أولاً: تعريف المسؤولية الاجتماعية لغة: المسؤولية: مصدر من سأل، والمسؤول: هو ما يسأله الإنسان، وتأتي بمعنى الاستخبار، والمطلوب منه، والمحاسب عليه[1]، والمسؤول: من رجال الدولة المنوط به عمل تقع عليه تبعته، والمسؤولية بوجه عام تعني حال أو صفة من يُسأل عن أمر تقع عليه تبعته، وتطلق أخلاقياً على التزام الشخص بما يصدر عنه قولاً أو عملاً، وتطلق قانوناً على التزام الشخص بإصلاح الخطأ الواقع على الآخرين وفقاً للقانون، وتطلق إدارياً على تبعة الوظيفة المسندة إلى الموظف[2]، فالمسؤولية: هي الأعمال التي يكون الإنسان مطالباً بها[3].

---

١. ابن منظور، لسان العرب، مادة سأل.

٢. إبراهيم مصطفى وآخرون، المعجم الوسيط مادة سأل.

٣. انظر للتوسع: د.عدنان العلمي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١١٨،

وأما معنى الاجتماعية: فالمجتمع: موضع الاجتماع، والجماعة من الناس، وعلم الاجتماع: علم يدرس الظواهر الاجتماعية[١]، والاجتماع: تقارب أجسام بعضها من بعض[٢]، والمجتمع عبارة عن: "جماعة من الناس اجتمعوا في مكان ما لفترة؛ حتى تمايزوا عن غيرهم من الجماعات الأخرى"[٣]، والاجتماعي: المنسوب إلى الاجتماع؛ أي المختص بالمجتمع الميال بفطرته إلى الحياة في المجتمع، والحسن في المعاشرة[٤].

ثانياً: تعريف المسؤولية الاجتماعية اصطلاحاً: لم يرد مصطلح للمسؤولية الاجتماعية في كتب الأقدمين بالمعنى الذي استعملت فيه حديثاً، وإن كان معناها شائعاً عندهم، وهي ترادف أهلية الأداء؛ والتي تعني صلاحية الإنسان لأن تعتبر أقواله وأفعاله شرعاً[٥]، وعلى ضوء المعاني اللغوية السالفة الذكر يكون المعنى الاصطلاحي لكلمتي المسؤولية الاجتماعية ما يلي: "التزام الشخص كفرد من أفراد المجتمع بإصلاح عدة جوانب من الحياة الاجتماعية فيما بينهم على اتخاذ مواقف إيجابية، بدافع من مشاعر وجدانية عميقة، تنبع من أصل العقيدة الإسلامية؛ ليعيش الفرد في الجماعة، وتعيش الجماعة بمؤازرة الفرد، حيث يتعاون الجميع"[٦]، وبعبارة أخرى أنها: "إقرار الفرد بما يصدر عنه من أفعال وأقوال، واستعداده العقلي والنفسي لتحمل ما يترتب عليه من نتائج"[١].

... د.عصام عبد الشافي، المسؤولية الاجتماعية، قراءة في الأبعاد والدلالات التأصيلية، ج ١، ص ٣٥-٣٦، أ.علي عمر، تنمية قدرات الشباب لتحمل المسؤولية الاجتماعية في مجال الدعوة إلى الله، برنامج تدريبي متخصص، ج ١، ص ٣٦٠.

١. إبراهيم مصطفى وآخرون، المعجم الوسيط، مادة جمع.

٢. الجرجاني، كتاب التعريفات، ١٠.

٣. مروة عرابي، المسؤولية الاجتماعية بين أفراد المجتمع والعمل الخيري، ج ١، ص ٨٩.

٤. انظر للتوسع: نورمان بن عبد البكري، المسؤولية الاجتماعية، الإطار النظري، ج ١، ص ٨، د.عصام عبد الشافي، المسؤولية الاجتماعية: قراءة في الأبعاد والدلالات التأصيلية، ج ١، ص ٣٧.

٥. أ.عبد الناصر شيخ محمود، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦٨٢-٦٨٣.

٦. انظر للتوسع: نورمان بن عبد البكري، المسؤولية الاجتماعية: الإطار النظري، ج ١، ص ٨-٩، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٥٩١، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم

المطلب الثاني: تعريف السيرة النبوية لغة واصطلاحاً:

أولاً: تعريف السيرة النبوية لغة: السيرة تعني الهيئة، وحدث أحاديث الأوائل[٢]، والسِّيرة: الطريقة[٣]، سواء كانت خيرًا أو شرًا، يقال: فلان محمود السيرة، وفلان مذموم السيرة[٤]، والذي استقر عليه الاصطلاح في العصور المتأخرة هو: تسليط الضوء على حياة شخص ما من يوم مولده إلى يوم وفاته، مع قراءة شخصيته على ضوء الأحداث التي مر بها[٥]، وبهذا يكون معنى السيرة النبوية في اللغة: "ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وآله وسلم من السنة، والطريقة، والهيئة، وأحاديث الأوائل"[٦].

ثانياً: تعريف السيرة النبوية اصطلاحاً: واضح من التعريف اللغوي للسيرة، أنها: السنة، التي عرّفها علماء الحديث النبوي الشريف بأنها: "كل ما أثر عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم من قول، أو فعل، أو تقرير، أو صفة خَلقية، أو خُلقية، أو سيرة، سواء كانت قبل البعثة، أو بعدها"[٧]، والسيرة تعني هنا أيضاً أخبار أحاديث الغزوات، والسرايا، إذاً المرجع فيها سيدنا محمد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم[٨].

في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٢٣، د.عبد الله البكري، العنف السياسي وأثره في المسؤولية الاجتماعية للشباب الإسلامي من وجهة نظر الشباب أنفسهم، ج ١، ص ٢٨٠-٢٨١.

١. انظر للتوسع: د.رضا أمين، معوقات مشاركة الشباب في برامج للمسؤولية الاجتماعية في العالم الإسلامي، ج ١، ص ٣٠٦، د.آمال المغامسي، معوقات مشاركة الشباب في المسؤولية الاجتماعية وسبل علاجها، ج١، ص٣٣٢.

٢. ابن منظور، لسان العرب، مادة سير.

٣. ابن فارس، معجم مقاييس اللغة، مادة سير.

٤. الجرجاني، كتاب التعريفات، ١٢٢.

٥. د. محمد برادة، دراسات إسبانية للسيرة النبوية، ص ٥.

٦. د. مهدي أحمد، القيم التربوية في السيرة النبوية، ص ١٢.

٧. د.عبد الرحمن الخميسي، معجم علوم الحديث النبوي، ص ١٢٨، د.محمد أبو النور، شذرات من علوم السنة، ٤٤، ٦٦، د.نور الدين عتر، منهج النقد في علوم الحديث، ص ٢٨-٢٩، د.صبحي الصالح، علوم الحديث ومصطلحه، ص ١١، د.محمد الخطيب، السنة قبل التدوين، ص ١٨، ٢٢، السيد سليمان الندوي، تحقيق معنى السنة وبيان الحاجة إليها، ص ٢٢.

٨. انظر للتوسع: أ.د.مهدي أحمد، القيم التربوية في السيرة النبوية، ص ١٣، المباركفوري، الرحيق المختوم، ص٩، د. محمد برادة، دراسات إسبانية للسيرة النبوية، ص ٦-٧، د.محمد أبو شهبة، السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة، ج ١، ص ٢٧-٢٨.

المبحث الأول: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في نشر المحبة في السيرة النبوية

إن من يقرأ سيرة الرسول صلى الله عليه وآله وسلم يلاحظ بوضوح أنه كان محباً، وودوداً، وبراً بالناس، ومقبلاً على الأمور التي تزرع المحبة بين أفراد المجتمع، وذلك في كل مواقفه صلى الله عليه وآله وسلم، وهذا ما سنبحثه في هذا المبحث.

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في المحبة بشكل عام في السيرة النبوية:

أكد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في أكثر من حديث على الحرص على مشاعر المسؤولية الاجتماعية في المحبة، ومنها: ما رواه أنس رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم قال: (لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه)[1]، وما رواه أبو هريرة رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم قال: (...وأحب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلماً...)[2]، وفي رواية أخرى: (...تكن مؤمناً...)[3]، فالمسؤولية الاجتماعية تصوغ المجتمع الإسلامي صياغة قوامها التآلف والتناصح والتآزر، والتضامن الاجتماعي؛ فيحب المسلم لأخيه

---

١. رواه البخاري في صحيحه في كتاب الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه، رقم الحديث ١٣، ج ١، ص ١٢، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الإيمان أن يحب لأخيه المسلم ما يحب لنفسه من الخير، رقم الحديث ٤٥، ج ١، ص ٦٧.

٢. رواه الترمذي في سننه في كتاب الزهد، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم الحديث ٢٣٠٥، ج٤، ص ٥٥١، واللفظ له، ورواه أحمد في مسنده، رقم الحديث ٨٠٩٥، ج ١٣، ص ٤٥٨- ٤٥٩، وقال الأرناؤوط في هامشه: "حديث جيد".

٣. رواه ابن ماجه في سننه في كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، ج ٢، ص ١٤١٠، رقم الحديث ٤٢١٧، واللفظ له، ورواه الطبراني في معجمه الصغير، باب الميم، رقم الحديث ١٠٥٧، ج ٢، ص٢١٨، والحديث إسناده حسن. انظر: البوصيري، مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه، ج ٤، ص٢٤٠.

المسلم ما يحب لنفسه[1]، وهذا الحديث تضمن كل جوانب المسؤولية الاجتماعية، وجمع كل عناصرها، ففيه استعلاء على الذات بروح الأخوة، وتجاوز للأنانية بإرادة الإيمان، ولو أن الناس عملوا بهذا الحديث لعم الخير، وصلح حال المجتمع[2]، وآية الإيمان الحق أن يرى الفرد نفسه عضواً في المجتمع، نفعه نفع لنفسه، وضره إضرار بها، فإذا أحس هذا الإحساس الصادق، وانطبع في نفسه رأى غيره كنفسه، بل رآه نفسه، فيحب له مثل ما يحب لنفسه، يحب لنفسه علماً واسعاً، وخلقاً طيباً، وعملاً صالحاً، ومكاناً عالياً، وشرفاً سامياً، يحب لها بيتاً جميلاً، ومالاً غزيراً، وضياعاً واسعة، وزوجاً صالحة، وبنين شهوداً، وركوباً ذلولاً، وأقرباء مخلصين، وإخواناً صالحين، وخدماً طائعين، فليحب لأخيه ابن أخيه- دنا أو علا- كل ذلك، أما أن يحب لنفسه أمراً ولايحبه لغيره، ويحسده أو يحقد عليه إن ناله؛ فذلك مناف للإيمان، بل ذلك بقية من آثار الكفران، وكما يحب لغيره ما يحب لنفسه؛ يبغض له ما يبغض لها، يبغض الفقر والذل، والاستعباد والانحطاط، والبلاء في المال أو النفس أو الأولاد، وغير ذلك من الأمور المكروهة، فليبغض لأخيه ما يبغض لنفسه وفاء بحق الإيمان[3]، وامتلاء القلب بالمحبة للناس بمثل ما تحبه لنفسك، حتى يشيع الأمن، والتعاون، والرخاء، والترابط، والوحدة، فتكون الأمة قوية، عزيزة، وهذا كله يساعد على سعادة المجتمع[4]، وهذا المبدأ العظيم الذي يغذيه الدافع الإيماني الذي أرساه النبي صلى الله عليه وآله وسلم يكفي للتحفيز على المسؤولية الاجتماعية بالعمل التطوعي بكل صورها وأشكالها[5].

---

١. نورمان بن عبد البكري، المسؤولية الاجتماعية: الإطار النظري، ج ١، ص٩، د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص١٦٥، د.علي الشهراني، أثر العقيدة الإسلامية في بناء المسؤولية الاجتماعية، ج ٢، ص ٥٦٤.

٢. د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٥٦.

٣. محمد الخولي، الأدب النبوي، ص ١٧.

٤. علي صبح، التصوير النبوي للقيم الخلقية والتشريعية في الحديث الشريف، ص ١٩.

٥. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٦٣، د.زكريا محمد عبد الهادي، الإيمان كدافعية لتشجيع العمل التطوعي، ص ٩.

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في المحبة بشكل خاص في السيرة النبوية:

تعددت مجالات المحبة التي وردت بالسيرة النبوية؛ كالتآخي في الله تعالى، والتزاور، والتواصل، والتبسم، والعفو والتسامح، ودفع السيئة بالحسنة، وإفشاء السلام، والدعوة إلى الطعام وإجابته، وحسن الظن، وستر المسلم، والنصح له، وعيادة المريض، والتواضع، وقبول الحق، ونصرة المظلوم، وتعليم الجاهل والرفق به، وتشميت العاطس، وشكر الناس، وغيرها، وتحذيره صلى الله عليه وآله وسلم من الأسباب والخصال التي تخل بالأخوة الإسلامية، والحقوق الاجتماعية وتقدح فيها، وسأقتصر على نموذج التآخي في الله تعالى؛ وهو ما رواه أنس رضي الله عنه قال: (قال المهاجرون: يا رسول الله، ما رأينا مثل قوم قدمنا عليهم أحسن مواساة في قليل، ولا أحسن بذلاً في كثير، لقد كفونا المؤونة، وأشركونا في المهنأ، حتى لقد حسبنا أن يذهبوا بالأجر كله قال: "لا، ما أثنيتم عليهم، ودعوتم الله لهم)[1]، فالمؤاخاة بين المهاجرين والأنصار ليس المقصود منها الارتفاق فقط، ولكن هناك آثاراً غير ذلك؛ وهي: عقد الألفة بين الضعيف والقوي، وتطهير النفس من العصبية الجاهلية، ونسيان الضغائن والأحقاد السابقة، وتشريع نظام يبني وحدة المسلمين، وقد أثمرت المؤاخاة ثمرتها، وربطت بالمودة على قلوب المؤمنين[2]، وبهذه المؤاخاة بين المهاجرين والأنصار استطاع النبي صلى الله عليه وآله وسلم وبفضل الله تعالى حل مشكلة من أكبر المشكلات الاجتماعية التي واجهته في المدينة المنورة بعد الهجرة[3]، وكان من مستلزمات هذه الأخوة المواساة في جميع مرافق الحياة، وقد أثمرت هذه

---

١. رواه أحمد في مسنده، ج ٢٠، ص ٣٦٠-٣٦١، رقم الحديث ١٣٠٧٥، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده صحيح على شرط الشيخين"، ورواه ابن أبي شيبة في مصنفه، ج ٥، ص ٣٢١، رقم الحديث ٢٦٥١٠، ورواه أبو يعلى في مسنده، ج ٦، ص ٤١٠، رقم الحديث ٣٧٧٣، ورواه البوصيري في إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، ج ٦، ص ٤٧٥، رقم الحديث ٦٢٢٩، وقال: "هذا إسناد رجاله ثقات".

٢. محمد أبو زهرة، خاتم النبيين صلى الله عليه وآله وسلم، ج ٢، ص ٤٩٣-٤٩٤

٣. محمد العواجي، أهمية دراسة السيرة النبوية والعناية بها في حياة المسلمين، ص ٢٩-٣٠.

الأخوة، واستشعر الجميع تلك المسؤولية الاجتماعية[1]، وهي أول خطوة قام بها النبي صلى الله عليه وآله وسلم على الصعيد الاجتماعي، عند بناء المجتمع المسلم بالمدينة المنورة، وهو توسيع لنطاق المكارمة من الأسرة الواحدة ليشمل أسرتين، وبالتالي يتسع المبدأ ليشمل المجتمع الإسلامي كله[2].

المبحث الثاني: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في التعاون في السيرة النبوية:

ترسيخ روح التعاون والتضامن بين المسلمين مبدأ إسلامي مهم؛ يتحمل مسؤوليته الفرد المسلم والجماعة المسلمة، وهذا المبحث يلقي الضوء على المسؤولية الاجتماعية في التعاون في سيرة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم.

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في التعاون بشكل عام في السيرة النبوية:

أكد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في أكثر من حديث على الحرص على مشاعر المسؤولية الاجتماعية في التعاون، ومنها: ما رواه النعمان بن بشير رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: (ترى المؤمنين في تراحمهم، وتوادهم، وتعاطفهم، كمثل الجسد، إذا اشتكى عضواً تداعى[3] له سائر جسده بالسهر والحمى)[4]، وهذا التوجيه النبوي يدل دلالة واضحة على حرص

---

١. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ٢٠٧-٢١٥، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦١٧، أ.عبد الناصر شيخ محمود، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٧٠٨-٧١٠.

٢. عبد الحكيم بوعيون، بيرحاء: مدخل لبناء نموذج تنموي تربوي إسلامي، ج ١، ص ٤٥٦.

٣. أي دعا بعضه بعضًا إلى المشاركة في ذلك. انظر: النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ١٦، ص١٤٠.

٤. رواه البخاري في صحيحه في كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، ج ٨، ص ١٠، رقم الحديث، ٦٠١١، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم، ج ٤، ص ١٩٩٩، رقم الحديث، ٢٥٨٦.

النبي صلى الله عليه وآله وسلم في إيجاد المجتمع المتكامل المتوازن، وفي تحقيق المسؤولية الاجتماعية بين أبناء المجتمع الواحد، ويصبح المؤمنون كالجسد الواحد(١)، وهي مسؤولية الفرد تجاه مجتمعه وأمته؛ من خلال تعاونه، واهتمامه بشؤونهم، وبذل النصح لهم، والمشي في حوائجهم(٢)، فالمسؤولية الاجتماعية تبنى على قاعدة المسؤولية الفردية الشخصية للفرد؛ فما المجتمع إلا مجموعة من الأفراد، وتداخل دوائر اهتمامهم وتشابكها يبني شبكة المجتمع وبنيانه، والمسؤولية الاجتماعية هي ما يحافظ على تماسكه وترابطه، ويكفي التشديد في هذا الحديث على تشبيه المؤمنين بالجسد الواحد؛ فهل هناك أرحم وأعطف من الجسد على نفسه؟ وكلمة "تداعى" تظهر أيضاً الاهتمام والانكفاء على تلك المشكلة المجتمعية لحلها من قبل باقي البناء المجتمعي(٣)، وكذلك فإن العمل التطوعي ظاهرة اجتماعية صحيحة تحقق الترابط والتآخي بين أفراد المجتمع المسلم؛ حتى يكونوا كالجسد الواحد(٤).

---

١. انظر للتوسع: نورمان بن عبد البكري، المسؤولية الاجتماعية: الإطار النظري، ج ١، ص ٩، ١١-١٣، د.عدنان العلبي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٣٦، د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٦٤-١٦٥، د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ٢٠٢، عبد الحكيم بوعيون، بيرحاء: مدخل لبناء نموذج تنموي تربوي إسلامي، ج ١، ص ٤٤٧، د.علي الشهراني، أثر العقيدة الإسلامية في بناء المسؤولية الاجتماعية، ج ٢، ص٥٦٣، ٥٧٠، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٣٩-٦٥٧.

٢. د.عصام عبد الشافي، المسؤولية الاجتماعية: قراءة في الأبعاد والدلالات التأصيلية، ج ١، ص ٥٠.

٣. مروة عرابي، المسؤولية الاجتماعية بين أفراد المجتمع والعمل الخيري، ج ١، ص ٩٢، ٩٥، ١١٠.

٤. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٦٣-٦٤، رندة زينو، العمل التطوعي في السنة النبوية: دراسة موضوعية، ص ٦٧، سلطان العيسى، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص٢٩٤، عبد الله النعيم، العمل الاجتماعي التطوعي مع التركيز على العمل التطوعي في المملكة العربية السعودية، ص ٣٣، مساعد اللحياني، التطوع في الدفاع المدني والحماية المدنية، ص ٣٨، د.عبد اللطيف بالطو، دور التعاون التطوعي في دعم العلاقة بين المنزل والمدرسة، ص ٤٥٨، محمد فضل، الخدمات التطوعية في المملكة العربية السعودية ودور أعضاء بيوت الشباب، ص ٤٩٧، د.أيمن

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في التعاون بشكل خاص في السيرة النبوية:

تعددت مجالات التعاون التي وردت بالسيرة النبوية؛ كتقديم المساعدة للمسافرين، وما يحتاجون إليه من إعانة، وتقديم القروض، أو إعارة الأشياء المنتجة، وإرشاد الضال إلى الطريق، وإغاثة الملهوف، وإنقاذ الغرقى، والهدمى، والحرقى، وغيرها، وسأقتصر على نموذج تقديم المساعدة للمسافرين، وما يحتاجون إليه من إعانة، فقد روى أبو هريرة رضي الله عنه قال: (قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: كل سلامى[1] من الناس عليه صدقة، كل يوم تطلع فيه الشمس، يعدل بين الاثنين صدقة، ويعين الرجل على دابته فيحمل عليها، أو يرفع عليها متاعه صدقة، والكلمة الطيبة صدقة، وكل خطوة يخطوها إلى الصلاة صدقة، ويميط الأذى عن الطريق صدقة)[2]، فإعانة الرجل على دابته ويدخل فيها كل أنواع المواصلات – بحمله عليها، أو برفع متاعه عليها، كان كأجر الصدقة[3]، وهذا كله يعتبر من مظاهر التكافل الاجتماعي المادي[4]، الذي يساهم إسهاماً فاعلاً في إسعاد المجتمع، وتحقيق التقدم والرفاهية له[5].

يعقوب و د.عبد الله السلمي، إدارة العمل التطوعي واستفادة المنظمات الخيرية التطوعية، ص ١٠٤، وليد السعدون و عبد الكريم الزهراني، العمل التطوعي في خدمات جمعية الهلال الأحمر السعودي، ص٦١٩، د.خالد الشطي، دراسة توثيقية للعمل التطوعي في دولة الكويت، ص ٥٣.

١. هي عظام الأصابع وسائر الكف ثم استعمل في جميع عظام البدن ومفاصله، وعددها في جسم الإنسان ستين وثلاثمائة مفصل. انظر: النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ٥، ص ٢٣٣.

٢. رواه البخاري في صحيحه في كتاب الجهاد والسير، باب من أخذ بالركاب ونحوه، ج ٤، ص ٥٦، رقم الحديث، ٢٩٨٩، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، ج ٢، ص ٦٩٩، رقم الحديث ١٠٠٩.

٣. انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٧٠-١٧١.

٤. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٩٤.

٥. د.علي الشهراني، أثر العقيدة الإسلامية في بناء المسؤولية الاجتماعية، ج ٢، ص ٥٦١، د.مصباح الله

المبحث الثالث: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في تحقيق العدل في السيرة النبوية

العدل: "هو إعطاء كل ذي حق حقه"، والحكم بالعدل بين الناس حكماً مطلقاً شاملاً؛ دون النظر إلى لون، أو جنس، أو قرابة، وأي صلة كانت من مصلحة أو منفعة، بل إعطاء كل ذي حق حقه، لا فرق بين أفراد المجتمع، فالضعيف قوي حتى يُعطى حقه، والقوي ضعيف حتى يُؤخذ الحق منه[١]، والعادل: "هو الذي يتبع أمر الله تعالى بوضع كل شيء في موضعه؛ من غير إفراط ولا تفريط"[٢].

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في العدل بشكل عام في السيرة النبوية:

روى عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: (إن المقسطين عند الله على منابر من نور، عن يمين الرحمن عز وجل، وكلتا يديه

عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦٠١، ...د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٤٨.

انظر للتوسع: د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٤٧-٥٠، د.محمد بخاري، الخدمات التطوعية في الكتاب والسنة، ص ١٠١، يوسف الحاطي و خالد عسيري، مشروعية الخدمة التطوعية في الكتاب والسنة ومثلها من سيرة السلف الصالح، ص ١٤٦-١٤٨، د.محمد القاضي، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص ١٥، ٢٠، ٢٥، د.إبراهيم البريكان، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص ١٨٩، ١٩٦، سلطان العيسى، الأعمال التطوعية في الإسلام، ٢٩٤، ٢٩٧، ٣٠٠، إحسان لافي، العمل التطوعي من منظور التربية الإسلامية، ص ٢٦-٢٧، ٧٣، د.زكريا عبد الهادي، الإيمان كدافعية لتشجيع العمل التطوعي، ص ١٠، د.محمود كسناوي، دور الأندية الرياضية في تقديم الخدمات التطوعية في المجال التربوي والثقافي والاجتماعي، ص ٣٤٦، د.خالد الشطي، دراسة توثيقية للعمل التطوعي في دولة الكويت، ص ٥٤-٥٥، ٧١، ٨٧-٨٨، ٩٦

١. د.محمد عبد الغني، العدالة الاجتماعية في ضوء الفكر الإسلامي المعاصر، ص ٦١-٦٢.

٢. ابن حجر العسقلاني، فتح الباري شرح صحيح البخاري، ج ١، ص ١٠٧.

يمين، الذين يعدلون في حكمهم وأهليهم وما ولّوا)[1]، ومعنى الحديث: أن هذا الفضل إنما هو لمن عدل فيما تقلده من خلافة، أو إمارة، أو قضاء، أو حسبة، أو نظر على يتيم، أو صدقة، أو وقف، وفيما يلزمه من حقوق أهله وعياله، ونحو ذلك[2]، ولو جاهد المسلم نفسه لتحقيق صفة العدل على نفسه ومع الناس؛ فإن كثيراً من المشاكل التي تحصل بين المسلمين سواء منها الفردية أو الجماعية ستزول وتحل بإذن الله؛ وذلك لأن سبب الانحراف عن الحق هو الظلم، والظلم علاجه العدل، والإنصاف، والقسط[3]، وعكس العدل الظلم، وقد جاءت أحاديث كثيرة في تحريم الظلم[4].

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في العدل بشكل خاص في السيرة النبوية:

تعددت مجالات العدل التي وردت بالسيرة النبوية؛ كالعدل بين الزوجات، والأبناء، والإصلاح بين الخصوم، والولاية، والقضاء، والشهادة، والميزان، ونحوها[5]، وسأقتصر على نموذج العدل بين الأبناء، فقد روى محمد بن النعمان بن بشير، (أن أباه رضي الله عنه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال: إني نحلت[6] ابني هذا غلاماً، فقال: أكل

---

١. رواه مسلم في صحيحه في كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل، وعقوبة الجائر، والحث على الرفق بالرعية، والنهي عن إدخال المشقة عليهم، ج ٣، ص ١٤٥٨، رقم الحديث ١٨٢٧.

٢. النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ١٢، ص ٢١٢.

٣. عبد العزيز السعد، وإذا قلتم فاعدلوا، ص ٢٦.

٤. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ٢١٣-٢١٤، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦١٤-٦١٥، د.عبد الله الخير، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٣٩-٦٤٠، ٦٤٩-٦٥٠.

٥. عبد العزيز بن ناصر السعد، وإذا قلتم فاعدلوا، ص ٢٦، د.محمد عبد الغني، العدالة الاجتماعية في ضوء الفكر الإسلامي المعاصر، ص ٦٣-٦٤، ٦٧-٦٨.

٦. النحلة: العطية على وجه الهبة. انظر: ابن الجوزي، كشف المشكل من حديث الصحيحين، ج ٢، ص ٢١١.

ولدك نحلت مثله، قال: لا، قال: فارجعه)[١]، وفي رواية بزيادة: فقال بعض هؤلاء المحدثين: "هذا جور"، وقال بعضهم: "هذا تلجئة[٢]، فأشهد على هذا غيري"، وقال مغيرة في حديثه: (أليس يسرك أن يكونوا لك في البر واللطف سواء؟ قال: نعم، قال: فأشهد على هذا غيري)، وذكر مجالد في حديثه: (إن لهم عليك من الحق أن تعدل بينهم، كما أن لك عليهم من الحق أن يبروك)[٣]، ويدل الحديث: أنه ينبغي أن يسوي بين أولاده في الهبة، ويهب لكل واحد منهم مثل الآخر، ولا يفضل، ويسوي بين الذكر والأنثى[٤]، ولذلك شدد النبي رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم على عدم التمييز بين الأبناء، والعدل بينهم، وأنه لم يشهد على ظلمهم[٥]، ورغم وجود المسؤوليات الكبيرة والكثيرة للنبي صلى الله عليه وآله وسلم لم تمنعه من الاهتمام بأمور الأفراد الحياتية الخاصة[٦].

---

١. رواه البخاري في صحيحه في كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب الهبة للولد، وإذا أعطى بعض ...ولده شيئاً لم يجز، حتى يعدل بينهم ويعطي الآخرين مثله، ولا يشهد عليه، ج ٣، ص ١٥٧- ١٥٨، رقم الحديث ٢٥٨٦، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، ج ٣، ص ١٢٤١، رقم الحديث ١٦٢٣.

٢. من الإلجاء، كأنه قد ألجأك إلى أن تأتي أمراً، باطنه خلاف ظاهره، وأحوجك إلى أن تفعل فعلاً تكرهه، وكان بشير رضي الله عنه قد أفرد ابنه النعمان رضي الله عنه بشيء دون إخوته، حملته عليه أمه. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ٤، ص ٢٣٢.

٣. رواه أحمد في مسنده، ج ٣٠، ص ٣٢٧-٣٢٨، رقم الحديث ١٨٣٧٨، وقال الأرناؤوط في هامشه: "حديث صحيح".

٤. النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ١١، ص ٦٦.

٥. انظر للتوسع: عبد الحكيم بوعيون، بيرحاء: مدخل لبناء نموذج تنموي تربوي إسلامي، ج ١، ص ٤٦٣

٦. د.حمدي شعيب، فقه الظواهر الدعوية في ضوء السنن الإلهية، ص ٧.

المبحث الرابع: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في تطبيق الوقف في السيرة النبوية

يعتبر الوقف واجهة للعمل الخيري الدائم والمستمر، وله دور كبير في مواجهة مشكلات المجتمع، وسد حاجاته، وعمل على ترابطه، وتماسكه، وتغذية شبكة العلاقات التراحمية داخل المجتمع، وتنميته، وترقيته في مواجهة التحديات التي تقابله، فكان الوقف من المجتمع وإليه، وهو لإعلاء الجماعة، وخروج الفرد من أنانيته إلى الإطار الأوسع؛ وهو الإطار الإنساني والمجتمعي[١].

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في الوقف بشكل عام في السيرة النبوية:

يعد الوقف من أعظم أعمال المسؤولية الاجتماعية وأجلّها، الذي يبقى أثره زمنًا طويلًا، وينتفع منه المسلمون على مر الأجيال والأزمان، ولقد ذكر التاريخ الإسلامي كثيرًا من الأوقاف التي تنافس المحسنون على اختلاف أقطارهم وعصورهم ومذاهبهم في إنشائها على جهات الخير الكثيرة، والتي ما يزال الكثير منها قائمًا حتى اليوم[٢]، وقد حض رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم على الوقف بكل صوره، فقد روى أبو هريرة رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، قال: (إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له)[٣]، فالوقف معونة مادية دائمة، فلو اتجه أغنياء المجتمع إلى هذا النوع من العمل الخيري؛ لاستفاد المحتاجون في المجتمع أيما فائدة، فالوقف صدقة جارية يؤجر فاعله عليه في الدنيا والآخرة[٤]، وقد شرعت السيرة النبوية الوقف، وجعلته من أفضل الأعمال[٥].

---

١. مروة عرابي، المسؤولية الاجتماعية بين أفراد المجتمع والعمل الخيري، ص ١، ص ١٠١- ١٠٤.

٢. إحسان لافي، العمل التطوعي من منظور التربية الإسلامية، ص ٥٨-٥٩.

٣. مسلم، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ج ٣، ص ١٢٥٥، رقم الحديث ١٦٣١.

٤. د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ١٦٨/١، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص ٧٥٥.

٥. د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٨٩.

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في الوقف بشكل خاص في السيرة النبوية:

روى ابن عمر رضي الله عنهما: (أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه أصاب أرضًا بخيبر، فأتى النبي صلى الله عليه وآله وسلم يستأمره فيها، فقال: يا رسول الله، إني أصبت أرضًا بخيبر، لم أصب مالًا قط أنفس عندي منه، فما تأمر به؟ قال: إن شئت حبست أصلها، وتصدقت بها، قال: فتصدق بها عمر رضي الله عنه، أنه لايباع، ولا يوهب، ولا يورث، وتصدق بها في الفقراء، وفي القربى، وفي الرقاب، وفي سبيل الله، وابن السبيل، والضيف، لا جناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف، ويطعم غير متمول[1]، قال: فحدثت به ابن سيرين، فقال: غير متأثل[2] مالًا)[3]، فالوقف نوعان: وقف خيري؛ وهو الأصل في الوقف، ووقف أهلي أو ذري، ويمكن الجمع بين النوعين[4].

المبحث الخامس: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في تحقيق التكافل في السيرة النبوية

التكافل الاجتماعي: هو ركيزة أساسية للمجتمع الإسلامي، وهو تعاون الجميع، وتوافر القوى وتلاقيها، للمحافظة على مصالح الأفراد، ودفع الضرر عن البناء الاجتماعي، وإقامته على أسس سليمة[5].

---

١. مال الرجل وتمول، إذا صار ذا مال. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ٤، ص ٣٧٣.

٢. أي غير جامع. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ١، ص ٢٣.

٣. رواه البخاري في صحيحه في كتاب الشروط، باب الشروط في الوقف، ج ٣، ص ١٩٨-١٩٩، رقم الحديث ٢٧٣٧، واللفظ له، و مسلم، كتاب الوصية، باب الوقف، ج ٣، ص ١٢٥٥، رقم الحديث ١٦٣٢.

٤. انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٦٧-١٦٨، عبد الحكيم بوعيون، بيرحاء: مدخل لبناء نموذج تنموي تربوي إسلامي، ج ١، ص ٤٣٣، ٤٥٥.

٥. انظر للتوسع: د.عدنان العلمي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٢٢-١٢٣، د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في التكافل الخدمي في السيرة النبوية:

حث رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم أفراد المجتمع المسلم على التكافل بأن يتعاونوا لقضاء حوائج بعضهم البعض، وتفريج كرب إخوانهم، وإدخال السرور عليهم، وعدّه النبي صلى الله عليه وآله وسلم من أفضل الأعمال؛ فقد روى ابن عمر رضي الله عنهما (أن رجلًا جاء إلى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، فقال: يا رسول الله، أي الناس أحب إلى الله؟ وأي الأعمال أحب إلى الله عز وجل؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: أحب الناس إلى الله أنفعهم، وأحب الأعمال إلى الله عز وجل؛ سرور تدخله على مسلم، أو تكشف عنه كربة، أو تقضي عنه دينًا، أو تطرد عنه جوعًا ولأن أمشي مع أخ لي في حاجة أحب إلي من أن أعتكف في المسجد - يعني مسجد المدينة - شهرًا، ومن كف غضبه ستر الله عورته، ومن كظم غيظًا ولو شاء أن يمضيه أمضاه ملأ الله عز وجل قلبه أمنًا يوم القيامة، ومن مشى مع أخيه المسلم في حاجة حتى أثبتها له؛ أثبت الله عز وجل قدمه على الصراط يوما تزل فيه الأقدام)[1]، يستدل بالحديث على أن من أحب الأعمال إلى الله تعالى أن نقوم بمساعدة أفراد المجتمع؛ وذلك لإسعادهم بكل أنواع التكافل الاجتماعي[2]، وذلك بالأخذ بأيدي

الاجتماعية، ج ١، ص ١٨٤-١٨٥، د.علي الشهراني، أثر العقيدة الإسلامية في بناء المسؤولية الاجتماعية، ج ٢، ص ٥٧٨، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص٧٤٥.

١. رواه الطبراني في معجمه الأوسط، ج ٦، ص ١٣٩، رقم الحديث ٦٠٢٦، واللفظ له، ورواه الحاكم في مستدركه عن ابن عباس رضي الله عنهما في كتاب الأدب، ج ٤، ص ٢٩٩-٣٠٠، رقم الحديث ٧٧٠٦، والحديث حسن لغيره. انظر: الألباني، صحيح الترغيب والترهيب، ج ٢، ص ٣٥٩، رقم الحديث ٢٦٢٣.

٢. انظر للتوسع: مروة عرابي، المسؤولية الاجتماعية بين أفراد المجتمع والعمل الخيري، ج ١، ص ١١٢-١١٣، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب

الضعفاء، وذوي الحاجة، فالفرد الواحد قوي بإخوانه، ضعيف بمفرده[١]، وهو تدريب عملي لكل أفراد المجتمع على تحمل مسؤولياتهم الاجتماعية في إيجاد الحلول الناجحة لمساعدة المكروبين والملهوفين في المجتمع، والكرب هي الشدائد العظيمة التي تصيب الإنسان في الدنيا، فالمسلم الذي يسعى للتخفيف من هذه المصائب على أخيه المسلم وإعانته مادياً ومعنوياً، جائزته أن الله تعالى ينفس عنه كربة من كرب يوم القيامة، وأين كرب الدنيا من كرب الآخرة؟[٢]، وهذه التوجيهات النبوية تحث وتشجع المسلم بالأجر الوافر في الآخرة، حتى وصل الأمر أن تكون تلك الخدمات المبذولة أفضل من كل أنواع العبادة الفردية؛ لأن ذلك عبادة يحصد ريعها المجتمع، ودعم لا محدود لقيم التكافل، وخاصة في قضاء حاجات الناس[٣]، وهذا كله يعتبر من مظاهر التكافل الاجتماعي المادي، ويدعو إلى قوة الأمة وترابطها، وتلاحم مشاعرها وعواطفها، وتساند أفرادها وجماعاتها[٤].

عليها، ج ٢، ص ٦٠٧-٦٠٩، ٦١١-٦١٣.

١. انظر للتوسع: د.عدنان العلمي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٣٦-١٣٧، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٤٢، ٦٦٥.

٢. انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٧٤-١٧٦، فيروز عبد العال، تجربة جمعية قلب كبير بمصر الحاصلة على لقب مبدع اجتماعي من مؤسسة أشوكا العالمية: تجربة نجاح في مجال المسؤولية الاجتماعية للشباب، ج ١، ص ٥١١، د.علي الشهراني، أثر العقيدة الإسلامية في بناء المسؤولية الاجتماعية، ج ٢، ص ٥٦١.

٣. انظر للتوسع: د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٣٦-٤٠، د.سناء عابد، المرأة والعمل التطوعي، ص ٥، د.حمدي حسن، تحديات العمل الخيري الإسلامي في إفريقيا، ص ٦٨، د.أيمن يعقوب و د.عبد الله السلمي، إدارة العمل التطوعي واستفادة المنظمات الخيرية التطوعية، ص ١٠٥، د.خالد الشطي، دراسة توثيقية للعمل التطوعي في دولة الكويت، ص ٩٥-٩٦.

٤. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٨١، ١٩٣-١٩٤.

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في كفالة الأيتام في السيرة النبوية:

قد جاءت التوجيهات النبوية تحث وتشجع المسلم بالأجر الوافر في الآخرة على كفالة الأيتام ورعايتهم، وإدخال السرور عليهم، ويعتبر ذلك من أهم صور التكافل الاجتماعي، ولا تقتصر رعايتهم على النواحي المادية؛ بل تشمل النواحي النفسية والتربوية لمن أصابه الذل والانكسار بذهاب والده الذي يلبي جميع احتياجاته؛ وذلك لإبعادهم عن التشرد والضياع، كإنشاء دور الأيتام والمدارس لهم، ونحو ذلك[1]؛ فقد روى أبو هريرة رضي الله عنه، قال: (قال رسول الله ﷺ: كافل اليتيم له أو لغيره، أنا وهو كهاتين في الجنة، وأشار مالك بالسبابة والوسطى)[2]، والحديث يدل على فضل الإحسان إلى الأيتام، وأن كفالتهم تكون بالقيام بأمورهم من نفقة وكسوة وتأديب وتربية، وغير ذلك، وهذه الفضيلة تحصل لمن كفله من مال نفسه أو من مال اليتيم بولاية شرعية، وسواء كان اليتيم قريبًا له، كجده وأمه وجدته وأخيه وأخته وعمه وخاله وعمته وخالته، وغيرهم من أقاربه، أم كان لغيره بأن يكون أجنبيًا لا قرابة له به[3]، ويبين المكانة الخاصة والمرتبة العالية التي ينالها المتكفلون الذين يعملون في مجال رعاية الأيتام، فقد

---

١. د.عدنان العلبي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص١٢٣، د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٦٣، د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ١٩٤-١٩٥، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٤١، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص ٧٢٩.

٢. رواه البخاري في كتاب الطلاق، باب اللعان، ج ٧، ص ٥٣، رقم الحديث ٥٣٠٤، ورواه مسلم في كتاب الزهد والرقائق، باب الإحسان إلى الأرملة والمسكين واليتيم، ج ٤، ص ٢٢٨٧، رقم الحديث ٢٩٨٣، واللفظ له.

٣. النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ١٨، ص ١١٣.

بشِّروا بالمنزلة القريبة من رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في الجنة، فيالها من منزلة، ويا لها من مكانة عظيمة[١].

المطلب الثالث: المسؤولية الاجتماعية في كفالة الأرامل والمساكين في السيرة النبوية:

ومن المسؤولية الاجتماعية رعاية الأرامل والمساكين، ولهذا نجد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يساوي في الأجر والمثوبة لمن يمد يد العون للأرامل الذين توفي عنهن أزواجهن، والمساكين؛ بالمجاهد، والصائم القائم[٢]؛ فقد روى أبو هريرة رضي الله عنه قال: (قال النبي صلى الله عليه وآله وسلم: الساعي[٣] على الأرملة[٤] والمسكين، كالمجاهد في سبيل الله، أو القائم الليل الصائم النهار)[٥]، فمن عجز عن الجهاد في سبيل الله، وعن قيام الليل

---

١. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ٦٨-٧١، إحسان محمد لافي، العمل التطوعي من منظور التربية الإسلامية، ٦٦-٦٧.

٢. انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٦٤، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦١٥-٦١٧، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٤١، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص ٧٣٠-٧٣٢، ٧٤٩.

٣. أي: الكاسب لهما العامل لمؤنتهما. انظر: محمد عبد الباقي، هامش صحيح مسلم، ج ٤، ص ٢٢٨٦

٤. هي من لا زوج لها سواء كانت تزوجت قبل ذلك أم لا، وقيل: هي التي فارقت زوجها، وسميت أرملة لما يحصل لها من الإرمال وهو الفقر وذهاب الزاد بفقد الزوج. انظر: محمد عبد الباقي، هامش صحيح مسلم، ج ٤، ص٢٢٨٦.

٥. رواه البخاري في صحيحه في كتاب النفقات، باب فضل النفقة على الأهل، ج ٧، ص ٦٢، رقم الحديث ٥٣٥٣، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الزهد والرقائق، باب الإحسان إلى الأرملة والمسكين واليتيم، ج ٤، ص ٢٢٨٦، رقم الحديث ٢٩٨٢.

وصيام النهار، فليعمل بهذا الحديث، وليسع على الأرامل والمساكين؛ ليحشر يوم القيامة في جملة المجاهدين في سبيل الله دون أن يخطو في ذلك خطوة، أو ينفق مالًا، أو يلقى عدوًا يخاف بلقائه، أو ليحشر في زمرة الصائمين والقائمين، وينال درجتهم وهو طاعم نهاره نائم ليله، فينبغي لكل مؤمن أن يحرص على هذه التجارة التي لا تبور، ويسعى على أرملة أو مسكين لوجه الله تعالى، فيربح في تجارته درجات المجاهدين، والصائمين، والقائمين من غير تعب ولا نصب، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء[1]، ويلحق بالأرملة والمسكين بعض الضعفاء من الناس؛ كالمسنين الذين لايستطيعون الكسب، ولا العمل بسبب الضعف والعجز[2].

المطلب الرابع: المسؤولية الاجتماعية في الإحسان إلى الجيران في السيرة النبوية:

حث رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم على تفقد الجيران؛ لما له أثر في ترسيخ الترابط الاجتماعي بين أفراد المجتمع الواحد، فرابطة الجوار من الروابط المهمة في بناء المجتمع المسلم، ولذلك كان للجار حقوقاً، سواء كان الجار مسلماً، أو غير مسلم، ومن العلماء من عمم حق الجوار؛ ليشمل: جار السكن، وزميل العمل، وصاحب السفر، وصديق الدراسة، ورفيق الطريق[3]؛ فعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: (قال رسول الله: ما آمن بي من

---

١. ابن بطال، شرح صحيح البخاري، ج ٩، ص ٢١٨.

٢. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٧١-٧٤، رندة زينو، العمل التطوعي في السنة النبوية: دراسة موضوعية، ص ١٨٦، د.محمد بخاري، الخدمات التطوعية في الكتاب والسنة، ص ٩٧، د.إبراهيم البريكان، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص ١٩٤، سلطان العيسى، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص ٢٩٤، إحسان لافي، العمل التطوعي من منظور التربية الإسلامية، ص ٧١، د.زكريا عبد الهادي، الإيمان كدافعية لتشجيع العمل التطوعي، ص ٩، عبد الله النعيم، العمل الاجتماعي التطوعي مع التركيز على العمل التطوعي في المملكة العربية السعودية، ص ٢٦، مصطفى الخرد، مشروعية ومكانة العمل التطوعي في الإسلام، انظر: موقع المركز الدولي للأبحاث والدراسات "مداد"، .www.medadcenter.com

٣. د.عدنان العلي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٢٣-١٢٤، د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية،

بات شبعانًا؛ وجاره جائع إلى جنبه وهو يعلم به)[1]، وفي لفظ آخر روته عائشة رضي الله عنها، (أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم قال: ليس بالمؤمن الذي يبيت شبعانًا، وجاره جائع إلى جنبه)[2]، وفي الحديث: دليل واضح على أنه يحرم على الجار الغني أن يدع جيرانه جائعين وهو يعلم، فينبغي عليه أن يقدم إليهم ما يدفعون به الجوع، وكذلك ما يكتسون به إن كانوا عراة، ونحو ذلك من الضروريات[3]، وهناك صور كثيرة للتكافل الاجتماعي كثيرة؛ كالوصية، والعارية، والهدية، والهبة، وإكرام الضيف، وابن السبيل، والعمال، والخدم، وكبار السن، والإصلاح بين الناس، وصلة الأرحام، والشفاعة الحسنة، وتأهيل المسجونين، ورعاية المعوّقين كالأعمى، والأصم، والأبكم، والمشلول، والعاجز، ونحوهم، وإطعام الجوعى، وسقيا العطشى، والتنفيس عن المدينين المعسرين[4].

ج ١، ص ١٨٨، ٢٠٣، د.مصباح الله عبد الباقي، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦٠٧، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٣٧-٦٣٨، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص ٧٣٣-٧٣٥.

١. رواه الطبراني في معجمه الكبير، ج ١، ص ٢٥٩، رقم الحديث ٧٥١، والحديث حسن. انظر: الهيثمي، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج ٨، ص ١٦٧، رقم الحديث ١٣٥٥٤، وقال: "رواه الطبراني، والبزار، وإسناد البزار حسن"، محمد ناصر الدين الألباني، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، ج ١، ص ٢٧٩-٢٨٠.

٢. الحاكم، المستدرك، كتاب البيوع، ج ٢، ص ١٥، رقم الحديث ٢١٦٦، والحديث صحيح. انظر: محمد ناصر الدين الألباني، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، ج ١، ص ٢٧٨-٢٧٩.

٣. محمد ناصر الدين الألباني، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، ج ١، ص ٢٨٠ د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٨١-٨٢، عبد الله النعيم، العمل الاجتماعي التطوعي مع التركيز على العمل التطوعي في المملكة العربية السعودية، ص ٢٦.

٤. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٩٠-١٩١، ١٩٥-٢٠٤، عبد الحكيم بوعيون، بيرحاء: مدخل لبناء نموذج

المبحث السادس: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في التأهيل المهني في السيرة النبوية

نلاحظ أهمية المسؤولية الاجتماعية في التأهيل المهني في السيرة النبوية، من خلال تدريب الصانع ليحسن مستوى أدائه، وكذلك تعليم الجاهل ومن ليس في يده صنعة، فقد يكون لنقص قدراته فيحتاج إلى تأهيل.

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في التأهيل المهني للصانع في السيرة النبوية:

يحتاج الصانع إلى تدريب مهني ليتحسن مستوى أدائه، ومثال ذلك: ما رواه أبو ذر رضي الله عنه، قال: (سألت النبي صلى الله عليه وآله وسلم: أي العمل أفضل؟ قال: إيمان بالله، وجهاد في سبيله، قلت: فأي الرقاب أفضل؟ قال: أعلاها ثمنًا، وأنفسها عند أهلها، قلت: فإن لم أفعل؟ قال: تعين صانعًا، أو تصنع لأخرق، قال: فإن لم أفعل؟ قال: تدع الناس من الشر، فإنها صدقة تصدق بها على نفسك)[1]، وفي رواية:

تنموي تربوي إسلامي، ج ١، ص ٤٦٢-٤٦٣، فيروز عبد العال، تجربة جمعية قلب كبير بمصر الحاصلة على لقب مبدع اجتماعي من مؤسسة أشوكا العالمية: تجربة نجاح في مجال المسؤولية الاجتماعية للشباب، ج ١، ص ٥١١، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٣٢-٦٣٧، ٦٤٠، ٦٤٣-٦٤٤، ٦٦٦، أ.عبد الناصر شيخ محمود، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٧٠٧، ٧٠٩، إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ص ٧٣٣، ٧٣٥-٧٣٨، ٧٤٠-٧٤٧، ٧٤٩، د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ٦٣-٨٦.

١. رواه البخاري في صحيحه في كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، ج ٣، ص ١٤٤، رقم الحديث ٢٥١٨، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ج ١، ص ٨٩، رقم الحديث ٨٤.

(تعين ضائعًا، أو تصنع لأخرق...)[١]، وفي رواية: (تعين ضعيفًا، أو تصنع لأخرق...)[٢]، ويدل الحديث برواياته على أن الصنعة ما به معاش الرجل، ويدخل فيه الحرفة والتجارة، والإعانة للصانع إنما تكون عندما لم يتم كسبه لعياله، أو ضعيفًا عاجزًا في صنعه[٣]، وكذلك ينبغي إعانة الضائع الذي ذا ضياع من فقر، أو عيال، أو حالة قصر عن القيام بها[٤]، والرواية الراجحة والصحيحة في الحديث؛ "تعين صانعًا"، وليس "تعين ضائعًا"[٥].

وجاء في رواية لأبي كثير السحيمي عن أبيه قال: (سألت أبا ذر رضي الله عنه، قلت: دلني على عمل إذا عمل العبد به دخل الجنة، قال: سألت عن ذلك رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال: يؤمن بالله، قال: فقلت: يا رسول الله، إن مع الإيمان عملًا، قال: يرضخ[٦] مما رزقه الله، قلت: وإن كان معدمًا لا شيء له، قال: يقول: معروفًا بلسانه، قال: قلت: وإن كان عييًا[٧] لا يبلغ عنه لسانه، قال: فيعين مغلوبًا، قلت: فإن كان ضعيفًا لا قدرة له، قال: فليصنع لأخرق، قلت: وإن كان أخرق: قال: فالتفت إلي وقال: ما تريد أن تدع في صاحبك شيئًا من الخير؛ فليدع الناس من

---

١. رواه أحمد في مسنده، ج ١٦، ص ٥١١، رقم الحديث ١٠٨٧٨، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده حسن، خليفة بن غالب صدوق حسن الحديث، وباقي رجاله ثقات رجال الشيخين"

٢. رواه ابن حبان في صحيحه في كتاب البر والإحسان، باب ما جاء في الطاعات وثوابها، ج ١٠، ص ١٤٨-١٤٩، رقم الحديث ٤٣١٠، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده قوي على شرط مسلم".

٣. الملا علي القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ٦، ص ٢٢١٤، رقم الحديث ٣٣٨٣

٤. ابن الجوزي، كشف المشكل من حديث الصحيحين، ج ٢، ص ٣٦٤.

٥. النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ج ٢، ص ٧٥-٧٦.

٦. أي يعطي. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ٢، ص ٢٢٨.

٧. أي عاجزًا. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ٣، ص ٣٣٤.

أذاه، فقلت: يا رسول الله، إن هذه كلمة تيسير، فقال صلى الله عليه وآله وسلم: والذي نفسي بيده، ما من عبد يعمل بخصلة منها يريد بها ما عند الله إلا أخذت بيده يوم القيامة حتى تدخله الجنة)[1]، فالتأهيل المهني للصانع هو من هدي النبي ﷺ في المسؤولية الاجتماعية[2]، وقد دل الحديث على فضل العمل على التدريب المهني للصانع وتأهيله، وأن ثوابه الجنة[3].

---

١. رواه ابن حبان في صحيحه في كتاب البر والإحسان، باب ما جاء في الطاعات وثوابها، ج ٢، ص٩٧، رقم الحديث ٣٧٣، وقال الأرناؤوط في هامشه: "أبو كثير السحيمي، ثقة من رجال مسلم، ووالده لم أتبينه، وفي رواية الحاكم: وكان يجالس أبا ذر ﷺ، وباقي السند رجاله ثقات رجال الصحيح"، ورواه الحاكم في مستدركه في كتاب الإيمان، ج ١، ص ١٣٢، رقم الحديث ٢١٢، وقال: "هذا حديث صحيح على شرط مسلم، فقد احتج في كتابه بأبي كثير الزبيدي واسمه يزيد بن عبد الرحمن بن أذينة وهو تابعي معروف، يقال له: أبو كثير الأعمى، وهذا الحديث لم يخرجاه"، ووافقه الذهبي في تلخيصه، ورواه الطبراني في معجمه الكبير، ج ٢، ص ١٥٦، رقم الحديث ١٦٥٠، وقال الهيثمي: "رواه الطبراني في الكبير، ورجاله ثقات، وقد تقدمت له طرق". انظر: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: له، ج ٣، ص ١٣٥، رقم الحديث ٤٧٤٤، والحديث صحيح. انظر: الألباني، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، ج ٦، ص ٣٧٠-٣٧١.

٢. د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٦٥.

٣. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ١٣٣-١٣٥، د.محمد بخاري، الخدمات التطوعية في الكتاب والسنة: مفهومها وأهميتها ومجالاتها، ص ٩٩، يوسف الحاطي وخالد عسيري، مشروعية الخدمة التطوعية في الكتاب والسنة ومثلها من سيرة السلف الصالح، ص ١٤٧، رندة زينو، العمل التطوعي في السنة النبوية: دراسة موضوعية، ص ٤٨-٥١، ١٩٠، د.محمد القاضي، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص١٥، ٢٣، د.خالد الشطي، دراسة توثيقية للعمل التطوعي في دولة الكويت، ص ٥٤، ٨٨، ٩٦.

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في تعليم الجاهل ومن ليس في يده صنعة في السيرة النبوية

قد يكون لدى بعض الأفراد نقص في القدرات فيحتاجون إلى تأهيل، ومثال ذلك: ما رواه أبو ذر رضي الله عنه، قال: (سألت النبي صلى الله عليه وآله وسلم أي العمل أفضل؟ قال: إيمان بالله، وجهاد في سبيله، قلت: فأي الرقاب أفضل؟ قال: أعلاها ثمنًا، وأنفسها عند أهلها، قلت: فإن لم أفعل؟ قال: تعين صانعًا، أو تصنع لأخرق، قال: فإن لم أفعل؟ قال: تدع الناس من الشر، فإنها صدقة تصدق بها على نفسك)[1]، وفي رواية: "تعين ضائعًا، أو تصنع لأخرق..."[2]، وفي رواية: "تعين ضعيفًا، أو تصنع لأخرق..."[3]، ويدل الحديث ورواياته على أن الصنعة ما به معاش الرجل، ويدخل فيه الحرفة والتجارة[4]، والأخرق يعني العامل الذي لا يستطيع عمل ما يحاوله، والخرق لا يكون إلا في اليدين، وهو الذي لا يحسن الصناعات[5]، أو الأخرق هو الجاهل بما يجب أن يعمله، ولم يكن في يديه صنعة يكتسب بها، أو لا يحسن عمله[6].

---

١. رواه البخاري في صحيحه في كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، ج ٣، ص ١٤٤، رقم الحديث ٢٥١٨، واللفظ له، ورواه مسلم في صحيحه في كتاب الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ج ١، ص ٨٩، رقم الحديث ٨٤.

٢. رواه أحمد في مسنده، ج ١٦، ص ٥١١، رقم الحديث ١٠٨٧٨، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده حسن، خليفة بن غالب صدوق حسن الحديث، وباقي رجاله ثقات رجال الشيخين".

٣. رواه ابن حبان في صحيحه في كتاب البر والإحسان، باب ما جاء في الطاعات وثوابها، ج ١٠، ص ١٤٨-١٤٩، رقم الحديث ٤٣١٠، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده قوي على شرط مسلم".

٤. الملا علي القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ٦، ص ٢٢١٤، رقم الحديث ٣٣٨٣

٥. ابن بطال، شرح صحيح البخاري، ج ٧، ص ٣٥.

٦. ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، ج ٢، ص ٢٦، العيني، عمدة القاري شرح صحيح البخاري، ج ١٣، ص ٨٠.

وجاء في رواية لأبي كثير السحيمي عن أبيه قال: (سألت أبا ذر رضي الله عنه، قلت: دلني على عمل إذا عمل العبد به دخل الجنة، قال: سألت عن ذلك رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال: يؤمن بالله، قال: فقلت: يا رسول الله، إن مع الإيمان عملًا، قال: يرضخ مما رزقه الله، قلت: وإن كان معدمًا لا شيء له، قال: يقول: معروفًا بلسانه، قال: قلت: وإن كان عييًا لا يبلغ عنه لسانه، قال: فيعين مغلوبًا، قلت: فإن كان ضعيفًا لا قدرة له، قال: فليصنع لأخرق، قلت: وإن كان أخرق: قال: فالتفت إلي وقال: ما تريد أن تدع في صاحبك شيئًا من الخير؛ فليدع الناس من أذاه، فقلت: يا رسول الله، إن هذه كلمة تيسير، فقال صلى الله عليه وآله وسلم: والذي نفسي بيده، ما من عبد يعمل بخصلة منها يريد بها ما عند الله إلا أخذت بيده يوم القيامة حتى تدخله الجنة)[1]، فتعليم الجاهل ومن ليس في يده صنعة هو من هدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في المسؤولية الاجتماعية[2]، وقد دل الحديث على فضل العمل على تعليم الجاهل، ومن لا صنعة له، وأن ثوابه الجنة[3].

---

١. سبق تخريجه فيما مضى.

٢. د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٦٥.

٣. د.محمد أسود، مجالات العمل التطوعي في السنة النبوية، ص ١٣٦-١٣٨، د.محمد بخاري، الخدمات التطوعية في الكتاب والسنة: مفهومها وأهميتها ومجالاتها، ص ٩٩، يوسف الحاطي و خالد عسيري، مشروعية الخدمة التطوعية في الكتاب والسنة ومثلها من سيرة السلف الصالح، ص ١٤٧، رندة زينو، العمل التطوعي في السنة النبوية: دراسة موضوعية، ص ٤٨-٥١، ١٩٠، د.محمد القاضي، الأعمال التطوعية في الإسلام، ص ١٥، ٢٣، د.خالد الشطي، دراسة توثيقية للعمل التطوعي في دولة الكويت، ص ٥٤، ٨٨، ٩٦.
انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ١٧٢-١٧٣، عبد الرحيم إدريس، المسؤولية الاجتماعية: الإطار النظري:

المبحث السابع: المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في العمل على حل مشكلات المجتمع في السيرة النبوية

هناك مشكلات اجتماعية تظهر في كثير من المجتمعات، كمشكلة البطالة، والتسول، والطلاق، والتشرد، والعنوسة، ونحوها، ونتناول هنا النموذج النبوي لحل المشكلات الاجتماعية كمشكلة الفقر، والإفلاس، والتخاصم، ومشكلات الشباب.

المطلب الأول: المسؤولية الاجتماعية في حل مشكلة الفقر في السيرة النبوية:

وذلك فيما رواه عبد الرحمن بن كعب بن مالك، عن رجل، من أصحاب النبي صلى الله عليه وآله وسلم: (... وترك بني النضير ودعاهم إلى أن يعاهدوه، فعاهدوه، فانصرف عنهم، وغدا على بني النضير بالكتائب، فقاتلهم حتى نزلوا على الجلاء، فجلت بنو النضير، واحتملوا ما أقلت الإبل من أمتعتهم، وأبواب بيوتهم، وخشبها، فكان نخل بني النضير لرسول الله صلى الله عليه وآله وسلم خاصة، أعطاه الله إياها وخصه بها، فقال: ﴿وَمَآ أَفَآءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْهُمْ فَمَآ أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ﴾[1]، يقول: بغير قتال، فأعطى النبي صلى الله عليه وآله وسلم أكثرها للمهاجرين، وقسمها بينهم، وقسم منها لرجلين من الأنصار، وكانا ذوي حاجة؛ لم يقسم لأحد من الأنصار غيرهما، وبقي منها صدقة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم التي في أيدي بني فاطمة رضي الله عنها)[2]، فهذه التوجيهات النبوية في حل مشكلة الفقر؛ تدل دلالة واضحة على حرص رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في إيجاد

برامج محاربة البطالة والفراغ، ج ١، ص ٤١٢، ٤٢٢.

١. سورة الحشر، ٦.

٢. رواه أبو داود في سننه في كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في خبر النضير، ج ٣، ص ١٥٦، رقم الحديث ٣٠٠٤، والحديث صحيح الإسناد. انظر: الألباني، صحيح سنن أبي داود، ج ٢، ص٢٥٠-٢٥١.

المجتمع المتكامل المتوازن، وفي تحقيق المسؤولية الاجتماعية بين أبناء المجتمع الواحد، حكاماً ومحكومين، أفراداً وجماعات، صغاراً وكباراً، رجالاً ونساء[١]، ويترتب على رعاية الفقراء والمساكين شعور الأغنياء بدورهم في حل مشكلات المجتمع المسلم، وشعور الفقراء بنجدة إخوانهم لهم، وتعاطفهم معهم، وبالتالي يتحقق التعاون بين أفراد المجتمع وسعادتهم، ولذلك اهتم النبي صلى الله عليه وآله وسلم بأبناء أمته، وتفقّد حال رعيته، وتتبّع أمورهم، وإيجاد الحلول لمعضلاتهم، وخاصة الفقر[٢]، وهذا كله يعتبر من مظاهر التكافل الاجتماعي المادي[٣].

المطلب الثاني: المسؤولية الاجتماعية في حل مشكلة الإفلاس في السيرة النبوية:

روى أبو سعيد الخدري رضي الله عنه حادثة وقعت في عهد النبي صلى الله عليه وآله وسلم فقال: (أصيب رجل في عهد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في ثمار ابتاعها، فكثر دينه، فقال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: تصدقوا عليه، فتصدق الناس عليه، فلم يبلغ ذلك وفاء دينه، فقال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم لغرمائه: خذوا ما وجدتم، وليس لكم إلا ذلك)[٤]، أي: ما وجدتم، والمعنى ليس لكم إلا أخذ ما وجدتم، والإمهال بمطالبة الباقي إلى الميسرة، والمعنى ليس لكم زجره وحبسه; لأنه ظهر إفلاسه، وإذا ثبت إفلاس الرجل لا يجوز حبسه بالدين بل يخلى ويمهل إلى أن يحصل له مال فيأخذه الغرماء، وليس معناه أنه ليس لكم إلا ما وجدتم وبطل ما بقي من ديونكم; لقول الله تعالى:

---

١. نورمان بن عبد البكري، المسؤولية الاجتماعية: الإطار النظري، ج ١، ص ١١-١٢.

٢. انظر للتوسع: د.عدنان العلي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج١، ص ١٢٤، ١٣٩-١٤٠، د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٦٤، د.عبد الله الحبر، المسؤولية الاجتماعية في السنة النبوية وهدي النبي صلى الله عليه وآله وسلم في تدريب الشباب على رعايتها، ج ٢، ص ٦٥٧.

٣. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٩٢.

٤. رواه مسلم في صحيحه في كتاب المساقاة، باب استحباب الوضع من الدين، ج ٣، ص ١٥٥٦، رقم الحديث ١١٩١.

﴿وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[١]، وهذا كله يعتبر من مظاهر التكافل الاجتماعي المادي[٢]، ومن صور الإفلاس؛ الجوائح التي تصيب الأموال فتذهبها؛ كالعواصف الشديدة، والزلازل، والفياضانات المدمرة، والكوارث، والحروب، والحرائق، ونحوها، وكلها تحتاج إلى مد يد العون والمساعدة لمن تصيبه جائحة في ماله؛ للتخفيف عنه[٣].

المطلب الثالث: المسؤولية الاجتماعية في حل مشكلة التخاصم في السيرة النبوية:

من الصور العملية في السيرة لحل مشكلة التخاصم، وتحمّل الفرد المسلم للمسؤولية الاجتماعية، اهتمام النبي صلى الله عليه وآله وسلم بأمته، وعنايته بمجتمعه، فقد شارك في وضع الحجر الأسود مكانه بالكعبة المشرفة قبل بعثته، ووضع لهم حلاً مرضياً، بعدما كادت تقع الحرب بين القبائل بمكة المكرمة[٤]:

فقد روى مجاهد، عن مولاه رضي الله عنه أنه حدثه، (أنه كان فيمن يبني الكعبة في الجاهلية؟... حتى بلغنا موضع الحجر[٥]، وما يرى الحجر أحد، فإذا هو وسط حجارتنا مثل رأس الرجل يكاد يتراءى منه وجه الرجل فقال بطن من قريش نحن نضعه، وقال آخرون نحن نضعه، فقالوا: اجعلوا بينكم حكماً، قالوا: أول رجل يطلع من الفج، فجاء النبي صلى الله عليه وآله وسلم فقالوا: أتاكم الأمين، فقالوا له، فوضعه في ثوب، ثم دعا

---

١. سورة البقرة، ٢٨٠. الملا علي القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ٦، ص ٢٢١٤، رقم الحديث ٣٣٨٣.

٢. انظر للتوسع: د.عبد الرحمن مدخلي، الأساليب النبوية في تربية شباب الأمة على تحمل المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٩٣-١٩٤.

٣. إبراهيم جوف، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ٢، ٧٤٧-٧٤٨.

٤. د.عدنان العلبي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ١٣٧-١٣٨

٥. المراد به الحجر الأسود. انظر: هامش مسند أحمد، ج ٢٤، ص ٢٦٣

بطونهم فأخذوا بنواحيه معه، فوضعه هو صلى الله عليه وآله وسلم)[1]، وبهذا وقى الله تعالى قريشاً شر حرب ربما أفنتهم، وقد ازداد النبي صلى الله عليه وآله وسلم بهذا منزلة فوق منزلته، وقدراً إلى قدر، وأصبح أحدوثة العرب في كل ناد ومجلس[2].

المطلب الرابع: المسؤولية الاجتماعية في حل مشكلات الشباب في السيرة النبوية:

إن من أهم المشكلات لدى الشباب هي مشكلة السيطرة على الغريزة الجنسية، وقد عالجها رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم بالحوار الهادئ، عبر الحجة والإقناع، والتشبيه والمقارنة، إلى أن تمّ العلاج، واستئصال هذا المرض[3]، فالشاب الذي يستطيع أن يدير أسرة بنجاح، ويتحمل مسؤولياتها، لقادر على تحمل مسؤولية مجتمع أكبر من الأسرة، ولذا تكون الأسرة هي المحطة الأولى للتدريب على المسؤولية الاجتماعية[4]، وكان صلى الله عليه وآله وسلم يبدي في حواراته معهم تفهمًا عميقًا لطبيعة المرحلة التي يعيشونها؛ والتي تتسم بالنضوج الجسمي،

---

١. رواه أحمد في مسنده، ج ٢٤، ص ٢٦١-٢٦٢، رقم الحديث ١٥٥٠٤، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده صحيح...، ومولى مجاهد، جعله الإمام أحمد السائب بن أبي السائب رضي الله عنه، وله شاهد حسن يتقوى به عند أبي داود الطيالسي"، ورواه أبو داود الطيالسي في مسنده، عن علي رضي الله عنه، ج١، ص ١٠٨، رقم الحديث ١١٥، وقال الهيثمي في حديث مجاهد عن مولاه رضي الله عنه: "رجاله رجال الصحيح غير هلال بن خباب، وهو ثقة"، وقال عن حديث علي رضي الله عنه: "رواه الطبراني في الأوسط، ورجاله رجال الصحيح غير حفص بن عمر الضرير، وخالد بن عرعرة، وكلاهما ثقة". انظر: الهيثمي، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج ٨، ص ٢٢٩، رقم الحديث ١٣٨٨٠-١٣٨٨١

٢. انظر للتوسع: د.محمد أبو شهبة، السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة، ج ١، ص ٢٢٨-٢٢٩، ج ٢، ص ٦١٢، ابن هشام، السيرة النبوية، ج ١، ص ١٩٦-١٩٧.

٣. انظر للتوسع: د.عدنان العلبي، منهجية القرآن والسنة في تدريب الشباب على المسؤولية الاجتماعية، ج ١، ص ١٤١-١٤٣، كسمبا سعيد، مجالات المسؤولية الاجتماعية لدى الشباب، ج ١، ص ٢٣٦.

٤. انظر للتوسع: د.غالب الشاويش، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ١، ص ١٧٣-١٧٣، أ.عبد الناصر شيخ محمود، مكانة المسؤولية الاجتماعية في الإسلام والمنهج النبوي في تدريب الشباب عليها، ج ٢، ص ٦٩٦-٦٩٨.

وتيقظ الغرائز، والحماس، والاندفاع؛ بسبب الطاقة الفياضة التي تغمرهم، وتدفعهم إلى التجديد والمغامرة، وقد مثّل رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم بالنسبة إليهم الحكمة، والتروي، والنظر البعيد في العواقب، وتوجيه هذه الطاقة المتدفقة إلى ميادين الإنتاج المختلفة؛ ليتم استغلالها فيما ينفع الشباب، وينفع مجتمعهم.

ومن نماذج حواره صلى الله عليه وآله وسلم مع الشباب لحل مشكلة السيطرة على الغريزة الجنسية: ذلك الحوار مع الشاب الذي طلب منه الإذن بالزنا، فعن أبي أمامة رضي الله عنه قال: (إن فتى شابًا أتى النبي صلى الله عليه وآله وسلم فقال: يا رسول الله، ائذن لي بالزنا، فأقبل القوم عليه فزجروه، وقالوا: مه، مه، فقال: أدنه، فدنا منه قريبًا، أتحبه لأمك؟ قال: لا، والله؛ جعلني الله فداءك، قال: ولا الناس يحبونه لأمهاتهم، قال: أفتحبه لابنتك؟ قال: لا والله، يا رسول الله، جعلني الله فداءك، قال: ولا الناس يحبونه لبناتهم، قال: أفتحبه لأختك؟ قال: لا والله، جعلني الله فداءك، قال: ولاالناس يحبونه لأخواتهم، قال: أفتحبه لعمتك؟ قال: لا والله، جعلني الله فداءك، قال: ولا الناس يحبونه لعماتهم، قال: أفتحبه لخالتك؟ قال: لا والله، جعلني الله فداءك، قال: ولا الناس يحبونه لخالاتهم، قال: فوضع يده عليه وقال: اللهم اغفر ذنبه، وطهر قلبه، وحصّن فرجه، فلم يكن بعد ذلك الفتى يلتفت إلى شيء)[1]، وهنا

---

١. رواه أحمد في مسنده، ج ٣٦، ص ٥٤٥، رقم الحديث ٢٢٢١١، وقال الأرناؤوط في هامشه: "إسناده صحيح، رجاله ثقات رجال الصحيح"، ورواه الطبراني في المعجم الكبير، ج ٨، ص١٦٢، رقم الحديث ٧٦٧٩، وقال الهيثمي: "رواه أحمد، والطبراني في الكبير، ورجاله رجال الصحيح". انظر: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: له، ج ١، ص ١٢٩، رقم الحديث ٥٤٣، وقال الألباني: "وهذا سند صحيح، رجاله كلهم ثقات رجال الصحيح". انظر: سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها: له، ج ١، ص ٧١٢-٧١٣، رقم الحديث ٣٧٠.

أقلع الشاب وتاب عن هذا الخُلُق الدنيء، عن طريق هذا الحوار النبوي، حسب المنهج العقلي ثم العاطفي، الذي يتضمن قياس معاملة الغير على معاملة النفس، وأن يترك الإنسان أذى الآخرين، ما دام لايريد أن يؤذيه الآخرون[1]، ثم وضع يده الشريفة على صدره ودعا له، وهذا يمثل أسمى صور الرفق فعلًا وقولًا[2].

خاتمة

الحمد لله الذي مَنَّ عليَّ بكتابة هذا البحث، وإنّي في ختامه أخلص إلى أهم النتائج حول المسؤولية الاجتماعية ودور الفرد في سعادة المجتمع في السيرة النبوية كما يلي:

١. تعريف المسؤولية الاجتماعية هو: "التزام الشخص كفرد من أفراد المجتمع بإصلاح عدة جوانب من الحياة الاجتماعية فيما بينهم على اتخاذ مواقف إيجابية، بدافع من مشاعر وجدانية عميقة، تنبع من أصل العقيدة الإسلامية؛ ليعيش الفرد في الجماعة، وتعيش الجماعة بمؤازرة الفرد، حيث يتعاون الجميع".

٢. تعريف السيرة النبوية هي نفس تعريف السنة النبوية: "كل ما أثر عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم من قول، أو فعل، أو تقرير، أو صفة خَلقية، أو خُلقية، أو سيرة، سواء كانت قبل البعثة، أو بعدها".

---

١. انظر للتوسع: د.محمد أسود، حوارات رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ودلالاتها، ص ٢٧-٢٩، د.محمد زرمان، ثقافة الحوار في السنة النبوية، ص ١٢٣-١٢٥، د.محمد الحمد، الحوار في السيرة النبوية، ص ١٧٢-١٧٦، د.سعيد المغامسي، التربية بالحوار مع الشباب وأثرها في تحصينهم من الانحرافات الفكرية والسلوكية، ص ٥٦-٥٨، موسى الفيفي، الحوار: أصوله وآدابه، وكيف نربي أبناءنا عليه؟، ص ٨٣-٨٤، د.جمال حسن، عوائق الحوار الإسلامي وسبل تذليلها، ص ٣٦٩، د.عبد الله السماعيل، أثر المناهج الدينية في نشر ثقافة الحوار، ص ٤٣٧.

٢. انظر للتوسع: عبد الرحمن النحلاوي، أصول التربية الإسلامية وأساليبها في البيت والمدرسة والمجتمع، ص ١٨٧، د.زهاء الدين عبيدات، القيادة والإدارة التربوية في الإسلام، ص ٩٢، د.سهيل الفتلاوي، تسوية المنازعات في عهد النبي محمد صلى الله عليه وآله وسلم، ص ٣٣، د.حصة الزيد، أهمية دراسة ...السيرة النبوية للمعلمين، ص ٣٦-٣٨، إبراهيم الدحيم، من أجل تربية أفضل، ص ١٢-١٣، د.محمد الشناوي، العملية الإرشادية، ص ٣٧-٣٩.

٣. تعددت مجالات المسؤولية الاجتماعية في المحبة في السيرة النبوية، فمنها التآخي في الله تعالى، والتزاور، والتواصل، والتبسم، والعفو والتسامح، ودفع السيئة بالحسنة، وإفشاء السلام، والدعوة إلى الطعام وإجابته، وحسن الظن، وستر المسلم، والنصح له، وعيادة المريض.. وقد اقتصرت على تناول نموذج التآخي في الله تعالى.

٤. تجلّت المسؤولية الاجتماعية في التعاون في السيرة النبوية من خلال تقديم المساعدة للمسافرين، وتقديم القروض، أو إرشاد الضال إلى الطريق، وإغاثة الملهوف وغيرها، وقداقتصرت على نموذج تقديم المساعدة للمسافرين، وما يحتاجون إليه من إعانة.

٥. تعددت مجالات المسؤولية الاجتماعية في العدل في السيرة النبوية، وكان أبرزها العدل بين الزوجات، والأبناء، والإصلاح بين الخصوم، والولاية، والقضاء، والشهادة، والميزان، ونحوها، وقد اقتصرت على نموذج العدل بين الأبناء.

٦. تمثلت المسؤولية الاجتماعية في الوقف في السيرة النبوية في الوقف على المساجد، والفقراء، والأقارب، ووجوه الخير، والماء الذي في البئر، والسلاح، والأشجار، والحيوانات، ونحوها، وقد اقتصرت على نموذج الوقف على الفقراء، والأقارب، ووجوه الخير.

٧. انقسمت المسؤولية الاجتماعية في التأهيل المهني إلى تدريب الصانع ليحسن مستوى أدائه، وكذلك تعليم الجاهل ومن ليس في يده صنعة، فقد يكون لنقص قدراته فيحتاج إلى تأهيل.

٨. أما المسؤولية الاجتماعية في حل مشكلات المجتمع في السيرة النبوية، فقد اقتصرت على مشكلة الفقر، والإفلاس، والتخاصم، ومشكلات الشباب.

توصيات

١. العمل على نشر ثقافة المسؤولية الاجتماعية بإدخالها في مناهج التعليم العام، ومفردات بعض المقررات الجامعية، وفي قضايا البحث العلمي بمؤسسات التعليم العالي، وتدريب وممارسة عملية للطلاب على المسؤولية الاجتماعية.

٢. دعوة الجامعات وأساتذتها كل حسب تخصصه لدراسة المسؤولية الاجتماعية من كل النواحي؛ الدينية، والتربوية، والنفسية، والاجتماعية، والثقافية، والاقتصادية، والسياسية،

والعسكرية، ونحوها، وتوجيه السلوكيات للمسؤولية الاجتماعية، وتنميتها والتعرف على القدرات البشرية لهذه المسؤولية وتنميتها.

٣. تكوين اتحاد إسلامي على مستوى العالم الإسلامي للتنسيق بين الجهات المتخصصة بالمسؤولية الاجتماعية الفردية والجماعية من أجل تحقيق أفضل النتائج بأيسر الطرق والأساليب، وتلافيًا لتكرار للجهود، ويكون ذلك من خلال منظمة التعاون الإسلامي بجدة، أو رابطة العالم الإسلامي بمكة المكرمة.

٤. إنشاء جمعيات ومؤسسات وأندية خاصة بالمسؤولية الاجتماعية، حتى تشرف على تدريب الأفراد، وتوزيع المهام عليهم، وتنظم طاقاتهم.

٥. تفعيل مؤسسات الإعلام الخيري من خلال إيجاد قناة فضائية متخصصة بالمسؤولية الاجتماعية، وكذلك مجلات وصحف متخصصة في هذا المجال، وفي الأعمال الإعلامية بالقدر الذي يؤكد فعاليتها في حب الخير للآخرين.

٦. إنشاء كراسي علمية في الجامعات متخصصة في المسؤولية الاجتماعية لإجراء المزيد من الدراسات والبحوث العلمية المتعلقة بالمسؤولية الاجتماعية وتطويرها؛ سواء أكان على مستوى الفرد أو الجماعة.

٧. إنشاء جائزة مالية سنوية خاصة للفائزين من الأفراد في كتابة الدراسات والبحوث المتصلة بالمسؤولية الاجتماعية، وكذلك لمؤسسات ذات مسؤولية اجتماعية.

٨. تأسيس مجلات ومواقع إلكترونية على شبكة المعلومات الدولية (الإنترنت)، تتخصص في المسؤولية الاجتماعية وما يتصل بها.

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين، وسبحان ربك رب العزة عما يصفون، وسلام على المرسلين، والحمد لله رب العالمين، وصلى الله وبارك على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

التنمية البشرية في ضوء السيرة النبوية

(التنمية القيادية والإدارية نموذجاً)

Personality Development in the Light of Al-Sīrah Al-Nabwiyyah: (Leadership and management development)

حامد أشرف همداني*

This research paper deals with the concept of development and the interest of the Prophet (SAW) about up-grading his companions' capabilities in all aspects. It consists of three parts with conclusion. The first part discusses the definition of human development and its most prominent characteristics in Islamic perspective. The second and third parts has focuse on leadership development and management. It also deals with the required skills for each .

This research paper concludes some important findings and recommendations for onward future career of every individual and society under the light of Sīrat Al-Nabi (SAW).

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيدنا ومولانا محمد خاتم النبيين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وبعد:

فقد عنيت السنة النبوية المطهرة بالعنصر البشري روحاً وفكراً، وعقيدة وسلوكاً، فكانت السامية بروحه، والموجهة لفكره وعقيدته، والمهذبة لأخلاقه وسلوكه. وعنيت بتنمية الإنسان تنمية شاملة؛ ليقوم بالعبء المناط به من استخلاف الأرض وإعمارها، مدركة ما به من مواهب وطاقات، حباه الرحمن إياها. وإن التنمية عملية مجتمعية، ومتطورة ومستمرة، تتحقق من خلال إنسان واع ومثقف ومتجدد على وفق متطلبات واحتياجات المجتمع الذي يعيش فيه وينتمي إليه.

ومن هنا آثرت الكتابة في موضوع **التنمية البشرية في ضوء السيرة النبوية: التنمية القيادية والإدارية نموذجاً** مبتغياً من خلاله إبراز مدى عناية السنة بالطاقات البشرية.

---

* أستاذ بقسم اللغة العربية وآدابها، جامعة بنجاب، لاهور (باكستان).

المبحث الأول: التنمية البشرية: مفهومها وخصائصها من منظور إسلامي

تعريف التنمية البشرية

التنمية من" نما"، وهي بمعنى الرفع والصعود والزيادة.

قال الخليل: "نما الشيء ينموا نُمُوّا، ونَمَى يَنمي نماءً أيضاً. وأنماه الله: رَفَعَهُ، وزاد فيه إنماء"[١].

وعرفها ابن منظور بأنها: تعني "الزيادة. نَمى يَنمي نمْيا ونمي ونماءً زاد وكثر، وأنميت الشيء ونَميته: جعلته ناميا"[٢].

ومن المعلوم أن مصطلح التنمية البشرية مصطلح معاصر تمّ تداوله في العقود الأخيرة من القرن العشرين، ولم يزل يحتاج إلى دراسات تبيّن معناها الكامل.

وقد عرّفه د .عبد الكريم بكار بقوله: "التنمية عبارة عن تحريك عملي مخطط لمجموعة من العمليات الاجتماعية والاقتصادية من خلال عقيدة معينة لتحقيق التغيير المستهدف بغية الانتقال من حالة غير مرغوب فيها إلى حالة مرغوب فيها"[٣].

وعرفها العسل بأنها: "العمليات المقصودة التي تسعى إلى إحداث النمو بصورة سريعة في إطار خطط مدروسة وفي حدود فترة زمنية معينة"[٤].

واشتملت تقارير التنمية البشرية للأمم المتحدة التي صدرت منذ مطلع التسعينيات على مفاهيم للتنمية البشرية، فأكدت أنها "عملية تهدف إلى زيادة القدرات المتاحة أمام الناس، ومع كون هذه الخيارات غير محدودة، فإنه يمكن تمييز ثلاثة خيارات مهمة تتمثل في ضرورة أن يحيا الناس حياة طويلة خالية من العلل، وأن يكتسبوا المعرفة، ويحصلوا على الموارد اللازمة

---

١. أبوعبد الرحمن خليل بن أحمد الفراهيدي، العين، تحقيق، مهدي المخزومي، وإبراهيم السامرائي، دار ومكتبة الهلال، مصر، ج ٨، ص ٣٨٤– ٣٨٥.

٢. ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بيروت، ٢٠٠٢م، ج ٥، ص ٣٩٨.

٣. عبد الكريم بكار، مدخل إلى التنمية المتكاملة، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى ١٩٩٩م، ص ٩.

٤. إبراهيم حسين العسل، التنمية في الفكر الإسلامي (مفاهيم – عطاءات- معوقات- أساليب)، مؤسسة مجد الجامعية للدراسات، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠٦م، ص ٢٣.

لتحقيق مستوى حياة كريمة"، ثم تمتدّ هذه الخيارات حتى تستوعب الحريات السياسية والاقتصادية والاجتماعية واحترام حقوق الإنسان[١].

خصائص التنمية الإسلامية

التنمية الإسلامية لها خصائص تميّزها عن غيرها من التنمية البشرية كافة، نجملها على الوجه الآتي:

١- **الربانية**: فهي موحى بها من الخالق، حيث إنها قائمة على ربط الإنسان بأهدافه العليا التي خلق من أجلها، وهي عمارة الأرض والاستخلاف بها لتحقيق مبدأ العبودية والارتقاء بالإنسان فكراً وروحاً وعقيدة[٢].

٢- **التغيير**: بالرغم من الثبات، فهناك التطور العام في الكون والمجتمعات في حدود تطور الفروع لا الأصول. لأن هذا في الحقيقة والواقع هو مجال التطور لا غيره. والإسلام يعترف بهذا ويدعو إليه من خلال دعوته إلى اكتشاف قوانين الحياة وتسخيرها لسعادته وتطوير حضارته. ومن أجل مراعاة التغيير في الحياة فسح المجال الكبير أمام العقل الإنساني أن يتحرك ويجتهد في داخل الضوابط العامة التي تشكل المحور الثابت المذكور من قبل[٣].

٣- **الشمول**: التنمية الإسلامية ليست منبثقة من تفكير الإنسان المحدود بالزمان والمكان والمصلحة، بل هي تستند إلى الله خالق الوجود، وبهذا لا يجد الإنسان نفسه تائهاً حائراً مقطوعاً عما حوله، بل يشعر براحة في قلبه وعقله. لأنه يرد خيوط الكون كلها إلى دوائر رقابته وهيمنته سبحانه وتعالى، ولايعطي الإنسان لعقله القاصر المجال اللانهائي في الحركة الكونية، كي لا يتيه ويضل فيلجأ إلى الخيال أو ينتهي إلى الحيرة والجنون، وبهذا كله ينتقل الإنسان إلى الشمولية؛ لأن الحياة وحركتها تتحول إلى سلسلة من العبادة المتلاحقة لله الخالق رب العالمين[٤].

---

١. أسامة العاني، المنظور الإسلامي للتنمية البشرية، مركز الإمارات للدراسات والبحوث الاستراتيجية، أبوظبي، ٢٠٠٢م، ص ١٣.

٢. سماح طه أحمد الغندور، التنمية البشرية في السنة النبوية، رسالة ماجستير في الحديث الشريف وعلومه من كلية أصول الدين في الجامعة الإسلامية بغزة ١٤٣٢هـ/ ٢٠١١م، ص ٥.

٣. محسن عبدالحميد، منهج التغيير في الإسلام، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٩٨٣م، ص ١٧، ٥٥.

٤. أسامة عبدالمجيد العاني، المنظور الإسلامي للتنمية البشرية، ص ٣٠-٣٦.

٤- التوازن: يتجلى هذا التوازن بين إرادة الله الخالقة للإنسان التي اقتضت خلقه للإنسان وقدرته على الفعل وبين إرادة الإنسان، كي يثبت اختياره، فتتحدد مسئوليته، فيرتفع التناقض المزعوم بين الإرادتين، وكذلك بين شعور الإنسان بالألم وبين شعوره بالجزاء الدنيوي والأخروي، وبين عبودية الإنسان المطلقة لله ومقام الإنسان الكريم في الكون، فيتحقق وجود الإنسان دون أن يتحول إلى إله[١]، فتأتي التنمية البشرية، فتحقق له التوازن بين نزعاته ورغباته من غير إفراط أو تفريط.

٥- الإيجابية: وتظهر إيجابية التنمية البشرية من حيث عناية الله بخلقه، وتدبيره للوجود كله بقدرة كاملة وعلم محيط، وهذه الخاصية تمد البشرية بالمشاعر الأخلاقية وموازينها كافة، وأما المحور الثاني لذلك فيتجسد عن إيجابية الحياة الإنسانية التي تتحرك لتحقق مدلولها في صورة عملية مؤثرة فاعلة في ذات نفسه وفي الكون من حوله، عناية الله ترعاه، ولذلك فإنه لا يعرف القعود والسلبية، بل يحاول التغيير المستمر ليحقق ذاته المؤمنة[٢].

٦- الواقعية: التنمية البشرية تتعامل مع الحقيقة الإنسانية متمثلة في الأفراد كما هم في عالم الواقع، ويتعامل مع طبيعة الإنسان، وطبيعة الظروف التي تحيط بحياته في الكون، في حدود فطرته واستعداداته وطاقاته وفضائله ورذائله وقوته وضعفه، فلا يسوء به الظن، ولا يحتقر دوره في الأرض، ولا يهدر قيمته ولا يرفعه إلى مقام الألوهية في صفة من صفاته[٣].

المبحث الثاني: التنمية القيادية في ضوء السيرة النبوية

القيادة ظاهرة اجتماعية لابد منها فلا تستقيم حياة المجتمع دون وجود قيادات في مستوياتها العليا أو الدنيا، فالوجود المشترك لشخصين أو أكثر يخلق نوعاً من الافتقار إلى من ينظم العلاقات القائمة بينهم.

ولقد قرر الإسلام هذه الحقيقة، بل جعلها من الواجبات المحتمات على الأمة عامة، حتى ولو كانت في مجموعة صغيرة جداً، قال النبي صلى الله عليه وسلم : (إذا خرج ثلاثة في سفر فليؤمروا أحدهم)[٤].

---

١. محمد قطب، مناهج التنمية الإسلامية، دار إحسان للنشر والتوزيع، طهران، الطبعة الثالثة ٢٠٠٣م، ص ٤١.
٢. عبد الرحمن توفيق، دور المنهج الإسلامي في تنمية الموارد البشرية، القدس، فلسطين، الطبعة الرابعة ٢٠٠٦م، ص ٥٦.
٣. عبد الله النور، تنمية الموارد البشرية، مجلة الإسلام اليوم، العدد ١٣، الرباط، ١٤١٦هـ/ ١٩٩٥م، ص ١٠٦.
٤. أبوداود سليمان بن الأشعث السجستاني، السنن، تحقيق، محمد محي الدين عبدالحميد، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون أحدهم، المكتبة العصرية، صيدا بيروت، لبنان رقم الحديث ٣٦٠٨.

ولقد كرم الإسلام القائد خير تكريم ووضعه في أسمى منزلة، فحق القائد في الطاعة وارد ومقرر في أكثر من آية في كتاب الله. قال تعالى: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾[1].

إن مهمة إيجاد القائد هي مهمة تربوية في المقام الأول، فالتربية المتكاملة مع حسن الانتقاء والاختيار، لهما الأثر الأكبر في صناعة القيادات ووضع الأساس واللبنة الأولى لانطلاقها. ولقد وضح ذلك جلياً في سيرة النبي صلى الله عليه وسلم حيث ربي النبي ﷺ جيلاً قائداً قاد العالم إلى ما فيه خير الدنيا والآخرة.

حيث قال: "إن هذا الجيل من كبار القادة الذي صاغه نبي الهدى عليه الصلاة والسلام، هو الذي نقل روح النبوة وهديها إلى كل أرجاء الوجود، فحكم بهذا الهدي وأضاء الوجود بهذا النور. إنه جيل قيادي قد عز نظيره في التاريخ، لأنه تربى بكتاب الله وآياته، وتربى برسول الله ﷺ ومصطفاه من خلقه. فمن عنده مثل هذا المعهد؟! ومن عنده مثل هذه المدرسة، فليطلع لنا قرنه؟!"[2].

وفيما يلي بيان لأهم ملامح التنمية القيادية في ضوء السيرة النبوية:

أولاً: إعداد القادة

إن عملية صناعة القائد، ووجود القائد الناجح على رأس عمل؛ أمر من الأهمية بمكان، بل هو محور رقي الأمة وتقدمها في ميادين شتى، والمنطلق الأول الذي تنطلق منه التنمية القيادية الصحيحة هو إعداد القادة، والعمل على صياغتهم، ومن يتتبع هدي النبي صلى الله عليه وسلم وتعاليمه الشريفة يجد أن النبي صلى الله عليه وسلم قد أولى اهتماماً كبيراً بتكوين الطليعة الأولى لقيادة هذه الأمة، وقد هيأ الله له من المعرفة والتسديد من استطاع به أن يغير معالم هذا العالم من خلال تربية متميزة.

---

١. سورة النساء، ٥٩.

٢. منير الغضبان ، التربية القيادية، دار الوفاء، المنصورة، ١٤١٨هـ/ ١٩٩٥م، ج ١، ص ٩.

ولقد كان منهج النبي صلى الله عليه وسلم في ذلك ينقسم في نظر الباحث إلى قسمين هما:

أ. **مرحلة التربية**

إن التربية المتزنة إذا صادفت محلاً قابلاً وأرضاً خصبة، أثمرت نتاجاً طيباً من قيادات واعية على مستوى عال من النضج. ولهذا كانت هذه المرحلة مبنية على المرحلة السابقة ومكملة لها، وكلما كان الانتقاء من عناصر متميزة كانت التربية متميزة، فقد قال صلى الله عليه وسلم: (الناس معادن، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام إذا فقهوا)[1].

وقد سلك النبي صلى الله عليه وسلم في هذا المجال الأساليب التالية:

١- التربية الجادة: لقد نهج النبي صلى الله عليه وسلم مع القادة التربية على معالي الأمور، فإن كان هناك موطن صبر فالقادة هم أول من يصبر، وإن كان موطن شجاعة فمن يربيهم على القيادة هو رأس الناس فيها. عن عتبة بن غزوان رضي الله عنه في حديث له: (ولقد رأيتُني سابع سبعة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما لنا طعام إلا ورق الشجر حتى قرحت أشداقنا، فالتقطت بردة فشققتها بيني وبين سعد بن مالك فاتزرت بنصفها واتزر سعد بنصفها، فما أصبح اليوم منا أحد إلا أصبح أميراً على مصر من الأمصار، وإني أعوذ بالله أن أكون في نفسي عظيماً وعند الله صغيرا[2])[3].

---

١. محمد بن إسماعيل البخاري، الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وأيامه والمشهور بالجامع الصحيح، تحقيق، محمد زهير الناصر، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى، ﴿لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ﴾، دار طوق النجاة، لبنان، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ، رقم الحديث ٣١٣١.

٢. مسلم بن الحجاج القشيري النيسابوري، الجامع الصحيح، تحقيق، محمد فؤاد عبدالباقي، كتاب الزهد والرقاق، دار إحياء التراث العربي، بيروت، رقم الحديث ٥٢٦٨.

٣. محمد أمحزون، منهج النبي صلى الله عليه وسلم في الدعوة من خلال السيرة الصحيحة، دار السلام، القاهرة، الطبعة الثالثة ٢٠٠٦م، ص ٢٢٤.

فإذا كانت التربية على الأزمات تلزمها بعض الصفات من صبر وإيمان وأخلاق، فالقائد لابد أن يكون أعلى من غيره في التربية على هذه الأمور. ولعل هناك من يرى أن القائد لا يحتاج إلى تربية خلقية وتزكية نفس بقدر ما يحتاج إلى مهارات في أساليب إدارية وطرق سياسة الناس؟!

ولكن قد يصح هذا المعنى في غير أمة الإسلام، ولهذا يقول أبوالحسن الندوي رحمه الله في خصائص القيادة في الإسلام: "إنهم لم يتولوا الحكم والقيادة بغير تربية خلقية وتزكية نفس، بخلاف غالب الأمم والأفراد ورجال الحكومة في الماضي والحاضر، بل مكثوا زمناً طويلاً تحت تربية محمد صلى الله عليه وسلم وإشرافه الدقيق يزكيهم ويؤدبهم ويأخذهم بالزهد والورع والعفاف والأمانة والإيثار على النفس، وخشية الله وعدم الاستشراف للإمارة والحرص عليه"[1].

٢- القدوة الحسنة في القيادة: من أهم واجبات القائد أن يكون قدوة حسنة لمرؤسيه، فيلزم نفسه قبل غيره بالسلوك القويم، والالتزام بما يتطلبه عمله من صبر وأمانة وتضحية، وأن يكون قوله وسلوكه مطابقاً لما أنزل الله التزاماً بقوله تعالى: ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾[2].

وكان الرسول صلى الله عليه وسلم هو القدوة الحسنة لكل قائد جاء، ولهذا كان عليه الصلاة والسلام لا يأمر صحابته بأمر حتى يكون أول العاملين به.

٣- استكشاف وتوجيه الإمكانات والقدرات القيادية: إن اكتشاف القيادات المهارية وتفعيلها مهمة ليست بالسهلة، بل تحتاج إلى مُربٍ صاحب نباهة وعلم بالرجال.

فهذا النبي صلى الله عليه وسلم يؤمّر عمرو بن العاص رضي الله عنه على جيش، فيه أبو بكر و عمر و أبو عبيدة، وفيه قادة الأنصار عباد بن بشر وسعد بن عبادة وأسيد بن حضير رضي الله عنهم، ولم يكن بين إسلامه وتوليه القيادة إلا خمسة أشهر[3].

---

١ أبوالحسن الندوي ، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، مكتبة نزار الباز، مكة المكرمة، ١٩٩٧م، ص ٨٣.

٢ سورة الصف، ٢-٣.

٣ منير الغضبان، عمرو بن العاص رضي الله عنه الأمير المجاهد، مركز بحوث الدراسات الإسلامية مكة المكرمة، ١٤٢١هـ/ ٢٠٠٠م، ص ١٧١.

ومن ذلك تكليفهم المهمات الصعبة والتي لا يستطيعها إلا من توفرت لديه صفات القيادة من الحنكة والشجاعة.

قال عبدالله بن أنيس رضي الله عنه: دعاني رسول الله صلى الله عليه وسلم: (إنه قد بلغني أن خالد بن سفيان بن نبيح يجمع لي الناس ليغزوني وهو بنخلة أو عرنة فأته فاقتله) فقلت: "يا رسول الله صفه لي حتى أعرفه"، قال: "آية ما بينك وبينه أنك إذا رأيته هبته وفرقت منه ووجدت له قشعريرة وذكرت الشيطان).

(قال عبدالله: وكنت لا أهاب الرجال، فقلت: "يا رسول الله ما فرقت من شيء قط." فقال: "بلى، آية ما بينك وبينه ذلك أن تجد له قشعريرة إذا رأيته، فأتاه فقتله[1])[2].

ولقد كان النبي صلى الله عليه وسلم يحرص كل الحرص في اختيار القادة أن يكلف كل قائد بالعمل الذي يناسبه، فقد يكون من ضمن من يقودهم من هو خير منه في كثير من النواحي، لكن حرص النبي صلى الله عليه وسلم على أن يجعل القائد هو من يملك القدرة على القيام على المهمة المحددة.

فعن ابن إسحاق قال: حدثنا يونس عن أبي معشر عن بعض مشيختهم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: (إني لأؤمر الرجل على القوم فيهم من هو خير منه؛ لأنه أيقظ عيناً وأبصر بالحرب)[3].

ويقول عبد الله بن عمر رضي الله عنهما: (بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم بعثاً، وأمّر عليهم أسامة بن زيد رضي الله عنه)[4]. وكان هذا منه صلى الله عليه وسلم في

---

١. أحمد بن حنبل، المسند، مسند المكيين، رقم الحديث ١٥٤٦٩.

٢. منير الغضبان، التربية القيادية، ص ٤٥٦.

٣. منير الغضبان، عمرو بن العاص رضي الله عنه الأمير المجاهد، ص ١٥١.

٤. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الأيمان والنذور، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "وأيم الله"، رقم الحديث ٦٦٢٧.

آخر حياته، حيث جهّز جيشاً، وأمّر عليه حبه وابن حبه أسامة بن زيد رضي الله عنهما، وكان عمره آنذاك ثماني عشرة سنة[١].

وقد كان هذا التأمير لأسامة رضي الله عنه على الجيش؛ انطلاقاً من مواقفه القتالية السابقة، ومن أشهرها ثباته العظيم يوم حنين.

٤- التعاهد بالتربية والتوجيه وقت القيادة: إن التكليف بالقيادة أو تصدر الشخص لها لا يعني الاستغناء عن التوجيه والتربية والتسديد.

فلقد كان منهج النبي صلى الله عليه وسلم مع صحابته رضي الله عنهم في توليتهم للقيادة أن يعلمهم ما ينفعهم قبل القيادة والتسديد لهم أثناءها، فهذا أسامة بن زيد رضي الله عنه يبعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى قتال قوم، يقول: (بعثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى الحرقة، فصبحنا القوم، فهزمناهم، ولحقت أنا ورجل من الأنصار رجلاً منهم، فلما غشيناه، قال: لا إله إلا الله، فكف الأنصاري، فطعنته برمحي حتى قتلته، فلما قدمنا بلغ النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: "يا أسامة، أقتلته بعد ما قال لا إله إلا الله"، قلت: كان متعوذاً، فما زال يكررها حتى تمنيت أني لم أكن أسلمت قبل ذلك اليوم)[٢].

٥- التربية على عدم التعلق بإمارة: يقول النبي صلى الله عليه وسلم: "إنا والله لا نولي على هذا العمل أحدا سأله، ولا أحداً حرص عليه"[٣].

وكان عليه الصلاة والسلام يربي أصحابه على التعلق بما عند الله، فكان صحابته رضوان الله عليهم لا يتهافتون على الوظائف والمناصب تهافت الفراش على الضوء، بل كانوا

---

١. أبو عبدالله محمد بن أحمد بن قايماز الذهبي، سير أعلام النبلاء، تحقيق، شعيب الأرناؤوط، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثالثة، ١٩٨٥م، ج ٤، ص ١٠٩.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب المغازي، باب بعث النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث ٣٩٣٥.

٣. مسلم، الجامع الصحيح، كتاب الإمارة، باب النهي عن طلب الإمارة والحرص عليها، رقم الحديث ٣٤٠٢.

يتدافعون في قبولها ويتحرجون من تقلدها، فضلاً عن أن يرشحوا أنفسهم وينشروا دعاية لها، وينفقوا الأموال سعياً وراءها، فإذا تولوا شيئاً من أمور الناس لم يعدوه مغنماً أو طعمة أو ثمناً لما أنفقوا من جهد أومال، بل عدّوه أمانة في عنقهم وامتحاناً من الله، ويعلمون أنهم موقوفون عند ربهم ومسؤولون عن الدقيق والجليل[1].

ب. مرحلة الانتقاء والاصطفاء

فكان عليه الصلاة والسلام يحرص على من توفرت فيهم الإمكانات الذاتية للقيادة، ويمكن تلخيص هذه الصفات في النقاط التالية:

١- الإمكانات العقلية: فالقائد لابد أن يكون لديه مقدرة على تحليل الأمور واتخاذ الرأي الصائب، ويتضح هذا المعنى من موقف خالد بن الوليد وعمرو بن العاص رضي الله عنهما بعد عمرة القضاء.

يقول عباس العقاد: "... وحسبك أن عمرة القضاء هذه قد جمعت في آثارها أسباب الإقناع بالدعوة المحمدية ما أقنع خالد بن الوليد وعمرو بن العاص رضي الله عنهما، وهما في رجاحة العقل والخلق مثلان متكافئان"[2].

وهذا الذي قاله عليه الصلاة والسلام لخالد بن الوليد رضي الله عنه عند ما جاءه مسلماً: (الحمد لله الذي هداك! قد كنت أرى لك عقلاً رجوت ألا يسلمك إلا إلى خير)[3].

٢- المكانة الاجتماعية وقوة التأثير: فهذا النبي صلى الله عليه وسلم يحرص على دعوة كبار قريش أشد الحرص، حتى كان ابن أم مكتوم رضي الله عنه يأتيه فينشغل عنه النبي صلى الله عليه وسلم فينزل عليه: ﴿عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ ۝١ أَن جَآءَهُ ٱلۡأَعۡمَىٰ ۝٢ وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ ۝٣ أَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكۡرَىٰٓ ۝٤﴾[4].

---

١. أبو الحسن الندوي، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص ٨٤.

٢. عباس محمود العقاد، عبقرية محمد، مؤسسة هنداوي للتعليم والثقافة، مصر، ٢٠١٢م، ص ٥٨.

٣. أبوالفداء إسماعيل بن عمر ابن كثير، السيرة النبوية (من البداية والنهاية لابن كثير)، تحقيق، مصطفى عبدالواحد، دار المعرفة للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، ١٣٩٥هـ/ ١٩٧٦م، ج ٣، ص ٤٥٣.

٤. سورة العبس، ١-٤.

ويتضح أيضاً من دعاء النبي صلى الله عليه وسلم، كما روى الإمام أحمد في فضائل الصحابة عن ابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: (اللهم أعز الإسلام بأحب هذين الرجلين إليك بأبي جهل أو بعمر بن الخطاب)[1]، فكان أحبهما إلى الله عمر بن الخطاب رضي الله عنه[2].

وهذه الصفة ضرورية تميّز سلوك القائد عند اتصاله مع الأفراد والجماعات وتعامله معهم، فيستطيع التأثير فيهم كي يوجّههم إلى ما فيه صلاحهم[3].

٣- القدرة الجسمية: إن عمل القائد يتطلب بذل الجهد والحركة، وقوة التحمل، والعمل لساعات متصلة تحت ظروف الضغط في كثير من الأحيان، والاحتفاظ بروح التحمس للعمل، والتماسك في المواقف العصيبة[4].

وهذا يقتضي سلامة الحواس من السمع والبصر واللسان، حتى لا تتعطل أو تنقص درجة الإتصال مع الغير، مع أن هذه القدرة الجسمية ليست على إطلاقها، فقد توجد لدى القائد من الحماسة والصدق والفهم والرغبة ما يعوض بعض هذا النقص.

ثانياً: تنمية مهارة اتخاذ القرار

من مستلزمات القيادة الناجحة، وعلاماتها الفارقة بين القائد النجيب وغيره، هي مدى قدرة هذا القائد على اتخاذ القرار المناسب، وفي الوقت المناسب.

ومن صور اهتمام النبي صلى الله عليه وسلم في تربية الصحابة الكرام قيادياً، أنِ اهتم بتنمية قدراتهم ومهاراتهم في اتخاذ القرار، فكان صلى الله عليه وسلم لا يتوانى أبداً عن مشاورة أصحابه

---

١. أحمد بن حنبل الشيباني، المسند، تحقيق، شعيب الأرنؤوط وعادل مرشد وآخرون، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠١م، مسند المكثرين من الصحابة، رقم الحديث ٥٤٣٧.

٢. علي الصلابي، السيرة النبوية عرض وقائع وتحليل أحداث، دار الإيمان الإسكندرية، ٢٠٠٢م، ص ٥٤٨.

٣. سيد عبدالحميد موسى، مفهوم القيادة في إطار العقيدة الإسلامية، سلسلة دعوة الحق، رابطة العالم الإسلامي، العدد ٥١، جمادى الآخرة، ١٤٠٦هـ، ص ٦٨. بتصرف.

٤. سيد عبدالحميد موسى، مفهوم القيادة في إطار العقيدة الإسلامية، ص ٦٩.

في دقّ الأمور وجلّها، منطلقاً في ذلك من قوله تعالى: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[1]. وذلك لما للمشاورة من أثر في تنمية قدراتهم على اتخاذ القرار، "حيث تنمو لديهم قوة الشخصية التي تؤهلهم للاضطلاع بحمل المسؤوليات والتبعات الملقاة عليهم"[2]، ومن فوائدها أيضاً تأليف قلوب أصحابه، وليقتدي به من بعده، وليستخرج بها منهم الرأي فيما لم ينزل فيه وحي"[3]، وبهذا تكون المشاورة بمثابة تدريبٍ عملي على مهارة اتخاذ القرار.

لقد أشعرت هذه المشاورات من النبي صلى الله عليه وسلم للصحابة رضي الله عنهم، أن القضية قضيتهم، والقرار قرارهم مما يجعلهم يدافعون عن أمرٍ قد اقتنعوا به، ويذبون عن مبدأ ملك قلوبهم وأفئدتهم، فيبذلون كل غالٍ ونفيسٍ في سبيل نصرته.

ثالثاً: تنمية تعزيز الثقة بالقادة

إن ثقة الجند بمن يقوده ويتولى أمره، يلعب دوراً مهماً في نجاح القائد، وثباته في موقعه، فوجود هذه الثقة يؤدّي إلى الرضى بقراراته، والاستجابة لمطالبه، وتطبيق تعليماته، وبانعدامها لايستقيم للقائد أمر بين أتباعه، فالقيادة إذًا أساس لاستقرار الأمة ونجاحها، وصلاح الأمة في صلاح القيادة، وفسادها في فسادها.

لهذا سعى النبي صلى الله عليه وسلم إلى تطبيق مبدأ تعزيز الثقة بالقادة بين أصحابه رضي الله عنهم، وتنميته عندهم بصورة أكبر، حيث أكّد صلى الله عليه وسلم على أهمية السمع والطاعة للقائد، بل جعلها ركناً ركيناً في قيام الأمر وتمامه، فيقول: (من أطاعني فقد أطاع الله، ومن عصاني فقد عصى الله، ومن أطاع أميري فقد أطاعني، ومن عصى أميري فقد عصاني)[4].

---

١. سورة آل عمران، ١٥٩.

٢. محمد أمحزون، منهج النبي صلى الله عليه وسلم في الدعوة من خلال السيرة الصحيحة، ص ١٥١.

٣. أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن تيمية الحراني، السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية، وزارة الأوقاف بالسعودية، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ، ص ١٢٦.

٤. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الأحكام، باب قول الله تعالى، ﴿أطيعوا الله والرسول...﴾، رقم الحديث ٧١٣٧.

وقد ألمح النبي صلى الله عليه وسلم في أكثر من موقف إلى أهلية أبي بكر رضي الله عنه بالخلافة من بعده، وعزز من ثقة الناس به. ويدل عليه قول النبي صلى الله عليه وسلم في قصة راعي الغنم: (فإني أومن به وأبوبكر وعمر)[1].

وتنتقل الإشارة من النبي صلى الله عليه وسلم من الكلام النظري إلى التطبيق العملي، حيث قام النبي صلى الله عليه وسلم بتفويض أبي بكر الصديق رضي الله عنه بكثيرٍ من الأمور، وإحالة الحكم له، لتعزيز الثقة به أكثر، فعن جبير بن مطعم رضي الله عنه قَال: أتت امرأة النبي صلى الله عليه وسلم فأمرها أن ترجع إليه قالت: أرأيت إن جئت ولم أجدك، كأنها تقول الموت، قال صلى الله عليه وسلم: (إن لم تجديني فأتي أبابكر)[2].

رابعاً: تفويض المهام والسلطات

لقد ظهرت المقدرةُ القياديةُ للرسول صلَّى الله عليه وسلَّم في مَجالاتٍ عِدَّة، منها مجال التخطيط والتنظيم للدعوة الإسلامية في المجتمع المكي والمجتمع المدني، وما قام به مِن المؤاخاة بين الأنصار والمهاجرين، وإبرامِ الاتِّفاقِيَّات والعهود مع غير المسلمين، وكذلك أسلوبه الفريد تجاه المؤلَّفة قلوبُهم وبذْله العطايا والصدقات؛ لجذبهم للإسلام، كما يتجلى أسلوبه القيادي في استقبالِه وُفودَ العرب وإكرامه لهم في سبيل إقناعهم وجذبهم للدعوة، وموقفه القيادي النبيل من صلح الحديبية، وما أظهره من اللِّين والتحمُّل والصبر في سبيل حقن الدِّماء؛ حيث كان لهذا الصلحِ المردودُ الطيب والإيجابي على الدعوة الإسلامية؛ حيث اختلط المشركون بالمسلمين، وتعرَّفوا على أسلوبِهم في الحياة، وعلى إيمانهم بقضيتهم وبرسولهم؛ مما دفع الكثيرَ من المشركين للدخول إلى الإسلام حتى قبل أن يتم فتح مكة.

ولقد كانت قيادةُ الرسول صلَّى الله عليه وسلَّم في تعيين الوُلاة في غايةِ الدقة؛ حيث يَختارهم من الأشخاص الذين يتمتَّعون بالخُلق القويم وسَعة العلم، وعلى درجة من الكفاءة والجدارة؛

---

١. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب فضائل أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، باب عمر، رقم الحديث ٣٦٩٠.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب المناقب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم، لو كنت متخذاً خليلاً، رقم الحديث ٣٦٥٩.

لهذا نجد أنَّ اختيارَ القادة في فجر الإسلام كان يقوم على الاستقامة والقدرة والنزاهة، وكما ذكر سابقًا، فالقيادة الإسلامية تقوم على مبدأ الشورى؛ التزامًا بقولِ الله تعالى: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[1]، ولقد طبَّق الرسول صلَّى الله عليه وسلَّم هذا المبدأ في إدارته وقيادته للمسلمين؛ حيث كان يقوم باستشارةِ أصحابه رضي الله عنهم من أهل الرأي والبصيرة.

وقد حرص أشد الحرص على تنشئة مجتمع يشعر بالمسؤولية الملقاة عليه، فينبه جميع أفراد المجتمع إلى دورهم المنشود في رعاية الأمانة الموكلة إليهم، واستشعار المسؤولية المنوطة بهم، فعن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: (ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته ...)[2]. فيمنح النبي صلى الله عليه وسلم جميع أفراد المجتمع المسلم صلاحيات كاملة في رعاية الأمانة، وتحمل المسؤولية، للنهوض بالمجتمع والرقي به نحو الكمال.

ومن نماذج تفويض المهام والسلطات تفويض النبي صلى الله عليه وسلم بعض الصحابة رضي الله عنهم بالقيام ببعض الأعمال، كتوكيلهم بإقامة الحد على ماعز رضي الله عنه[3]. واستخلافه ابن أم مكتوم رضي الله عنه على المدينة ليؤم الناس بالصلاة نيابة عنه[4]. ومنح النبي صلى الله عليه وسلم ثلاثة من قادة المسلمين (زيد وجعفر وعبدالله بن رواحة رضي الله عنهم) السلطة التامة في قيادة معركة من أهم معارك المسلمين، حتى نالوا شرف الشهادة في سبيل الله تعالى[5].

---

١. سورة الشورى، ٣٨.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الأحكام، باب قول الله تعالى، ﴿أطيعوا الله والرسول...﴾، رقم الحديث ٧١٣٨.

٣. مسلم بن الحجاج، الجامع الصحيح، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا، رقم الحديث ١٦٩٤

٤. أبوداود سليمان بن الأشعث، السنن، كتاب الصلاة، باب إمامة الأعمى، رقم الحديث ٥٩٥.

٥. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، رقم الحديث ١٢٤٦.

المبحث الثالث: التنمية الإدارية في ضوء السيرة النبوية

كان على الرسول صلى الله عليه وسلم أن "يربي جيلاً رائداً، يبقى نموذجاً بشرياً يقتدي به ويتأسى بمقوماته وتصرفاته بنو الإنسان على امتداد الزمان، لا لينهضوا بأمتهم العربية فحسب، بل وليجعلوا منها قائداً لركب البشرية وأمم الأرض مع استمرارية مسيرة الحياة"(١)، ولما كانت الإدارة عصب حياة الناس، وعموده الفقري الذي لا تستطيع السير إلا بوجوده، نجد أن النبي صلى الله عليه وسلم قد أولاها اهتماماً بالغاً، فأدارها بحنكة وذكاء أبهر العالم، فجعل ينمي هذه المهارات الإدارية في المسلمين، لينسجوا على نولها، ويسيروا على منوالها.

وفيما يلي بيان لأهم ملامح التنمية الإدارية في ضوء السيرة النبوية:

أولاً: تنمية مهارات فن كتابة التقارير والرسائل

كان الحفظ والاستظهار وسيلة نقل العلوم بين الناس في عصر صدر الإسلام، ثم كانت الفتوحات التي أدخلت الناس في دين الله أفواجاً، فاحتاجوا للكتابة والتقييد(٢)، فسعى النبي الأمّي صلى الله عليه وسلم لتعليم الصحابة رضي الله عنهم أسس حفظ هذا الدين بتوجيه الناس إلى تعلم الكتابة وتعليمها للغير، وقد عزز هذا المبدأ في قضية الأسرى يوم بدر حيث جعل رسول الله صلى الله عليه وسلم فداء من لم يكن لهم فداء أن يعلموا أولاد الأنصار الكتابة"(٣).

ومن أمثلة تنمية النبي صلى الله عليه وسلم مهارة الكتابة لدى الصحابة رضي الله عنهم: إذنه لبعضهم بالتدوين مع "أن الكتابة كانت في العرب قليلة"(٤)، كإذنه عليه الصلاة والسلام

---

١. أحمد رجب الأسمر، النبي المربي، إربد، دار الفرقان، الأردن، ٢٠٠١م، ص ٧١.

٢. نزار عبدالقادر ريان، الصحيحان أسانيدهما ونسخهما ومخطوطاتهما وطبعاتهما، مكتبة المنارة، غزة، فلسطين، ١٤٢١هـ، ص ٨٩.

٣. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ٢٢١٦.

٤. أبوعبد الله محمد بن سعد بن منيع، الطبقات الكبرى، تحقيق، إحسان عباس، دار صادر، بيروت، الطبعة الأولى، ١٩٦٨م، ج ٣، ص ٤٦٥.

لعبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما بكتابة كل ما يسمعه منه حيث قال: (اكتب فوالذي نفسي بيده ما خرج مني إلا حق)[1].

وتجاوز أمر الكتابة تدوين الكتاب والسنة إلى تعلم اللغات الأخرى وكتابة الرسائل بها، فقد أمر النبي صلى الله عليه وسلم بعض أصحابه بتعلم لغات غير العرب حتى يتم مكاتبة أقوام بلغاتها، فاتخاذ النبي صلى الله عليه وسلم كاتباً كزيد بن ثابت رضي الله عنه، يأمره بتعلم السريانية[2] من أجل المراسلات التي كانت بين النبي صلى الله عليه وسلم وغيره من العرب، وتوكيل هذه المهمة إليه، لدليل على تنمية كتابة الرسائل والتقارير، وضرورة اتخاذ كُتَّابٍ مهرة للقيام بهذه المهمة.

وينمي النبي صلى الله عليه وسلم في صحابته رضي الله عنهم مبدأ كتابة التقارير، للاستناد عليها في معرفة مصالح العباد وتفّقد حاجاتهم، يقول حذيفة رضي الله عنه: (كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أحصوا لي كم يلفظ الإسلام، قال فقلنا: يا رسول الله! أتخاف علينا ونحن ما بين الست مائة إلى السبع مائة؟ قال: إنكم لاتدرون لعلكم أن تبتلوا، قال: فابتلينا حتى جعل الرجل منا لا يصلي إلا سراً)[3]. وتوضح رواية البخاري معنى الإحصاء بالكتابة ولفظها: "اكتبوا لي من تلفظ بالإسلام من الناس"[4].

---

١. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ٦٥١٠.

٢. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ٢١٥٨٧.

٣. الجامع الصحيح، كتاب الإيمان، باب الاستمرار بالإيمان للخائف، رقم الحديث ١٤٩.

٤. الجامع الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب كتابة الإمام الناس، رقم الحديث ٣٠٦٠.

ثانياً: تنمية مهارات الاتصال بالجماهير

نهج النبي صلى الله عليه وسلم في تربية الأمة وإعدادها على أن تكون قادرة على حسن التواصل مع الآخرين، لما له من أهمية قصوى في بناء جسور الثقة، وتشييد دعائم التفاهم بين الأفراد، فضلاً عن انتقال المعارف والعلوم بينهم، إذ كيف يتم تبادل الخبرات واكتساب ما عند الناس من خير، إلا من خلال إجادة فن التواصل مع الجماهير، لتحقيق أسمى الغايات المنشودة من ورائه، وهو نشر الإسلام في الأمة، وتعريف الناس بمعالمه وتعاليمه.

وبتتبع سيرة النبي صلى الله عليه وسلم، والتماس منهاجه في تبليغ دعوة ربه، نرى أنه غرس عدة مبادئ مهمة لإنجاح التواصل مع الجماهير منها:

١- إظهار القبول والتقدير لمن تحدث: لقد أكّد النبي صلى الله عليه وسلم هذا المفهوم الراقي الذي ينادي به أهل التنمية البشرية المعاصرة في التعامل البديع مع الجماهير، فعن أنس بن مالك رضي الله عنه: (أن رجلا قال للنبي صلى الله عليه وسلم: إني أحب فلاناً في الله، قال: فأخبرته، قال: لا، قال: فأخبره، فقال: تعلم أني أحبك في الله، قال: فقال: فأحبك الذي أحببتني له)[١].

٢- جودة الإلقاء وحسن العرض وسلامة العبارة: فقد كان من هديه صلى الله عليه وسلم إذا تحدث بحديث تحدث بكلامٍ فصلٍ، يفهم معناه، ويدرك مغزاه وفحواه، ويتضح لسامعه مقصده ومرماه، فعن عائشة رضي الله عنها: (أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يحدث حديثاً لو عدّه العاد لأحصاه)[٢].

٣- حُسن الاستقبال: من علامات نجاح بناء جسور التواصل مع الجماهير حسن استقبالهم ببشاشة الوجه، وطلاقة المحيا، وطيب الكلام، ولين الجانب، فعن أَبِي ذَر رضي الله عنه قال: قال لي النبي صلى الله عليه وسلم: (لا تحقرن من المعروف شيئاً ولو أن تلقى أخاك بوجه طلق)[٣].

---

١. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ١٢٥١٤.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث ٣٥٦٧.

٣. مسلم بن الحجاج، الجامع الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، باب طلاقة الوجه عند اللقاء، رقم الحديث ٢٦٢٦.

٤- احترام الآخرين: جاءت السنة الغراء مراعية لأحوال المخاطبين، وملبية لحاجات نفوسهم، ودعت لهذا الخُلق قبل غيرها، فعن عبدالله رضي الله عنه قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: (إذا كنتم ثلاثة فلا يتناجى رجلان دون الآخر حتى تختلطوا بالناس من أجل أن يحزنه)[١].

فهذا التقدير الجليل، والاحترام الجم من النبي الإنسان صلى الله عليه وسلم للنفس البشرية، ساعياً من خلاله تربية الصحابة رضي الله عنهم عليه، وتنشئة طلائع الجيل المؤمن على التمسك به، لما يترتب عليه من تأليف للقلوب، وكسب للنفوس، وتطييب لها، مما يؤدّي إلى تعميق أواصر التواصل الفعال مع الأفراد والجماعات. وبانتفاء هذا الخلق في التعامل، ينتفي معه كل تواصل، فالنفس بطبيعتها وجبليتها تأبى التواصل مع من لا يحترم ولا يقدر ذاتيتها البشرية المكرمة.

ثالثاً: تنمية مهارات العمل كفريق

خلق الله تعالى الإنسان اجتماعياً بطبعه، فهو يفضل العمل داخل جماعة، ويسعد بالحياة معها، لهذا كان التوجيه القرآني له بالوحدة والاعتصام داخل الجماعة قال تعالى: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾[٢]، وجعلها ركيزة من ركائز فلاح الأمة وازدهارها. وفي قوله تعالى: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى﴾[٣] إشارة صريحة إلى أهمية العمل الجماعي، لما له من تأثير إيجابي على إنتاج الفرد داخل الجماعة يفوق إنتاجه بمفرده.

ولأهمية العمل كفريق جاءت السنة المشرفة تربي الأمة على هذا المبدأ الأصيل، وتزرع في النفوس هذا الخلق الجميل، حتى ربط بألزم أمور الإنسان في حياته، التي ترافقه في ليله ونهاره، ألا وهي صلاة الجماعة، فعنه صلى الله عليه وسلم قال: (صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ

---

١. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الاستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة ...، رقم الحديث ٦٢٩٠.

٢. سورة آل عمران، ١٠٣.

٣. سورة المائدة، ٢

بسبع وعشرين درجة)[١]. فمن أسرار صلاة الجامعة أنها تدريب عملي على العمل كفريق، وفي عبادة الصيام في رمضان كذلك تدريب عملي على العمل كفريق، إذ المسلمون جميعاً على قلب رجل واحد، يصومون لرؤية هلاله، ويفطرون لرؤيته.

ويعمق النبي صلى الله عليه وسلم أهمية العمل كفريق في نفوس صحابته فيشاركهم العمل في الخندق[٢].

رابعاً: تنمية مهارات التفاوض

أصبح التفاوض علماً مستقلاً بذاته له مدرسته ورواده، ذلك لدخوله في جميع مناحي الحياة الإنسانية، و"لضرورته وحتميته، سواء كان هذا التفاوض بين الأفراد أو الدول، فما من مطلب إلا وأصبحت تستدعي الضرورة أن يسير الإنسان في اتجاه التفاوض، ومن زاوية الحتمية فنجد أن علم التفاوض يستمد حتميته من كونه المخرج المؤدي إلى الحل أو العلاج للمشكلة المتنازع والمختلف بشأنها"[٣].

من أجل ذلك نجد أن السنة النبوية المشرفة قد رعت هذا العلم اهتماماً بالغاً، ووضعت له قواعد نجاحه وضوابطه؛ حيث هناك العديد من الخصائص والمواصفات التي يجب توفرها في رجل التفاوض المحترف حتى يستطيع أن يقوم بوظيفته التفاوضية خير قيام[٤]. ومن تلك القواعد والضوابط مايلي:

أ. القدرة على التحليل

يكمن تميز المفاوض بقدرته على تحليل المعطيات التي أمامه، والنتائج التي تنساق نتيجة لتفاوضه، وقد برزت هذه الصفة جلية في الصحابي الجليل جعفر بن أبي طالب رضي الله عنه. فظهرت

---

١. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، رقم الحديث ٦٤٥.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب الرجز في الحرب، رقم الحديث ٣٠٣٤.

٣. محسن أحمد الخضيري، تنمية المهارات التفاوضية، الدار المصرية اللبنانية، القاهرة، ١٩٩٣م، ص ١٩-٢٠.

٤. محسن أحمد الخضيري، تنمية المهارات التفاوضية، ص ١٩٥-٢٠٢.

في خطبته أمام النجاشي حسن تحليله للمعطيات، وبدت قدرته على توصيف العبارات من أجل الحصول على الهدف المنشود، من خلال حسن استغلالها، وتسخيره الجيد لها، فيعرض عليه محاسن دعوة الإسلام، وما امتازت به من قيمٍ رفيعة، وأخلاق نبيلة، وكيف كانت المنقذة لهم من فساد الجاهلية، وضلال الكفر، إذ بين له كيف كانوا يعيشون في تخبط وانحراف، ومقابل ذلك يعرض عليه ظلم الكفر وطغيانه المتمثل في قريش ومن شايعها من العرب.

ب. الذكاء والدهاء

من علامات النجاح للمفاوض أن يكون على قدرٍ عالٍ من الذكاء، وحذرٍ شديد في كل أمر يصدر منه، مع تمتع باليقظة الدائمة، والنباهة المستمرة.

لهذا كان النبي صلى الله عليه وسلم ينمي هذه الصفات في من يريد اختياره لهذا الأمر العظيم، فلذا نجد في براعة استهلال حوار الصحابي الجليل جعفر بن أبي طالب رضي الله عنه مع ملك الحبشة النجاشي بقوله: "أيها الملك"، دلالة ظاهرة على ما يتمتع به سيدنا جعفر رضي الله عنه من ذكاء في التعامل، لما لهذا الخطاب من أثرٍ في السيطرة على النفوس، والاستحواذ على المشاعر.

ج. حسن التصرّف وسرعته

عند التأمل في صنيع سيدنا عثمان بن عفان رضي الله عنه، عند ما أرسله النبي صلى الله عليه وسلم مفاوضاً قريشاً حين أرادت منع النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه رضي الله عنهم من دخول مكة، وقصد البيت الحرام لأداء العمرة. وإذا بقريش تساومه، فتعرض عليه عرضاً يمثل له ولغيره الشيء الكثير، فتقول له: "إن شئت أن تطوف بالبيت فطف به"، غير أن عثمان رضي الله عنه يجيب القوم بجواب يظهر فيه سرعة بديهته، وحسن تصرفه، فيرفض عرض قريش هذا، ويقول لهم: "ما كنت لأفعل حتى يطوف به رسول الله صلى الله عليه وسلم"[1].

---

١. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ٣٦.

ومن ذلك أيضاً حسن تصرف سيدنا جعفر بن أبي طالب رضي الله عنه مع النجاشي، إذ طلب منه الأخير أن يعرض عليه شيئاً من أمر الإسلام، وإذا بجعفرٍ رضي الله عنه ينتهز هذه الفرصة، ويتلو على أسماعهم مطلع سورة مريم فبكى النجاشي حتى أخضل لحيته وبكت أساقفته ... ثم قال النجاشي: "إن هذا والله والذي جاء به موسى ليخرج من مشكاةٍ واحدة"[1].

د. الاهتمام بالمظهر

اهتمت السنة النبوية كثيراً بالمظهر الخارجي للإنسان المسلم، لما فيها من إشباع لحاسة الجمال في نفسه، وليكون جميلاً في مظهره، متناسقاً في هندامه، بعيداً عن القذارة والإهمال، يقول الله تعالى: ﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ﴾[2].

من أجل ذلك نجد اهتمام النبي صلى الله عليه وسلم في هذا الباب، وتنميته في نفوس الصحابة، فيدعوهم إذا أرادوا إبراد بريد أو إرسال رسولٍ فليكن حسن الإسم، جميل الوجه، ويقول: "إذا أبردتم إلي بريداً فابعثوه حسن الوجه حسن الاسم"[3].

ويجسد النبي صلى الله عليه وسلم مفهوم تنمية المظهر الجمالي في الرسل والمفاوضين، فيرسل أجمل الصحابة دحية الكلبي رسولاً بكتاب منه صلى الله عليه وسلم إلى هرقل عظيم بُصرى[4].

---

١. أحمد بن حنبل، المسند، رقم الحديث ١٧٤٠.

٢. سورة الأعراف، ٣١.

٣. أبوبكر أحمد بن عمرو العتكي المعروف بالبزار، مسند البزار، تحقيق، محفوظ عبدالرحمن زين الله، وعادل سعد، وصبري عبدالخالق الشافعي، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٩٨٨-٢٠٠٩م، ج ١٠، ص ٢٧٨، والحديث حسن لشواهده. راجع للتفصيل السلسلة الصحيحة للألباني، ج ٣، ص ١٨٤.

٤. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب بدء الوحي، رقم الحديث ٧.

خامساً: تنمية مهارات إدارة الوقت

اهتم الإسلام اهتماماً كبيراً بالوقت، وحثّ على استثماره، وحسن إدارته، ولذا نجد أن النبي صلى الله عليه وسلم قد نبّه إلى أهميته، وعلّم أمته كيفية إدارته، وحسن توظيفه، وأرشدهم إلى استغلاله، حتى لا يقع المؤمن بما لا ينفع من الندم والحسرات، فقال صلى الله عليه وسلم: (نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس؛ الصحة والفراغ)[1].

ومن أهم العوامل المساعدة في إدارة الوقت وحسن تخطيطه التي نوه إليها النبيﷺ، مايلي:

أ. ترتيب الأولويات

فعن ابن عباس رضي الله عنهما: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لمعاذ بن جبل رضي الله عنه حين بعثه إلى اليمن: (إنك ستأتي قوماً أهل كتاب، فإذا جئتهم فادعهم إلى أن يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله، فإن هم أطاعوا لك بذلك فأخبرهم أن الله قد فرض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة، فإن هم أطاعوا لك بذلك فأخبرهم أن الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم فترد على فقرائهم، فإن هم أطاعوا لك بذلك فإياك وكرائم أموالهم، واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينه وبين الله حجاب)[2].

يظهر من الحديث مجموعة من التعليمات التي وجّهها النبي صلى الله عليه وسلم لسيدنا معاذ رضي الله عنه، منوهاً إياه أهمية العناصر التي يجب عليه أن يبدأ بها في تبليغ الدعوة الربانية،

---

١. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الرقاق، باب ما جاء في الرقاق وأن لا عيش إلا عيش الآخرة، رقم الحديث ٦٤١٢.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الزكاة، باب أخذ الصدقة من الأغنياء، رقم الحديث ٤٣٤٧.

فيركّز أول ما ركّز في أولويات دعوة أهل اليمن بأن يبدأ معهم ببوابة التوحيد، ومدخل الإسلام الذي لا يصح دخول إنسان إلا بهما، ألا وهما شهادة "لا إله إلا الله، محمد رسول الله"، فإن أجابوه فالصلاة، وإن أجابوه فالزكاة وهكذا.

قال الخطابي: "إن ذكر الصدقة أُخّر عن ذكر الصلاة؛ لأنها إنما تجب على قوم دون قوم، وأنها لا تكرّر تكرار الصلاة فهو حسن، وتمامه أن يقال: بدأ بالأهم فالأهم، وذلك من التلطف في الخطاب. لأنه لو طالبهم بالجميع في أول مرة لم يأمن النفرة"[١]. فعلى الإنسان أن يحدد أولوياته فيبدأ بالأهم فالأهم، ثم الذي يليه أهمية، ليوفر عليه الوقت والمجهود، فلا يضيع أوقاته سدى، من غير فائدة ترجى.

ب. الاستفادة من الأخطاء السابقة

من عناصر التخطيط السليم للوقت التي عنيت بها السنة المشرفة، وصيتها للمسلم أن يستفيد من أخطائه، ويتعلّم من تجاربه السابقة، يقول النبي صلى الله عليه وسلم: (لا يلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين)[٢]، ومعناه أن يكون "المؤمن حازماً حذراً، لا يؤتى من ناحية الغفلة، فيخدع مرة بعد أخرى"[٣]، فبقدر حذره واستفادته من تجاربه السابقة يوفر على نفسه أغلى الأوقات وأثمنها، ولا يهدرها بتكرار نفس التجارب غير المجدية.

أهم التوصيات والاقتراحات

- أن توجه الدراسات والبحوث إلى دراسة وتحليل السيرة النبوية واستخراج الأساليب التربوية فيما يخدم الأمة.
- إقامة لجان تهتم بالبرامج الخاصة بالقيادة، وتقوم بوضع خطط لإعداد قادة على مستوى من التربية.

---

١. أحمد بن علي ابن حجر العسقلاني، فتح الباري شرح الجامع الصحيح، رقمه، محمد فؤاد عبدالباقي، وصححه وراجعه، محب الدين الخطيب، دار المعرفة، بيروت، ١٣٧٩هـ، ج ٣، ص ٣٥٩.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الأدب، باب لا يلدغ المؤمن من جحر مرتين، رقم الحديث ٦١٣٣.

٣. ابن حجر، فتح الباري، ج ١٠، ص ٥٣٠.

- أوصي طلبة العلم والباحثين بتعميق الدراسات الموضوعية في السنة النبوية، سيما طرح المواضيع المستحدثة، لما تحمله من أصالة وتجديد في آن واحد.
- إنشاء مراكز متخصصة بخبراء ومدربين إسلاميين في جانب التنمية البشرية، للنهوض بقدرات شباب الأمة.
- إنشاء مراكز تدريبية تهتم بالتنمية البشرية، مستقاة مناهجها من السنة النبوية لشمولها جميع جوانب الحياة.
- التأصيل الشامل المفسر لقضية التنمية البشرية عند الرسول صلى الله عليه وسلم من خلال رسائل علمية في هذا الصدد.
- توضيح أن الرسالة المحمدية هي المنهج الأقوم للحياة الفاضلة التي تحقق السعادة لبني الإنسان.
- يجب أن يُدرك الشباب أهميتهم في مجتمعاتهم، وأن يمكّنوا من القيام بدورهم ومسؤولياتهم.
- لابد من اتخاذ وسائل واقعية وفعالة في سبيل تنمية مهارات القيادة والإدارة عند أفراد المجتمع.

الفقر والعدالة الاجتماعية في ضوء السنّة النّبوية

Care for the Poor and Social Justice in the Light of Sunnah of the Prophet (SAW)

عبد الحميد خرّوب*

نورة محمّد زواي**

Poverty is a universal social phenomenon. There are numerous factors behind it i.e. its ratio and proportion varies from one society to another. In spite of great developments in the modern contemporary world, the impact of this phenomenon has extended to the economic, political, cultural, social and environmental aspects. The poverty is not only restricted to provide the basic needs of bread, butter, clothing, shelter, health, education and other amenities, but it also covers every aspect which has been neglected by the society. The different governing systems have been tried to tackle with this problem and many theories have been emerged to resolve this issue and give affective solutions but no affective solution has been discovered so far.

Islam has a distinctive and realistic approach in tackling with the issue of poverty. Natural remedy neither scorns the poor nor describes them with negative descriptions. Indeed, its approach is integrated and balanced one to deal with this severe problem. Islam paves a way to achieve social justice and equitable distribution of wealth to fight against the poverty. It warns against the dire consequences of extreme poverty that may lead the human beings to violence. This research article shows some aspects of Prophet's care for the poor and needy people with visionary divine approach.

حاولت دول العالم على اختلاف أنظمة الحكم فيها، معالجة ظاهرة الفقر، وبرزت نظريات كثيرة لتفسير هذه الظّاهرة، وبيان الحلول النّاجعة لها، إلاّ أنّها وقفت أمامها عاجزة، ولم تستطع حتى التخفيف منها، فالفقر في الواقع ظاهرة اجتماعية عالمية تعدّدت أسبابها، واختلفت نسبتها من مجتمع لآخر، وقد شكّلت هذه الظاهرة تحديا كبيرا للمجتمع الإنساني، بجميع أشكاله وألوانه ونظمه، ومستوياته المعيشية، ومع ما تشهده الحياة المعاصرة من تطوّر كبير فقد تجاوز أثر هذه الظّاهرة النّاحية الاجتماعية إلى

* أستاذ مساعد بقسم الحديث وعلومه، الجامعة الإسلامية العالمية، إسلام آباد.

** أستاذة مساعدة بقسم الحديث وعلومه، الجامعة الإسلامية العالمية، إسلام آباد.

ولم يكن تخلّيه عن حياة النّعيم والبذخ لقلّة حيلة أو عجز عن نيلها أو ضعف عن بلوغها، بل كان زاهدا فيها، راغبا في الدّار الآخرة، طالبا رضا الله تعالى وثوابه، وقد جاءته الدّنيا طائعة بين يديه، فلم يلتفت إليها يقول عمر بن الخطّاب: (فدخلت على رسول اللهﷺ وهو مضطجع على حصير فجلست، فأدنى عليه إزاره، وليس عليه غيره، وإذا الحصير قد أثّر في جنبه فنظرت ببصري في خزانة رسول اللهﷺ فإذا أنا بقبضة من شعير نحو الصّاع ومثلها قرظا في ناحية الغرفة، وإذا أفيق[1] معلّق، فابتدرت عيناي، قال ما يبكيك يا ابن الخطّاب؟ قلت يا نبيّ الله وما لي لا أبكي وهذا الحصير قد أثّر في جنبك، وهذه خزانتك لا أرى فيها إلاّ ما أرى، وذاك قيصر وكسرى في الثّمار والأنهار وأنت رسول اللهﷺ وصفوته وهذه خزانتك، فقال ياابن الخطّاب ألا ترضى أن تكون لنا الآخرة ولهم الدّنيا؟ قلت بلى)[2]

١. القرظ: ورق السّلم يدبغ به"....وأفيق: هو الجلد الذي لم يتمّ دباغه"، انظر عبد الرّحمن بن علي ابن الجوزي، : د.عبدالمعطي أمين قلعجي، دار الكتب العلمية، بيروت ١٩٨٥م، ج ١، ص ٣١، ٩٩.

٢. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الطّلاق، باب في الإيلاء والاعتزال، ص ٦٣٤-٦٣٥، رقم الحديث ٣٦٩١،

قال (كنا عند انس وعنده خباز له فقال ما اكل النبيﷺ خبزا مرققا ولا شاة مسموطة[6] حتّى لقي الله)[7].

١. الخزيرة من النّخالة، والحريرة من اللّبن.
٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب البيوع، باب ذكر الخيّاط، ص ٣٣٦، رقم الحديث ٢٠٩٢.
٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الأطعمة، باب قطع اللّحم بالسكّين، ص ٩٦٥، رقم الحديث ٥٤٠٨.
٤. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الأيمان والنّذور، باب إذا حلف أن لا يأتدم فأكل تمرا، ص١١٥٤، رقم الحديث ٦٦٨٧.
٥. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الأشربة، باب لايعيب الطّعام، ص ٩٢٢، رقم الحديث ٥٣٨٣.
٦. المسموط: الذي ازيل شعره بالماء السّاخن وشوي بجلده.
٧. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الأطعمة، باب الخبز المرقّق، ص ٩٦٢، رقم الحديث ٥٣٨٥.

النّاحية الاقتصادية، والسياسية، والثقافية والبيئية، وهو يزداد انتشارا يوما بعد يوم، والهوّة بين الأغنياء والفقراء اتسعت دائرتها أكثر من ذي قبل، والحياة الكريمة للفرد، صارت حلما خياليا في ظلّ الأوضاع الرّاهنة.

ولا ينحصر الفقر في الفئة العاجزة عن توفير الاحتياجات الأساسية، من لقمة العيش، والتعليم، وفرص العمل..وغيرها بل يشمل كلّ فئة تمّ إهمالها في المجتمع، أو حرمت من الخدمات الاجتماعية.

وللإسلام منهجه الخاص المتميّز في معالجة الفقر، فهو بداية يقرّ بوجود الفقر والفقراء، ويعتبر ذلك ظاهرة قديمة منذ نشأة الحياة في هذا الكون، وواقعا لا يمكن إنكاره، ولا يزدري الفقراء، ولا يصفهم بأوصاف سلبية، بل إنّ منهجه منهج متكامل اجتمع فيه بتوازن دقيق، صواب وخير ما تتطلع إليه المناهج المختلفة لمعالجة هذه الظاهرة، وقد بيّن الإسلام المنهج السّليم في التعامل مع الفقر والفقراء، من خلال تشريعات جعلها فريضة على الأغنياء، ودعا جميع أفراد المجتمع للمشاركة في التنمية والتكافل الاجتماعي، ولو بالذكر والتبسّم، ورسم الطريق إلى تحقيق العدالة الاجتماعية وتوزيع الثروة توزيعا عادلا، وحرّم الفساد في الأرض، وعدّ صاحبه كمن يقتل النّاس جميعا، وحارب الفقر محاربة شديدة، وحذّر من عواقبه الوخيمة التي تدفع الإنسان إلى

وكان ينهى عن مظاهر التّرف فيقول: (لا تلبسوا الحرير ولا الدّيباج، ولا تشربوا في آنية الذّهب والفضّة ولا تأكلوا في صحافها، فإنها لهم في الدّنيا ولنا في الآخرة)[1].

إنّ ابتعاد الحكام عن مظاهر الترف والبذخ والإسراف في الإنفاق، والتزام الكفاف والعفاف، وترشيد المال، والاهتمام الجاد بمعالجة ظاهرة الفقر، يخفّف من شدّة وطأتها، ويمهّد الطريق لحلّها، ولو سعت الحكومات سعيا جادا لدراسة هذه الظاهرة دراسة علمية، وتظافرت جهود العلماء من شتى التخصصات، ووضعت البرامج الكفيلة للحدّ من انتشار هذه الظاهرة وعملت على تطبيقها على مرّ الزمن، لكانت الحياة أفضل مما عليه الآن.

وإذا ما أهديت إليه شاة مشوية فإنّه يتصدّق بها، فعن عائشة رضي الله عنها: (أنّهم ذبحوا شاة فقال النّبي ﷺ ما بقي منها؟ قالت ما بقي منها إلاّ كتفها، قال بقي كلّها غير كتفها)[1].

ومع ابتعاده عن مظاهر التّرف في المسكن والمأكل والملبس والمشرب وفي الحياة كلّها، فإنّه كلّما وقع مال في يده فرّقه على الفقراء والمحتاجين ولا يُبقي منه شيئا لنفسه، حتّى رهن درعه عند يهودي من أجل طعام اشتراه لأهله، فعن قتادة عن أنس قال: ولقد رهن النّبيﷺ درعا له بالمدينة عند يهودي وأخذ منه شعيرا لأهله، ولقد سمعته يقول ما أمسى عند آل محمّدﷺ صاع برّ ولا صاع حبّ وإنّ عنده لتسع نسوة"[2].

وكانت هذه الحياة صعبة على نسائه، فسألنه زيادة النّفقة يستعنّ بها على الشّدائد، ويوسعن بها على أنفسهنّ فأبى وخيّرهنّ بين الصّبر على حياة التقشّف أو يسرحوهنّ سراحا جميلا، فاخترنه جميعا رضوان الله عليهنّ.

ولقد استبعد بعضهم رهن النّبيﷺ درعه عند يهودي، ظنّا منهم أنّ هذا العمل فيه إساءة للرّسولﷺ، لأنّ الفارس الشّجاع لا ينبغي له أن يرهن درعه قط، ثمّ أليس في المسلمين مواس ومقرض حتّى يلجأ إلى يهودي، وقد ردّ عليهم ابن قتيبة فقال: "ونحن نقول إنّه ليس في هذا ما يستعظم بل ما ينكر لأنّ النّبيﷺ كان يؤثر على نفسه بأمواله ويفرّقها على المحقّين من أصحابه وعلى الفقراء والمساكين وفي النّوائب التي تنوب المسلمين، ولا يردّ سائلا ولا يعطي إذا وجد إلاّ كثيرا، ولايضع درهما فوق درهم ...وكيف يعلم المسلمون وأهل اليسار من صحابته بحاجته إلى الطّعام وهو لا يعلمهم ولاينشط في وقته ذلك إليهم، وقد نجد هذا بعينه في أنفسنا وأشباهنا من النّاس ونرى الرّجل يحتاج إلى الشّيء فلا ينشط فيه إلى ولده ولا إلى أهله ولا إلى جاره ويبيع العلق ويستقرض من الغريب والبعيد وإنّما رهن درعه عند يهودي لأنّ اليهود في عصره

---

١. الترمذي، جامع الترمذي، كتاب صفة القيامة والرّقائق والورع، باب قوله صلّى الله عليه وسلّم في الشّاة، ص ٥٦٣، رقم الحديث ٢٤٧٠، وقال: "هذا حديث صحيح"، وقال الشيخ الألباني: "صحيح". انظر الألباني، السّلسلة الصّحيحة، ج ٦، ص ٤٥، رقم الحديث ٢٥٤٤.

٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب البيوع، باب شراء النّبي بالنّسيئة، ص ٣٣٢، رقم الحديث ٢٠٦٩.

كانوا يبيعون الطّعام ولم يكن المسلمون يبيعونه لنهيه عن الاحتكار فما الذي أنكروه من هذا حتّى أظهروا التعجّب منه وحتّى رمى بعض المرقة الأعمش بالكذب من أجله"[1].

كثرة الصيام

الصيام عبادة تزكّي نفس الإنسان وتجعله موصولا بربّه، يحسّ بآلام الآخرين ويشاركهم ثقل الحياة عليهم وكانﷺ مع ابتعاده عن حياة التنعّم وصبره على الجوع، كثير الصّيام والوصال ويدخل أحيانا بيته فيسأل عن الطّعام، فإذا قيل له لايوجد قال: إنّي صائم، فعن عائشة أمّ المؤمنين قالت: **(دخل عليّ النّبيﷺذات يوم فقال: هل عندكم شيء؟فقلنا لا، قال فإنيّ إذن صائم، ثمّ أتانا يوما آخر فقلنا يارسول الله أهدي لنا حيس، فقال أرينيه فلقد أصبحت صائما فأكل)**[2]

ومع كثرة صيامهﷺفإنّه كان رحيما بأصحابه، يمنعهم من صيام الدّهر حتّى لايكون سببا في تضييع واجباتهم وحقوق غيرهم عليهم، كما في حديث عبد الله بن عمرو_ الذي كان يصوم يوما ويفطر يوما[3]، وبعد أن كبر _، شعر بالتّعب بما شدّد على نفسه من كثرة الصّيام، وأدرك قيمة نصيحة رسول اللهﷺله، وعلم مافيها من رحمة بنفسه فندم على عدم أخذه بها، فقال: لأن أكون قبلت الثّلاثة الأيّام التي قال رسول اللهﷺأحبّ إلي من أهلي ومالي"[4].

المطلب الثاني: تشريعات إلزامية

ومنها:

فريضة الزكاة:

لم يكتف الإسلام بالدّعوة إلى الصّدقة وإنّما جعلها فريضة تؤخذ من الأغنياء وتردّ على الفقراء، وجاءت آيات كثيرة في القرآن الكريم تأمر بالصّدقات وتعد أصحابها بالأجر الكبير عند الله عزّ وجلّ،

---

١. عبد الله بن مسلم بن قتيبة، تأويل مختلف الحديث، دار الجيل، بيروت، ١٩٧٢م، ص ١٤٣-١٤٦.
٢. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الصّيام، باب جواز صوم النّافلة بنية من النّهار، ص٤٧٠، رقم الحديث ٢٧١٥.
٣. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الصّيام، باب صوم الدّهر، ص ٣١٨، رقم الحديث ١٩٧٦.
٤. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الصّيام، باب النّهي عن صوم الدّهر، ص ٤٧٣، رقم الحديث ٢٧٢٩.

قال تعالى: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[1].

وأمر الله تعالى نبيّه ﷺ أن يأخذ الصّدقة من الأغنياء، ويوزّعها على الفقراء، فقال: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾[2].

فعمل النّبيّ ﷺ بأمر ربّه، وحين بعث معاذا إلى اليمن قال له: (إنّك تقدم على قوم أهل كتاب فليكن أوّل ما تدعوهم إليه عبادة الله عزّ وجلّ، فإذا عرفوا الله فأخبرهم أنّ الله فرض عليهم خمس صلوات في يومهم وليلتهم، فإذا فعلوا فأخبرهم أنّ الله قد فرض عليهم زكاة تؤخذ من أغنيائهم فتردّ على فقرائهم، فإذا أطاعوا بها فخذ منهم وتوقّ كرائم أموالهم)[3].

عقوبة مانعي الزكاة

لم يترك الإسلام مساعدة الفقراء شأنا فرديا اختياريا، بل جعل رعايتهم أمرا واجبا على الأفراد والدّولة، وتوعّد الأغنياء الذين يبخلون بأموالهم عن الفقراء، ويمتنعون من أداء مايتوجّب عليهم من الزّكاة، بعذاب شديد ينتظرهم يوم القيامة، فقال تعالى: ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾[4].

---

١. سورة التوبة، ٦٠.

٢. سورة التوبة، ١٠٣.

٣. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الإيمان، باب الدّعاء إلى الشّهادتين، ص٣٢، رقم الحديث ١٢٣.

٤. سورة آل عمران، ١٨٠.

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللهﷺ: (من آتاه الله مالا فلم يؤدّ زكاته مُثِّلَ له ماله يوم القيامة شجاعا أقرع له زبيبتان يُطَوَّقه يوم القيامة، ثمّ يأخذ بِلِهْزِمَتَيْهِ، يعني بشدقيه، ثمّ يقول أنا مالك أنا كنْزك، ثمّ تلا ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ...﴾)[1].

ومع هذا العذاب الشّديد الذي أعدّه الله لمن يفرّطون في إعانة الفقراء والمساكين ولايؤدون حقوق أموالهم، فقد قرّر الإسلام جملة عقوبات في حقّ مانعي الزكاة، منها:

١- تولي الحاكم أو ولي الأمر، أخذ الزكاة بسلطان الشّرع، وقوّة الدولة، ممّن تتوجّب عليهم إذا امتنعوا، قالﷺ: (من أعطاها مؤتجرا، فله أجرها، ومن منعها فإنّا آخذوها وشطر ماله، عزمة من عزمات ربّنا عزّ وجلّ، ليس لآل محمد منها شيء)[2].

٢- فرض ضريبة مالية على الممتنع عن أداء الزكاة-كما نصّ عليه الحديث السّابق- وذلك بأخذ شطر ماله تعزيرا وتأديبا له، وردعا لغيره.

٣- قتال مانعي الزكاة حتى يؤدّوها، قالﷺ: (أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله ويقيموا الصلاة ويؤتوا الزكاة فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحق الإسلام وحسابهم على الله)[3].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب إثم مانع الزّكاة، ص ٢٢٦، رقم الحديث ١٤٠٣.

٢. محمد بن إسحاق بن خزيمة، صحيح ابن خزيمة، تح: د/ محمد مصطفى الأعظمي، المكتب الإسلامي، بيروت، ١٩٧٠م، ج ٤، ص ١٨، وقال الأعظمي: "إسناده حسن"، ورواه أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ص٢٣٣، رقم الحديث ١٥٧٥، قال الشيخ الألباني: إسناده حسن، وصححه الحاكم والذهبي وابن الجارود ج ٥، ص ٢٩٦، انظر صحيح أبي داود، ط١، مؤسسة غراس للنشر والتوزيع، الكويت، ٢٠٠٢م، وقال شعيب الأرنؤوط: "إسناده حسن"، انظر المسند للإمام أحمد، مسند الكوفيين، حديث بهز بن حكيم عن أبيه عن جدّه، مؤسسة قرطبة، القاهرة، ج ٥، ص ٢.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الإيمان، باب ﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا

وهذا ما فعله الخليفة أبوبكر الصديق ـ حين تمرّدت بعض القبائل عن أداء الزكاة، وفرّقت بينها وبين الصّلاة، ورغم اعتراض بعض الصّحابة في بداية الأمر، فقد أصرّ على قتالهم، رافضا التفرقة بين العبادات البدنية والعبادات المالية[1].

وبذلك يكون الإسلام سبّاقا، إلى إعلان الحرب على الممتنعين عن أداء الزكاة ليحفظ حقّ الفقراء والمستحقّين، ويقيم العدالة الاجتماعية، وقد أبدى بعض مفكري الغرب، إعجابهم الشّديد بفريضة الزكاة، التي يلزم بها كلّ من توفرت فيه شروطها، دون محاباة لأيّ أحد، مهما كان مقامه، يقول"هل": "كانت فكرة المساواة الاجتماعية تجديدا تامّا أحدثه الإسلام، فأصبحت مساعدة الفقير والقيام بأمره واجبا مقدّسا، ولم يعد من شأن الأفراد أن يعطوا كيفما شاؤوا، وإنّما غدت الزّكاة تجبى إلى بيت المال وينفق منها على الفقراء"[2].

ويقول ول ديورانت: "لسنا نجد في التاريخ كلّه مصلحًا فرض على الأغنياء من الضرائب ما فرضه عليهم محمد لإعانة الفقراء.."[3].

حقّ الفقراء في الغنائم والفيء

إذا لم يتمكّن الفقراء والمساكين من مشاركة إخوانهم المجاهدين في الحرب لموانع مختلفة، فإنّ الله تعالى لم يسقط نصيبهم من الغنائم، بل جعل لرسوله خمس الغنائم ليوزّعها عليهم، وبقية الأخماس تقسّم على المقاتلين كلّ واحد ينال حقّه حسب بلائه في الحرب، قال تعالى: ﴿وَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾[4].

سَبِيلَهُمْ(التوبة ٥)﴾، ص٧، رقم الحديث ٢٥.

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنّة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ص ١٢٥٣، رقم الحديث ٧٢٨٤.

٢. ي. هل، الحضارة العربية، ترجمة د/إبراهيم أحمد العدوي و د/حسين مؤنس، مكتبة الأنجلو مصرية، ص ٢٤

٣. ول ديورانت: قصة الحضارة، ج ١٣، ص ٥٩

٤. سورة الأنفال، ٤١

وأمّا في حالة الفيء، وهو مايناله الجيش الإسلامي من غنائم بلا قتال، فإنّ الله تعالى قد جعل المال كلّه للرّسول يوزّعه على الفقراء والمساكين وغيرهم من الضّعفاء، قال تعالى: ﴿مَآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْ أَهْلِ ٱلْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ كَىْ لَا يَكُونَ دُولَةًۢ بَيْنَ ٱلْأَغْنِيَآءِ مِنكُمْ﴾[1].

زكاة الفطر

تعتبر زكاة الفطر من الصّدقات الإلزامية، ففي شهر رمضان المبارك من كلّ عام يخرج المسلم من ماله صدقة تسمّى زكاة الفطر، وهي واجبة على كلّ حُرّ وعبد، ذكرا كان أو أنثى، صغيرا أوكبيرا، والحكمة منها واضحة وهي تطهير الصّائم من اللّغو والرّفث، ورحمة بالفقراء والمساكين، فتدخل السّرور عليهم، وتبتهج نفوسهم، ويشعرون بفرحة العيد ويستغنون في هذا اليوم عن السّؤال، قال ابن عباس رضي الله عنهما: " فرض رسول اللهﷺ زكاة الفطر طهرة للصّائم من اللّغو والرّفث، وطعمة للمساكين من أدّاها قبل الصّلاة، فهي زكاة مقبولة، ومن أدّاها بعد الصّلاة، فهي صدقة من الصّدقات"[2].

المطلب الثالث: التكافل الاجتماعي

جعل الإسلام التكافل الاجتماعي من أهمّ العبادات،التي يتقرّب بها العبد لربّه وهو ليس مقصورا على الحاجات المادية فقط، بل يشمل الحاجات المعنوية أيضا، وعطاؤه لجميع الناس، على اختلاف أجناسهم، وأديانهم، ومن مظاهره:

النّصر بالضّعفاء

شجّع النّبيﷺ النّاس على مدّ يد العون للفقراء والمساكين، وجعل رعايتهم من أسباب الرّزق والنّصر، فقال: (هل تنصرون وترزقون إلاّ بضعفائكم)[3]، قال ابن البطّال: "وتأويل ذلك أنّ عبادة الضّعفاء ودعاءهم أشدّ إخلاصا وأكثر خشوعا لخلاء قلوبهم من التعلّق بزخرف

---

١. سورة الحشر، ٧

٢. أبو داود، السنن، كتاب الزّكاة، باب زكاة الفطر، ص ٢٣٨، رقم الحديث ١٦١١، وقال الألباني: "إسناده حسن، وحسّنه ابن قدامة والنّووي"، انظر الألباني، صحيح أبي داود، كتاب الزّكاة، باب زكاة الفطر، ج ٥، ص ٣١٧

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الجهاد والسّير، باب من استعان بالضّعفاء والصّالحين، ص ٤٧٨، رقم الحديث ٢٨٩٦

الدّنيا وزينتها، وصفاء ضمائرهم ممّا يقطعهم عن الله فجعلوا همّهم واحدًا، فزكت أعمالهم، وأجيب دعاؤهم"[1]، "وذلك من أعظم أسباب الرّزق والنّصر"[2].

التحذير من البخل

حذّر النّبي ﷺالذين يبخلون بأموالهم على النّاس ولاينفقونها على الفقراء والمحتاجين من مغبّة فعلهم الذي لايزيدهم إلاّ تلفا لأموالهم فقال صلّى الله عليه وسلّم: (ما من يوم يصبح العباد فيه إلاّ ملكان ينْزلان فيقول أحدهما اللّهم أعط منفقا خلفا، ويقول الآخر اللّهم أعط ممسكا تلفا)[3].

وضرب مثلا للمنفق والبخيل فقال: (مثل البخيل والمنفق كمثل رجلين عليهما جبّتان من حديد من ثدييّهما إلى تراقيهما، فأمّا المنفق فلا ينفق إلاّ سبغت أو وفرت على جلده حتّى تخفي بنانه وتعفو أثره وأمّا البخيل فلا يريد أن ينفق شيئا إلاّ لزقت كلّ حلقة مكانها، فهو يوسعها ولا تتّسع)[4].

النهي عن ادّخار لحوم الأضاحي

مرّ على النّاس عام شديد، جاع فيه الكثيرون منهم، فنهى النّبي ﷺعن ادّخار لحوم الأضاحي فوق ثلاث ليتصدّق النّاس بها على الفقراء والمساكين[5].

---

١. ابن بطّال القرطبي، شرح صحيح البخارى، تحقيق أبو تميم ياسر بن إبراهيم، مكتبة الرّشد، الرّياض، السّعودية، ط٢، ٢٠٠٣م، ج ٥، ص ٩٠.

٢. الإمام الحافظ زين الدّين عبد الرّؤوف المنّاوي، التيسير بشرح الجامع الصّغير، مكتبة الإمام الشّافعي، الرّياض، ط٣، ١٩٨٨م، ج ٢، ص ٩٢٧.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب قول الله تعال: ﴿فأمّا من أعطى واتّقى...﴾، ص٢٣٣، رقم الحديث ١٤٤٢.

٤. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب مثل البخيل والمتصدّق، ص ٢٣٣، رقم الحديث ١٤٤٣.

٥. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب الاستعفاف، ص٢٣٩، رقم الحديث ١٤٧٢.

رعاية الفقراء

كان أهل الصفّة جماعة من الفقراء والمساكين[١] الذين هاجروا إلى الله ورسوله، ولم يكن في مقدور أهل المدينة استيعاب جميع المهاجرين إليهم، فكانوا يقيمون في ناحية المسجد في مكان يسمّى الصفّة فنسبوا إليه وكان النّبي يرسل إليهم الطّعام والشّراب ويدعوهم إلى بيته، ومن شدّة فقرهم وحاجتهم لجأ أحدهم إلى وسيلة ليلفت بها غيره إلى حاله ليخفّف عنه شدّة الجوع، فكان يقف في الطّريق ويسأل المارّة عن معنى آية من كتاب الله تعالى حتّى مرّ به نبيّ الرّحمة فعرف حاله وأخذه معه، ودعا غيره من المعوزين فأشبعهم[٢].

وكان النّبيﷺ يحثّ النّاس على مساعدتهم ويسبقهم إليهم، ويكون أكثرهم مواساة لهم، ورحمة بهم[٣]، بل إنّ رحمته بهم جعلته يؤثرهم على ابنته فاطمة سيّدة النّساء رضي الله عنها وهي زهرة فؤاده وفلذة كبده، وأحبّ النّاس إلى قلبه[٤].

وكان ﷺيشارك النّاس آلامهم ويتوجّع لحالهم، بل إنّه تحمّل عنهم هموم الحياة ومتاعبها وأزاح عنهم أعباءها وأثقالها، فأعلن أمام الملأ قائلا: (من ترك مالا فهو لورثته، ومن ترك

---

١. روى البخاري بسنده عن أنس بن مالك (قدم رهط من عُكْلٍ على النبيﷺ فكانوا في الصفة وقال عبد الرحمن بن أبي بكر الصديق كان أصحابُ الصفة الفقراءَ)، كتاب الصّلاة، باب نوم الرجال في المسجد، ص ٧٦.

٢. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الرّقاق، باب كيف كان عيش النّبي وأصحابه، ص١١٢٠، رقم الحديث ٦٤٥٢.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب مواقيت الصّلاة، باب السّمر مع الأهل والضّيف، ص ١٠٠، رقم الحديث ٦٠٢.

٤. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب فرض الخمس، باب الدّليل على أنّ الخمس لنوائب رسول الله صلّى الله عليه وسلّم، ص ٥١٥-٥١٦.

كلاّ فإلينا)[1]، إنّه يرى النّاس عائلة واحدة هو ربّها والقيّم عليها، فما أرحمك ياأرحم العالمين !!

المطلب الرّابع: الوقاية من الفقر وعلاجه:

للإسلام أسلوبه الخاص في الوقاية من ظاهرة الفقر، يتمثّل في مظاهر عديدة، ومن أهمّها:

الإيمان الصّحيح

إنّ المنهج الصّحيح الذي يحقّق الكفاية المعيشية للنّاس، يكمن في الإيمان بالله تعالى، والالتزام بالتقوى، قال الله تعالى: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾[2].

فالاعتقاد الصّحيح الجازم بأنّ الله تعالى هو الخالق الواحد المحيي المميت، الرازق بيده ملكوت السموات والأرض، يغرس في النّفس الاطمئنان، والرضا بما قسم الله تعالى لعباده، ويدفع الإنسان للسعي الحثيث وراء رزقه الذي قدّر له، قال تعالى: ﴿وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾[3].

وعلى الإنسان أن يكون تقيّا في طلب رزقه، فيأخذ بالأسباب المشروعة، ويحذر الكسل والتواكل، والظلم، ليفتح له الله تعالى أبواب الرزق من حيث لايحتسب، قال الله تعالى ﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ﴾[4]، كما ينبغي عليه أن يحسن التوكّل على الله تعالى، فهو مفتاح الرزق، قال عزّ وجلّ: ﴿وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الاستقراض، باب الصّلاة على من ترك دينا، ص ٣٨٥، رقم الحديث ٢٣٩٨.

٢. سورة الأعراف، ٩٦.

٣. سورة هود، ٦.

٤. سورة الطلاق، ٢-٣.

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾[١]، وقالﷺ: (لو انكم توكلتم على الله توكلتم على الله حق توكله، لرزقكم كما يرزق الطير، تعذو خماصا، وتروح بطانا)[٢].

وكلّما أدرك الإنسان أخطاءه، وصحّحها بالتوبة، ولازم الاستغفار، وأكثر منه، إلاّ وكان الكون في خدمته، وحلّت البركة في ماله وعياله، قال تعالى: ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا﴾[٣]، ثمّ مع ذلك لا يغفل عن شكر الله تعالى على نعمه الظاهرة والباطنة، فالشكر من أسباب زيادة الرزق، قال تعالى: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾[٤]، والشكر يقتضي الابتعاد عن الإسراف والتبذير، والحذر منه، لأنّه آفة الرزق، ومجلاب للفقر قال تعالى: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾[٥] وقالﷺ: (كلوا واشربوا والبسوا وتصدّقوا في غير إسراف ولا مَخِيلة)[٦].

---

١. سورة الطلاق، ٣.

٢. محمد بن عيسى الترمذي، الجامع، تحقيق أحمد محمد شاكر وآخرون، كتاب الزهد، باب التوكل على الله، دار إحياء التراث العربي، بيروت، قال أبو عيسى: "هذا حديث حسن صحيح لا نعرفه إلا من هذا الوجه"، قال الشيخ الألباني: "صحيح"، ج ٤، ص ٥٧٣، ورواه محمد بن حبان، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، تحقيق: شعيب الأرنؤوط، ط٢، مؤسّسة الرّسالة، بيروت، ١٩٩٣م، قال شعيب الأرنؤوط: "إسناده جيد"، ج ٢، ص ٥٠٩.

٣. سورة نوح، ١٠.

٤. سورة إبراهيم، ٧.

٥. سورة الأعراف، ٣١.

٦. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب اللّباس، باب قول الله تعالى: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾، ص١٠٢٠، رواه تعليقا. ووصله ابن حجر في تغليق التعليق، ت/ سعيد عبد الرّحمن موسى القزقي،

محاربة الفقر

لايحسبنّ الجاهلون أنّ ابتعاد النّبيﷺعن رغد الحياة الدّنيا، ورعايته للضّعفاء، وتحريض النّاس على مساعدتهم، دعوة منه لاستحباب الفقر والمسكنة، وتشجيعا منه على الكسل والكسب بلا عرق، فتنتشر البطالة، وتتفاقم ظاهرة الفقر في المجتمع، كلاّ وألف كلاّ، فالإسلام لم يرغّب في الفقر، وإنّما شرّع وسائل كثيرة لمحاربته، فكانﷺ يستعيذ بالله من الفقر قائلا: (اللّهم إنّي أعوذ بك من الفقر والقلّة والذلّة وأعوذ بك أن أظلم أو أظلم)[1]. ويأمر النّاس بالتعوّذ من الفقر فيقول: (تعوّذوا بالله من الفقر)[2]، ويدعو الله تعالى أن يغنيه من الفقر فيقول: (اللّهم أنت الأوّل فليس قبلك شيء، وأنت الآخر فليس بعدك شيء، وأنت الظاهر فليس فوقك شيء، وأنت الباطن فليس دونك شيء، اقض عنّا الدّين وأغننا من الفقر)[3]. ومع استعاذته من الفقر

المكتب الإسلامي، بيروت، ط١، ١٤٠٥هـ، ج ٥، ص ٥٢، ورواه ابن ماجه بسنده عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ، انظر السنن، كتاب اللباس، باب البس ماشئت، ص ٥١٩، رقم الحديث ٣٦٠٥، وقال الشيخ الألباني: "حسن"، انظر محمد بن عبد الله، التبريزي، مشكاة المصابيح، ت/الألباني، المكتب الإسلامي، بيروت، ط٣، ١٩٨٥م، ورواه الإمام أحمد، المسند، ت/شعيب الأرناؤوط، مسند عبد الله بن عمرو ﷺ، مؤسسة قرطبة، القاهرة، وقال شعيب الأرناؤوط: "إسناده حسن" ج ٢، ص١٨٢، رقم الحديث ٦٦٩٥.

١. البخاري، الأدب المفرد، كتاب الأذكار، باب دعوات النّبيﷺ، ص ٢٣٦، رقم الحديث ٦٧٨، قال الألباني: "صحيح"، انظر الألباني، صحيح الأدب المفرد، ص ٢٥١، ورواه ابن حبّان، صحيح ابن حبّان، تحقيق شعيب الأرنؤوط، باب الأدعية، ج ٣، ص ٣٠٥، رقم الحديث ١٠٣٠، وعلّق عليه المحقّق فقال: "إسناده صحيح على شرط مسلم".

٢. ابن حبان، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، تحقيق شعيب الأرنؤوط، كتاب الرّقائق، باب الأدعية، ج٣، ص ٢٨٤، رقم الحديث ١٠٠٣، وعلّق عليه شعيب الأرنؤوط فقال: "حديث صحيح".

٣. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الذكر والدّعاء والتوبة، باب ما يقول عند النّوم، ص ١١٧٩، رقم الحديث ٦٨٨٩.

فقد حذّر من مخاطر الغنى فقال: (فوالله ما الفقر أخشى عليكم، ولكنيّ أخشى أن تبسط عليكم الدّنيا كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها، وتهلككم كما أهلكتهم)[1].

معالجة الفقر

عمل النّبيﷺ على معالجة ظاهرة الفقر بأمور منها:

النّهي عن المسألة

نهى الرّسولﷺ عن المسألة فقال: (إنّ الله كره لكم ثلاثا، قيل وقال وإضاعة المال وكثرة السؤال)[2]، ولم يحلّ المسألة إلاّ لثلاثة رجال فعن قبيصة بن مخارق الهلالي قال: (تحمّلت حمالة[3] فأتيت رسول اللهﷺ أسأله فيها فقال: أقم حتّى تأتينا الصّدقة فنأمر لك بها، قال: ثمّ قال: ياقبيصة إنّ المسألة لا تحلّ إلاّ لأحد ثلاثة، رجل تحمّل حمالة فحلّت له المسألة حتّى يصيبها ثمّ يمسك ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله فحلّت له المسألة حتّى يصيب قواما من عيش أو قال سدادا من عيش، ورجل أصابته فاقة حتّى يقول ثلاثة من ذوي الحجا من قومه: لقد أصابت فلانا فاقة، فحلّت له المسألة حتّى يصيب قواما من عيش أو قال سدادا من عيش، فما سواهنّ من المسألة ياقبيصة سحتا يأكلها صاحبها سحتا)[4].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب المغازي، باب شهود الملائكة بدرا، ص ٦٧٧-٦٧٨، رقم الحديث ٤٠١٥.

٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب من سأل الناس تكثرا، ص ٢٤٠، رقم الحديث ١٤٧٧.

٣. الحمالة: هي المال الذي يتحمّله الإنسان، أي يستدينه ويدفعه في إصلاح ذات البين.

٤. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب من تحلّ له المسألة، ص ٤١٩-٤٢٠، رقم الحديث ٢٤٠٤.

محاربة البطالة، والدعوة للعمل

حارب النبيّ ﷺ البطالة، ودعا النّاس إلى العمل فقال: (لأن يأخذ أحدكم حبله فيأتي بحزمة الحطب على ظهره فيبيعها فيكفّ الله بها وجهه خير له من أن يسأل النّاس أعطوه أو منعوه)[1]، ورغّب في الزّراعة فقال: (ما من مسلم يغرس غرسا أو يزرع زرعا فيأكل منه طير أو إنسان أو بهيمة إلاّ كان له به صدقة)[2].

وحين أخرج الكفّار المسلمين من ديارهم بغير حقّ، تركوا وراءهم أموالهم التي استولى عليها المشركون، ولم يكن في أيديهم شيء حين وصلوا مهاجرين إلى المدينة، ومع ذلك فإنّهم لم يرضوا بما عرضه عليهم إخوانهم الأنصار من مقاسمتهم أموالهم واختاروا العمل[3].

وبيّن أن أفضل طعام يأكله الإنسان هو من عمل يده، فقال: (ما أكل أحد طعاما قطّ خيرا من أن يأكل من عمل يده، وإنّ نبيّ الله داود عليه السّلام كان يأكل من عمل يده)[4]. وقال: (إنّ أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإنّ أولادكم من كسبكم)[5].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب الاستعفاف عن المسألة، ص ٢٣٩، رقم الحديث ١٤٧١.

٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزّرع والغرس، ص ٣٧٢، رقم الحديث ٢٣٢٠.

٣. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الشّروط، باب الشّروط في المعاملة، ص ٤٤٥، رقم الحديث ٢٧١٩.

٤. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب البيوع، باب كسب الرّجل وعمله بيده، ص ٣٣٣، رقم الحديث ٢٠٧٢.

٥. الترمذي، جامع الترمذي، كتاب الأحكام، باب أنّ الوالد يأخذ من مال ولده، ص ٣٢٨، رقم الحديث ١٣٥٨. وقال: "هذا حديث حسن صحيح". ورواه ابن ماجة، السّنن، كتاب التّجارات، باب ما للرّجل من مال ولده، ص ٣٢٧-٣٢٨، رقم الحديث ٢٢٩٠، وقال الشيخ الألباني :"صحيح"، انظر الألباني، إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السّبيل، ج ٦، ص ٦٥.

الدعوة للإنفاق

فضّل النّبيﷺالإنسان المتصدّق على الذي يمدّ يده إلى الصّدقات فقال: (اليد العليا خير من اليد السّفلى، فاليد العليا هي المنفقة والسّفلى هي السّائلة)[١].

ورغّب في الصّدقة وبيّن أنّ أصحابها ينالون المكانة العالية يوم القيامة[٢]، وكان في كلّ مناسبة يذكّر أمّته بالعطف على الفقراء والمساكين، ويدعوها إلى إعانتهم بالصّدقات[٣].

ومع دعوته الشّديدة إلى الإنفاق على الفقراء والمساكين، فإنّه حرّم على نفسه وآل بيته الصّدقات، فكان لايأخذ منها شيئا، فعن أبي هريرة قال: (أخذ الحسن بن عليّ رضي الله عنهما تمرة من تمر الصّدقة فجعلها في فيه، فقال النّبيﷺ كخ كخ ليطرحها ثمّ قال أما شعرت أنّا لا نأكل الصّدقة)[٤].

ورغم كلّ هذا الترغيب في الصّدقة فإنّه ﷺ لايرضى أن يتصدّق الإنسان بما لديه ويترك عياله يتكفّفون النّاس، فبيّن أنّ أفضل الصّدقة تلك التي يتصدّق بها الإنسان على أهله[٥].

وحضر مجلس النّبيﷺ رجل له دنانير يريد أن يتصدّق بها، فسأل النّبيﷺ عن وجوه إنفاقها، فأمره أن ينفقها على أهل بيته، يعلّمه بذلك كيف يقدّم الأهمّ والأحوج في الصّدقة، وبعد أن استوفى الرّجل الواجبات التي عليه، قال له: "أنت أبصر" أي أعلم بمن هو أولى أن تتصدّق بدينارك عليه[٦].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب لا صدقة إلاّ عن ظهر غنى، ص ١٣١، رقم الحديث ١٤٢٩.
٢. انظر البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب الصّدقة باليمين، ص ٢٣٠، رقم الحديث ١٤٢٣.
٣. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الأشربة، باب فضيلة المواساة في الطّعام القليل، ص ٩٢١، رقم الحديث ٥٣٧٠.
٤. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب ما يذكر في الصّدقة للنّبي صلّى الله عليه وسلّم، ص ٢٤٢، رقم الحديث ١٤٩١.
٥. انظر مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب فضل الصّدقة على العيال، ص ٤٠٣، رقم الحديث ٢٣١١.
٦. انظر النّسائي، السّنن الصّغرى، كتاب الزّكاة، باب تفسير ذلك، ص ٣٥٠-٣٥١، رقم الحديث

الدعوة للاستعفاف

رغم دعوة النّبي ﷺ الشّديدة إلى مساعدة ذوي الحاجات، فإنّه كان ينبّه المحتاجين إلى ضرورة العمل والصّبر والاستعفاف عن المسألة، ويبيّن لهم فضل اليد العليا على اليد السّفلى، فعن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه (إنّ ناسا من الأنصار سألوا رسول الله ﷺ فأعطاهم، ثمّ سألوه فأعطاهم، ثمّ سألوه فأعطاهم حتّى نفد ما عنده، فقال ما يكون عندي من خير فلن أدّخره عنكم ومن يستعفف يعفه الله ومن يستغن يغنه الله ومن يتصبّر يصبّره الله، وما أعطي أحد عطاء خيرا وأوسع من الصّبر)[1].

ولقد كان الصّحابة رضي الله عنهم عمّالَ أنفسهم[2]، والمحتاجون منهم استعفّوا استجابة لما دعاهم إليه الرّسول ﷺ، كما في حديث الصّحابي حكيم بن حزام رضي الله عنه[3].

النهي عن المسألة تكثّرا

من النّاس من يطلب الثّراء السّريع من غير عمل، ويتّخذ المسألة حرفة لجمع المال، ويحتال على النّاس بالمظاهر التي تستثير عواطفهم، فيغدقون عليه من أموالهم وهم يظنّون أنّه من مستحقّيها، وهذا الصّنف من النّاس أذهب سؤاله ماء الحياء من وجهه، وقد ذمّه النّبي ﷺ

٢٥٣٦، ورواه أبو داود، السّنن، كتاب الزّكاة، باب في صلة الرّحم، ص ٢٥٠، رقم الحديث ١٦٩١، ورواه البخاري، الأدب المفرد، الخدم والمماليك، باب نفقة الرّجل على عبده، ص٧٨. رقم الحديث ١٩٧، قال الشيخ الألباني :"حسن صحيح" أنظر الألباني، صحيح الترغيب والترهيب، ج ٢، ص ٢٠٢، رقم الحديث ١٩٥٨، ورواه ابن حبان، صحيح ابن حبّان بترتيب ابن بلبان، كتاب الزّكاة، باب صدقة التطوّع، ج ٨، ص ١٢٦، رقم الحديث ٣٣٣٧، وعلّق عليه شعيب الأرنؤوط فقال: "إسناده حسن"

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب الاستعفاف عن المسألة، ص ٢٣٨، رقم الحديث ١٤٦٩.

٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب البيوع، باب كسب الرّجل وعمله بيده، ص ٣٣٢، رقم الحديث ٢٠٧١.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب مثل البخيل والمتصدّق، ص ٢٣٣، رقم الحديث ١٤٤٣.

ووصف حالته السيّئة التي يأتي عليها يوم القيامة فقال: (ما يزال الرّجل يسأل النّاس حتّى يأتي يوم القيامة ليس في وجهه مزعة لحم)[١].

وهؤلاء الذين يسألون النّاس من غير حاجة ويجمعون عرق غيرهم ويظنّونه بردا وسلاما فيستكثرون منه إنّما يجمعون لأنفسهم جمرا لوكانوا يعلمون، قالﷺ: (من سأل النّاس أموالهم تكثّرا، فإنّما يسأل جمرا، فليستقلّ أو ليستكثر)[٢].

وكانﷺ يهتمّ بالنّاس ويسأل عنهم، ولا تحرمهم الفوارق الاجتماعية من عدله، وفيض رحمته، روى البخاري بسنده عن ابن عبّاس رضي الله عنهما (أنّ رسول اللهﷺ مرّ بقبر قد دفن ليلا فقال متى دفن هذا، قالوا البارحة، قال أفلا آذنتموني، قالوا دفنّاه في ظلمة اللّيل فكرهنا أن نوقظك، فقام فصففنا خلفه قال ابن عبّاس وأنا فيهم فصلّى عليه)[٣].

بل إنّه من شدّة رحمته بأمّته وحرصه الكبير على إنقاذها جعل دعوته المستجابة شفاعة لأمّته يوم القيامة روى البخاري بسنده عن أنس عن النّبيﷺقال: (كلّ نبيّ سأل سؤلا أو قال لكلّ نبيّ دعوة قد دعا بها فاستجيب، فجعلت دعوتي شفاعة لأمّتي يوم القيامة)[٤].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب من سأل النّاس تكثّرا، ص ٤١٩، رقم الحديث ٢٤٠٤.

٢. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب كراهة المسألة، ص ٤١٨، رقم الحديث ٢٣٩٩.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الجنائز، باب صفوف الصّبيان مع الرّجال في الجنائز، ص٢١١، رقم الحديث ١٣٢١.

٤. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الدّعوات، باب لكلّ نبيّ دعوة مستجابة، ص ١٠٩١-١٠٩٦، رقم الحديث ٦٣٠٥.

المطلب الخامس: العناية بالمحتاجين

لم يتأخّر النّبيﷺ عن مساعدة المحتاجين، وكان دوما يحثّ على مساعدتهم ويقول: (على كلّ مسلم صدقة، فقالوا يا نبي الله فمن لم يجد؟قال يعمل بيده فينفع نفسه ويتصدّق، قالوا فإن لم يجد؟قال يعين ذا الحاجة الملهوف؟قالوا فإن لم يجد؟قال فليعمل بالمعروف، وليمسك عن الشرّ فإنّها له صدقة)[1].

ووعد الذين يكونون في خدمة حوائج النّاس، ويفرّجون عنهم كربهم، أن يكون الله في حوائجهم ويلطف بهم يوم القيامة فقال: (المسلم أخو المسلم لايظلمه ولايسلمه، ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته ومن فرّج عن مسلم كربة فرّج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة)[2]، وعن سهل بن سعد قال: (جاءت امرأة ببردة قال أتدرون ما البردة؟ فقيل له: نعم هي الشّملة منسوج في حاشيتها، قالت يارسول الله إنّي نسجت هذه بيدي أكسوكها فأخذها النّبيّﷺ محتاجا إليها فخرج إلينا وإنّها إزاره، فقال رجل من القوم يارسول الله اكسنيها، فقال نعم فجلس النّبيﷺ في المجلس ثمّ رجع فطواها ثمّ أرسل بها إليه، فقال له القوم ما أحسنت سألتها إيّاه لقد علمت أنّه لا يردّ سائلا، فقال الرّجل والله ما سألته إلاّ لتكون كفني يوم أموت، قال سهل فكانت كفنه)[3].

---

١. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب الزّكاة، باب على كلّ مسلم صدقة، ص ٢٣٣، رقم الحديث ١٤٤٥.

٢. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب المظالم والغضب، باب لايظلم المسلم المسلم، ص٣٩٤، رقم الحديث ٢٤٤٢.

٣. البخاري، الجامع الصّحيح، كتاب البيوع، باب النسّاج، ص ٣٣٦، رقم الحديث ٢٠٩٣.

وإذ لم يكن عنده مايسدّ به حاجة المحتاج سعى له حتّى يقضي حاجته[١].

أهمّ نتائج البحث:

بناء على ما تقدّم في هذا البحث، فإنّ النّظام الاقتصادي الإسلامي هو الحلّ الأمثل في معالجة ظاهرة الفقر، وتحقيق العدالة الاجتماعية، وإنّ من أهمّ النتائج التي توصلنا إليها خلال هذا البحث، ما يلي:

١- تطبيق الإسلام للعدالة الاجتماعية في إتاحة الفرص المتكافئة.

٢- التكافل الاجتماعي فريضة إسلامية.

٣- محاربة الإسلام للفقر والبطالة.

٤- الخدمات الاجتماعية من أفضل الأعمال.

٥- ضرورة ترشيد الاستهلاك.

٦- أهميّة توزيع الثروة في نشر الأمن والسّلام في المجتمع.

وصلّى الله تعالى على محمّد النّبي المرسل رحمة للعالمين، وعلى آله وصحبه وسلّم تسليما.

---

١. مسلم، الجامع الصّحيح، كتاب الأشربة، باب إكرام الضّيف، ص٩١٧،رقم الحديث ٥٣٥٩

العدل الاجتماعي: مجالاته وآثاره في المجتمع الإسلامي

Social Justice, its Scope and Impact on Islamic Society

حافظ محمد طارق*

محمد رفيق صادق**

Justice is to give due rights to others without any prejudice, liking and disliking. Social justice is the name of truthful social system in which everyone enjoys and consumates equal opportunities of development and progress without any discrimination of caste, color, creed, power and religion. National resources are equitably allocated. No sensible person can deny the importance of social justice at individual or public level. This article highlights the impacts and fields of social justice with its definition and foundation in the light of teachings and life of the Prophet Muḥammad (SAW).

الحمد لله الذي أمر بالعدل والإحسان ونهى عن البغي والعدوان، وأنزل على عبده القرآن، والصلاة والسلام على النبي الأمي محمد الذي أرسله شاهدا ومبشرا ونذيرا، وداعيا إلى الله بإذنه وسراجا منيرا، وعلى آله وأصحابه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين وبعد.

إن الله سبحانه وتعالى أرسل رسله وأنزل كتبه ليقوم الناس بالقسط، وهو العدل الذي قامت به السماوات والأرض. والعدل من القيم الإنسانية الأساسية التي جاء بها الإسلام، وجعلها من مقومات الحياة الفردية والأسرية والاجتماعية والسياسية، حتى جعل القرآن إقامة القسط - أي العدل- بين الناس هدفا أساسيا من أهداف الرسالات السماوية كلها، وفلسفة البعثات السماوية والرسالات الربانية. كما قال الله تعالى: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[1] فتحقيق العدل وظيفة مهمة من وظائف الأنبياء عليهم الصلاة والسلام بنص القرآن: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ

---

* المحاضر بقسم الدراسات الإسلامية كلية البنين الحكومية، مري، راولبندي.

** المحاضر بقسم الحديث والسيرة، جامعة العلامة اقبال المفتوحة، اسلام آباد.

١. سورة الحديد، ٢٥.

﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾[1] بل إن أوامر الله تعالى ترشدنا وتحثنا على مرحلة متقدمة من العدل ألا وهو الإحسان، فقد قال الله تعالى: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾[2].

إن القرآن الكريم يأمر جميع الناس بالعدل ويخص من بينهم المسلمين المؤمنين ولا يجيز لهم التقصير والإهمال في ذلك مهما كانت الظروف والأوضاع والأسباب بقوله: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾[3] فالعدل أساس من أسس الثواب والعقاب يوم القيامة، فقد قال تعالى: ﴿وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ﴾[4].

ولقد بالغ القرآن الكريم على أهمية تطبيق العدل في المجتمع، وقد أشار إلى مختلف أنواع العدل في كثير من الآيات إلا أن العدل الاجتماعي قد حظي بأكثر من نصف هذه الآيات التي أشارت إلى العدل، فالقرآن المجيد قد احتوى على ست عشرة آية تختص بالعدل الاجتماعي. وذلك لأنه لا يمكن تحقيق العدالة في عديد من أنواعها بدون وجود العدالة الاجتماعية، فهي التي توجد الأجواء المناسبة والأرضية الصالحة لتطبيق مبدأ العدل والعدالة في الأبعاد الأخرى، فالعدالة الاجتماعية تعتبر من أهم مكونات ومرتكزات العدل في دين الإسلام الحنيف[5].

---

١. سورة الشورى، ١٥.

٢. سورة النحل، ٩٠.

٣. سورة النساء، ١٣٥.

٤. سورة الأنبياء، ٤٦ – ٤٧ .

٥. انظر: عبد الله أحمد اليوسف، العدالة الاجتماعية في القرآن الكريم، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ، ص ٣٢-٣٣.

ومن يتفحص ويمعن النظر في حياة الرسول صلى الله عليه وسلم يتأكد وير جليا أن سيرته العطرة كانت ترسيخا لقيمة العدل في نفوس أصحابه رضي الله عنهم، وتأكيدا على أن العدل من أهم مقاصد الشرع الحنيف، فقد كان العدل ملازما لجميع مجالات حياته صلى الله عليه وسلم.

وهذا المقال محاولة متواضعة قدر المستطاع لبيان مفهوم العدل الاجتماعي وأسسه ومجالاته وآثاره في المجتمع الإسلامي من منظور إسلامي في ضوء سيرة الرسول صلى الله عليه وسلم.

أهمية العدل في الإسلام

إن الدين عند الله الإسلام، والإسلام يأمر بالعدل والإحسان إلى جميع الناس حيث قال الله تعالى: ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ﴾[1]، فدين الإسلام هو دين المساواة بين البشر والإخاء، وهو مبدأ أصيل لحقوق الإنسان في الإسلام لقوله تعالى: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾[2] إذا المسلم أخو المسلم في كل زمان ومكان، له ماله وعليه ما عليه، وقد أقام رسول الله صلى الله عليه وسلم صرح الأمة على أسس العدل الاجتماعي من المساواة والحرية والائتلاف، وصفاء النفس، وعدم الاعتداء على أحد في ماله وحقوقه وعرضه ونفسه، فالإسلام قرر أحكاما عادلة وآدابا فاضلة للفرد والأسرة والمجتمع. لأن الدين الإسلامي ليس عقيدة فرد فقط بل هو دين عملي مثالي لاستجماعه عناصر الخلود لاحتوائه على السعادتين الدنيوية والأخروية.

وحقيقة العدل في الإسلام، أنه ميزان الله تعالى على الأرض، وهو اسم من أسمائه الحسنى، وصفة من صفاته العظمى، به يؤخذ للضعيف حقه، وينصف المظلوم ممن ظلمه، ويمكن صاحب الحق من الوصول إلى حقه من أقرب الطرق وأيسرها، وهو من القيم التي تنبثق من عقيدة الإسلام في مجتمعه؛ فلجميع الناس في المجتمع الإسلامي حق العدالة وحق الاطمئنان إليها

---

۱. سورة النحل، ۹۰.

۲. سورة الحجرات، ۱۰.

لأن العدل في الإسلام لا يتأثر بحب أو بغض، فلا يفرق بين حسب ونسب، ولا بين جاه ومال، كما لا يفرق بين مسلم وغير مسلم، بل يتمتع به جميع المقيمين على أرضه من المسلمين وغير المسلمين، مهما كان بين هؤلاء وأولئك من مودة أو شنآن، كما قال ابن تيمية: "إن الله ينصر الدولة العادلة وإن كانت كافرة، ولا ينصر الدولة الظالمة وإن كانت مؤمنة"[1].

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم صادقا وأمينا وعادلا في قوله وفعله وحكمه، لايجور ولا يحيف، وكان العدل من أخلاقه وأوصافه اللازمة ، فقد عرف به في الجاهلية قبل الإسلام، وله صلى الله عليه وسلم مواقف كثيرة يتجلى فيها هذا الخلق النبوي الكريم. منها قصة تحكيم قريش له صلى الله عليه وسلم في وضع الحجر الأسود بعد خلاف شديد بينهم كاد يفضي بهم إلى الاقتتال. فقالوا بتوفيق من الله سبحانه وتعالى: نحكم أول قادم علينا. فكان ﷺ، فقالوا: هذا الأمين، هذا الحكم، رضينا به. فحكم بأن يوضع الحجر في ثوب، وتأخذ كل قبيلة بطرف، ثم أخذ الحجر بيديه المباركتين ووضعه في مكانه من جدار البيت، فحكم فعدل، وكان مظهرا من مظاهر عدله صلى الله عليه وسلم.

وروي عن علي رضي الله عنه، قال: (لما أرادوا أن يرفعوا الحجر الأسود، اختصموا فيه فقالوا: يحكم بيننا أول رجل يخرج من هذه السكة، قال: فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم أول من خرج عليهم، فقضى بينهم أن يجعلوه في مرط، ثم يرفعه جميع القبائل كلها)[2].

وقد طبق أسلافنا الأولون العدل في أعلى وأرقى صوره بدءا من رسول الله صلى الله عليه وسلم فقد كان صلى الله عليه وسلم مثالا ونموذجا في إقامة العدل حتى على نفسه الكريمة، فقد روي: (كان أسيد بن حضير رضي الله عنه رجلا ضاحكا

---

١. أبو العباس تقي الدين أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، مجموع الفتاوى، تحقيق: الشيخ أنور الباز — الشيخ عامر الجزار، دار الوفاء للطباعة والنشر والتوزيع، المنصورة، الطبعة الثالثة ١٤٢٦هـ، ٦٣/٢٨.

٢. أبو بكر عبد الله بن محمد ابن أبي شيبة الكوفي، المصنف، تحقيق: الشيخ محمد عوامة، كتاب أقضية رسول الله صلى الله عليه وسلم، دار السلفية الهندية، ج ١٠، ص ١٧٠، رقم الحديث ٢٩٦٩٣.

مليحا، قال: فبينما هو عند رسول الله صلى الله عليه وسلم يحدث القوم ويضحكهم، فطعن رسول الله صلى الله عليه وسلم بإصبعه في خاصرته، فقال: أوجعتني. قال: اقتص. قال: يا رسول الله، إن عليك قميصا، ولم يكن علي قميص. قال: فرفع رسول الله صلى الله عليه وسلم قميصه فاحتضنه ثم جعل يقبل كشحه. فقال: بأبي أنت وأمي يا رسول الله أردت هذا)[١].

إن هذه الآيات الكريمة والأحاديث الشريفة ومواقف الرسول صلى الله عليه وسلم كلها تدل على أهمية العدل في الإسلام وتبرز عناية الإسلام به.

أولا: مفهوم العدل

العدل في اللغة

العدل: ما قام في النفوس أنه مستقيم، وهو ضد الجور، كالعدالة والعدولة والمعدلة بكسر الدال وفتحها. عدل الحاكم في الحكم يعدل عدلا وهو عادل من قوم عدول. والعدل الحكم بالحق، يقال: هو يقضي بالحق. وعدل بلفظ الواحد وهذا اسم للجمع. رجل عدل وامرأة عدل وعدلة. والعدالة وصف بالمصدر معناه ذو عدل، قال تعالى في موضعين: ﴿ وَأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾[٢] وقال: ﴿ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾[٣] ومن

---

١. أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي، السنن الكبرى، كتاب النفقات، باب ما جاء في قتل الإمام وجرحه، مجلس دائرة المعارف النظامية، حيدر آباد، الهند، الطبعة الأولى ١٣٤٤هـ، ج ٠٨، ص ٤٩، رقم الحديث ١٦٤٤٣ ؛ أبو داود، سليمان بن أشعث، السنن، كتاب الأدب، باب في قبلة الجسد، دار الكتاب العربي، بيروت، لبنان، ج ٠٤، ص ٥٢٥، رقم الحديث ٥٢٢٦؛ أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم، المستدرك على الصحيحين، كتاب معرفة الصحابة رضي الله تعالى عنهم، دار المعرفة، بيروت، لبنان، ج ٠٣، ص ٢٨٨.

٢. سورة الطلاق، ٠٢.

٣. سورة المائدة، ٩٥.

أسماء الله تعالى: العدل: هو الذي لا يميل به الهوى فيجور في الحكم وهو في الأصل مصدر سمي به، فوضع موضع العادل وهو أبلغ منه؛ لأنه جعل المسمى نفسه عدلا[١]. قال ابن فارس: والعدل بالكسر الذي يعادل في الوزن والقدر[٢].

قال الراغب الأصفهاني: "عدل: العدالة والمعادلة لفظ يقتضي معنى المساواة ويستعمل باعتبار المضايفة، والعدل والعدل يتقاربان، لكن العدل يستعمل فيما يدرك بالبصيرة كالأحكام، وعلى ذلك قوله تعالى: ﴿أَوْ عَدْلُ ذَلِكَ صِيَامًا﴾[٣] والعدل والعديل فيما يدرك بالحاسة كالموزونات والمعدودات والمكيلات، فالعدل هو التقسيط على سواء"[٤].

العدل في الاصطلاح

وقال الجرجاني: العدل: "عبارة عن الأمر المتوسط بين طرفي الإفراط والتفريط".

والعدالة في الشريعة: "عبارة عن الاستقامة على طريق الحق بالاجتناب عما هو محظور دينا"[٥].

وقد عبر القرآن الكريم عن العدل بثلاث كلمات هي: العدل، والقسط، والميزان، إلا أنه أحيانا تأتي كلمة القسط في القرآن الكريم بمعنى مغاير لكلمة العدل، ويعرف ذلك من خلال سياق الآيات الكريمة وتفسيرها[٦].

---

١. انظر: محمد بن مكرم ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بيروت، لبنان، ج ١١، ص ٤٣٠؛ مجد الدين محمد بن يعقوب الفيروز آبادي، القاموس المحيط، ص ١٣٣٢؛ أبو السعادات المبارك بن محمد ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث والأثر، تحقيق: الشيخ طاهر أحمد الزاوي – الشيخ محمود محمد الطناحي، المكتبة العلمية، بيروت، لبنان سنة الطبع ١٣٩٩هـ/١٩٧٩م، ج ٠٣، ص ٤١٨.

٢. أحمد بن محمد بن علي الفيومي، المصباح المنير في غريب الشرح الكبير للرافعي، المكتبة العلمية، بيروت، لبنان، ج ٠٢، ص ٣٩٦.

٣. سورة المائدة، ٩٥.

٤. أبو القاسم الحسين بن محمد الراغب الأصفهاني، المفردات في غريب القرآن، تحقيق: محمد سيد كيلاني، دار المعرفة، بيروت، لبنان، ص ٣٢٥.

٥. الجرجاني، علي بن محمد، التعريفات، تحقيق: الشيخ إبراهيم الأبياري، دار الكتاب العربي، بيروت، لبنان، الطبعة الأولى: ١٤٠٥هـ، ص ١٩١.

٦. انظر: الشيخ عبد الله أحمد اليوسف، العدالة الاجتماعية في القرآن الكريم، ص ١٩.

مفهوم العدل الاجتماعي

يعرف العدل الاجتماعي بأنه: "رعاية الحقوق العامة للمجتمع والأفراد، وإعطاء كل فرد من أفراد المجتمع ما يستحقه من حقوق واستحقاقات، والتوزيع العادل للثروات بين الناس، والمساواة في الفرص، وتوفير الحاجات الرئيسة بشكل عادل، واحترام حقوق الإنسان المعنوية والمادية"[١].

ثم إن مفهوم العدل الاجتماعي مفهوم شامل وعام يتناول كل جوانب وأبعاد النظام السياسي والاقتصادي والثقافي والاجتماعي والإنساني، وعند ما يختل أي بعد من هذه الأبعاد فهذا يعني أن العدالة الاجتماعية تعاني من ثقوب كبيرة، وأن المجتمع لا ينعم بالعدالة الاجتماعية الشاملة. فالمجتمع الذي ينعم بالعدالة وبخاصة الاجتماعية هو مجتمع يتمتع بمظاهرها من حرية في التعبير والاختيار، ومن مساواة في الحقوق والواجبات، ومن توزيع عادل للثروة.

الأركان والأسس للعدل الاجتماعي

للعدالة الاجتماعية أركان وأسس وقواعد لا تقوم إلا بها، وهي مقياس لمعرفة إن كانت العدالة الاجتماعية مطبقة في مجتمع ما أم أن السائد فيه هو الظلم والجور والحرمان. ويمكن الإشارة إلى أهمها ضمن النقاط التالية:

١: المساواة بين أفراد المجتمع

إن القرآن الكريم يصرح في مواضع عدة أن الجنس البشري كله خلق من تراب، ومن نفس واحدة، قال تعالى: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ٱلَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾[٢] وقال: ﴿وَمِنْ ءَايَٰتِهِۦٓ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَآ أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ﴾[٣].

---

١. الشيخ عبد الله أحمد اليوسف، العدالة الاجتماعية في القرآن الكريم، ص ٢٨.

٢. سورة النساء، ٠١.

٣. سورة الروم، ٢٠.

الإسلام يرفض التمييز بين البشر على أساس اللون أو العرق أو الجنس أو الانتماء المذهبي أو أي لون من ألوان التمييز بين الناس الذين خلقهم الله عزوجل جميعا من نفس واحدة، ومن التراب. وقد نص على ذلك القرآن الكريم بقوله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾[1] فالفخر والتفاضل إنما يكون بالتقوى والعمل الصالح، وليس بالنسب أو العرق أو القبيلة أو غير ذلك من أشكال الفروق الطبيعية بين البشر.

إن مبدأي الأخوة والمساواة يشكلان أساس العلاقة بين أفراد المجتمع المسلم كما صوره الرسول صلى الله عليه وسلم في خطبة حجة الوداع حين قال: (يا أيها الناس! إن ربكم واحد، وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على أعجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود، ولا لأسود على أحمر إلا بالتقوى)[2]. فالناس سواسية في أصل الخلقة والنشأة والمنبع، وقد أكد على ذلك رسولنا الكريم صلى الله عليه وسلم بقوله: (الناس كأسنان المشط)[3].

والمساواة التي دعا إليها الإسلام تتمثل في المساواة أمام الشرع والقانون، والمساواة في الانتفاع من خيرات الدولة وأموالها، بالاضافة إلى المساواة في الحقوق والواجبات. ولا بد من الإشارة إلى أن المساواة المقصودة هنا هي القائمة على رفض التمييز والعنصرية، أما

---

١. سورة الحجرات، ١٣.

٢. أحمد بن حنبل، المسند، مؤسسة قرطبة، القاهرة، مصر، ج ٠٥، ص ٤١١، رقم الحديث ٢٣٥٣٦؛ أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي، شعب الإيمان، تحقيق: مختار أحمد الندوي، مكتبة الرشد، الرياض، السعودية العربية. الطبعة الأولى: ١٤٢٣هـ/٢٠٠٣م، ج ٠٧، ص ١٣٢، رقم الحديث ٤٧٧٤.

٣. أبو عبد الله محمد بن سلامة القضاعي، مسند الشهاب، تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي، مؤسسة الرسالة، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية: ١٤٠٧هـ/١٩٨٦م، ج ٠١، ص ١٤٥، رقم الحديث ١٩٥.

ماعدا ذلك فيجب مراعاة التساوي في الاستحقاقات إذ من الظلم مساواة العاجز بالمنتج، والمبدع بالفاشل، والمبتدئ بصاحب الخبرة، وقد أشار القرآن الكريم إلى ذلك من خلال قوله تعالى: ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾[1] فلا يمكن المساواة بين رجل أبكم وغير قادر على فعل شيء ولا يأت بأي خير، ورجل ناطق وآمر بالعدل ونافع لنفسه ولمجتمعه!

٢: التوزيع العادل للثروة

يعتبر التوزيع العادل للثروة بين أفراد المجتمع الركن الثاني والمهم من أركان العدالة الاجتماعية، إذ لا يمكن تصورها بدون تقسيم عادل للثروات خال من السرقات والاختلاسات، والتورط المالي للمسؤولين، وغسيل الأموال.

وقد حذر القرآن الكريم من استئثار فئة دون فئة بالثروة، وبشر من كان همهم جمع المال وكنزه بالعذاب الأليم، ويندرج تحت هذا المسمى في العصر الحالي أغنياء المسلمين الذين لا يراعون حقوق العباد ولا حق رب العباد في هذه الأموال المكتنزة، قال تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[2].

وكذلك حذر الذين يأكلون أموال الناس بالباطل، فقال تعالى: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[3] والذي من مظاهره في عصرنا الراهن الرشاوى، والاختلاس وتبييض الأموال، وغيرها من أنواع أكل أموال الناس بالباطل. وقد استطاع الرسول الكريم والخلفاء الراشدون من بعده تحقيق هذا الركن الأساسي من العدالة

---

١. سورة النحل، ٧٦.

٢. سورة التوبة، ٣٤.

٣. سورة البقرة، ١٨٨.

الاجتماعية حتى فاض بيت المال بالصدقات التي لم تجد طريقها إلى الفقراء لسبب بسيط: ألا وهو عدم وجود فقراء في المجتمع.

وقد أشار القرآن الكريم إلى ضرورة إيجاد التوازن بين الفئات الاجتماعية، وإزالة الطبقية القائمة على إعلاء طبقة اجتماعية معينة وإنزال فئة اجتماعية أخرى كما في قوله تعالى: ﴿مَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْ أَهْلِ ٱلْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۙ كَىْ لَا يَكُونَ دُولَةًۢ بَيْنَ ٱلْأَغْنِيَآءِ مِنكُمْ ۚ﴾[1] ولتحقيق التوازن الاجتماعي نحتاج إلى الاهتمام بالطبقات الاجتماعية الضعيفة والمحرومة والمهمشة، والمساواة في توزيع الثروات مع تساوي الحقوق والاستحقاقات، وتوفير مستلزمات العيش بكرامة وعزة.

والعدالة الاقتصادية التي هي جزء مهم من العدالة الاجتماعية لا يمكن أن تتحقق بدون توزيع عادل للثروات، وأم المشكلات في عصرنا هي تمركز الثروات عند فئة قليلة من الناس في حين تعيش الغالبية العظمى في فقر مدقع، وبذلك يزداد الغني غنى والفقير فقراً !

ثانيا: مجالات العدل في المجتمع الإسلامي

العدل قيمة شاملة تمس كل مناحي الحياة الإنسانية، وبه تصان خيرات كثيرة ومقاصد عامة كالنفس والمال والعرض وغيرها، وقد نظر إليه البعض على أنه أم الفضائل كلها، إذ لايتصور أي فضيلة في الوجود غاب عنها العدل، فالعدل فضيلة كل الناس وفضيلة كل ساعة من حياة الناس ، وتتحقق العدالة في أي مجتمع إذا طبق العدل في جميع الجوانب، فالعدل لا يقتصر على جانب دون آخر، إذ يجب أن يعم كل شيء، فالعدل مطلوب في السياسة والاقتصاد والاجتماع والثقافة والتربية والتعليم والحقوق والأسرة، فالعدل محور ومرتكز بناء العدالة الاجتماعية، يقول تعالى: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ وَٱلْإِحْسَٰنِ﴾[2] فالعدل جوهر الإسلام وروحه، وعليه يرتكز التشريع، وحكمة التكوين، وبناء المجتمع، وإدارة البلاد والعباد.

---

١. سورة الحشر، ٠٧.

٢. سورة النحل، ٩٠.

يمكن تأصيل العدالة الاجتماعية من خلال ما ورد في القرآن الكريم من آيات عديدة تشير إلى وجوب العدل والعدالة في كل شيء. وأما في السنة الشريفة فقد ورد الكثير من الروايات والأحاديث التي تدعو وتحث على العدل في كل شيء، ومرجعية القرآن والسنة هي المعتمد في أي تأصيل لأي قضية.

وفي حديث زهير قد أشار الرسول الكريم صلى الله عليه وسلم إلى بعض مجالات العدل حيث قال: (إن المقسطين عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمن عز وجل وكلتا يديه يمين الذين يعدلون في حكمهم، وأهليهم، وما ولوا)[1]. وفيما يلي بيان لبعض المجالات المحورية للعدل في المجتمع الإسلامي:

أ: العدل في الاعتقاد

تعد عقيدة التوحيد مظهرا من أهم مظاهر العدل، والشرك هو عين الظلم؛ لأنه مساواة بين الخالق والمخلوق، يقول الله سبحانه وتعالى: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۗ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ﴾[2] أي: يسوون بين خالق السموات والأرض، وبين المخلوق الذي لا يملك من أمره شيئا، فهذه المساواة الظالمة يقبح وقوعها من الإنسان، يقول الله سبحانه وتعالى: ﴿اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾[3] فهذه التسوية والإشراك في العبودية لغير الله سبحانه وتعالى هي محل إنكار إلهي، وهي شكل من الظلم، بل هي ظلم عظيم، يقول الله سبحانه وتعالى على لسان لقمان الحكيم: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾[4].

---

١. أبو الحسين مسلم بن الحجاج، الجامع الصحيح، تحقيق: الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق بالرعية والنهي عن إدخال المشقة عليهم، دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ج ٠٣، ص ١٤٥٨، رقم الحديث ١٨٢٧.

٢. سورة الأنعام، ٠١.

٣. سورة النحل، ١٧.

٤. سورة لقمان، ١٣.

والعدل في الاعتقاد لا يقتصر على جانب التوحيد فقط، بل يشمل جميع الجوانب الاعتقادية، فالتوسط فيها دون إفراط أو تفريط هو أساس لصحة المعتقد. وأهم مظهر من مظاهر العدل أن يكون المخلوق عادلا في سلوكه مع الخالق عز وجل، فيعبده حق عبادته، ويؤدي ما عليه من التزامات العبودية وتعظيم الربوبية، إذ أن النفس البشرية لا ترتقي إلا حين تتجه إلى حضرة الله سبحانه تعالى مباشرة، متجردة عن كل ما سواه، مستشعرة تقواه، وتحس أن عينه مطلعة حتى على خفايا الضمير.

ب: العدل في المجالات الاجتماعية المتنوعة

من تتبع نصوص الشريعة يجد أنها استوعبت جميع النواحي الاجتماعية وسيجد ذلك بضرورة توخي العدل فيها سواء على مستوى الأسرة أو على مستوى التربية والسلوك أو على مستوى المعاملات والمعاشرات، ويمكن بيان ذلك في العناصر التالية:

١. عدل الإنسان مع نفسه

يجب على الإنسان الفطن أن يكون عادلا مع نفسه وأن لا يظلمها بترك ما أمر الله به، أو بفعل ما حرم الله عز وجل عليه مما هو دون الشرك، وما لا يتعدى ضرره إلى غيره، ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ [1].

ويرشد إلى ذلك قول النبي صلى الله عليه وسلم لعثمان بن مظعون رضي الله عنه الذي أراد أن يتبتل ويتفرغ للعبادة فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: (يا عثمان! أرغبت عن سنتي؟ قال: لا والله يارسول الله، ولكن سنتك أطلب. قال: فإني أنام، وأصلي، وأصوم، وأفطر، وأنكح النساء، فاتق الله يا عثمان، فإن لأهلك عليك حقا، وإن لضيفك عليك حقا، وإن لنفسك عليك حقا، فصم وأفطر وصل ونم)[2]. وزاد عليه الدارمي وقال: (قال سعد بن أبي

---

١. سورة يونس، ٤٤.

٢. أبو داود، السنن، كتاب التطوع، باب ما يؤمر به من القصد في الصلاة، ج ٠١، ص ٥١٩، رقم الحديث ١٣٧١.

وقاص رضي الله عنه: فوالله لقد كان أجمع رجال من المسلمين على أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إن هو أقر عثمان رضي الله عنه على ما هو عليه أن نختصي فنتبتل)[١].

والحدث نفسه يتكرر مع سلمان وأبي الدرداء رضي الله عنهما، عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه رضي الله عنه قال: (آخى النبي صلى الله عليه وسلم بين سلمان وأبي الدرداء، فزار سلمان أبا الدرداء فرأى أم الدرداء متبذلة[٢]، فقال لها: ما شأنك؟ قالت: أخوك أبو الدرداء ليس له حاجة في الدنيا. فجاء أبو الدرداء فصنع له طعاما، فقال: كل. قال: فإني صائم. قال: ما أنا بآكل حتى تأكل. قال: فأكل فلما كان الليل ذهب أبو الدرداء يقوم قال: نم فنام. ثم ذهب يقوم فقال: نم فلما كان من آخر الليل قال سلمان: قم الآن فصل فقال له سلمان: إن لربك عليك حقا، ولنفسك عليك حقا، ولأهلك عليك حقا، فأعط كل ذي حق حقه. فأتى النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال النبي صلى الله عليه وسلم: صدق سلمان)[٣]. فهذان موقفان يدلان على ضرورة توخي الاعتدال في جميع أمور الحياة بإعطاء كل ذي حق حقه،ولا يجوز للإنسان الاعتداء حتى على نفسه.

---

١. الدارمي، السنن، كتاب النكاح، باب النهي عن التبتل، ج ٠٢، ص ١٧٩، رقم الحديث ٢١٦٩.

٢. متبذلة: لابسة ثياب البذلة وهي المهنة أي تاركة لباس الزينة. وكانت هذه الزيارة وهذا الحوار قبل أن يفرض الحجاب على المسلمات.

٣. أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري، الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وأيامه، كاب الأدب، باب صنع الطعام والتكلف للضيف، ج ٠٥، ص٢٢٧٣، رقم الحديث ٥٧٨٨.

٢. العدل في الأسرة

إن الله تعالى أمر بالعدل بين الزوجات، وقد أكدت عليه النصوص الشرعية خاصة في المواطن التي يتصور فيها وقوع الظلم فقد أباح الإسلام تعدد الزوجات، وهذا التعدد مظنة الظلم من جهة الزوج؛ لذا قيدت الشريعة تلك الإباحة بضرورة توخي العدل، يقول الله سبحانه وتعالى: ﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾[١] فمجرد الخوف من الظلم؛ بحيث يغلب على ظن الرجل أنه إذا عدد سيظلم، ففي مثل هذه الحالة يلزمه الاقتصار على زوجة واحدة.

ثم بين الله تعالى أن تمام العدل وكماله وغايته في معاملة النساء محال، فخفف الله التكليف بالعدل التام، وطالب من الرجال بقدر الاستطاعة، فقال: ﴿وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ﴾[٢] إن الله سبحانه وتعالى نفى استطاعة العدالة بين النساء نفيا مؤكدا، لأن حرف (لن) لتأكيد النفي، فالعدالة بمعنى تنفيذ كل الحقوق المقررة والواجبات النفسية أمر غير ممكن مهما يكن حرص الإنسان عليها. والعدالة النفسية بالمساواة في الإقبال القلبي والمحبة أمر غير ممكن؛ لأن الناس بحكم الخلقة لا يقدرون على تحكم نزعات نفوسهم وميول قلوبهم.

وجاءت نصوص أخرى تحذره من أن يلقى الله تعالى ظالما في هذا الجانب، قال النبي صلى الله عليه وسلم: (من كانت له امرأتان فمال إلى إحداهما جاء يوم القيامة وشقه مائل)[٣]. وقال: (من كانت له امرأتان فلم يعدل بينهما في القسم من نفسه وماله،

---

١. سورة النساء، ٠٣.

٢. سورة النساء، ١٢٩.

٣. أبو داود، السنن، كتاب النكاح، باب في القسم بين النساء، ج ٠٢، ص ٢٠٨، رقم الحديث ٢١٣٥؛ البيهقي، السنن الكبرى، ج ٠٧، ص ٢٩٧، رقم الحديث ١٥١٣٥؛ أبو محمد عبد الله بن

جاء يوم القيامة مغلولا مائلا شقه حتى يدخل النار)[1]. وعلى مستوى الشهادة في النزاعات الأسرية والطلاق ومستلزماته، قيدت الشهادة بالعدل يقول الله سبحانه وتعالى: ﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾[2] فالشهادة لا تكون إلا لله سبحانه وتعالى، وهذا يقتضي ضرورة تحري العدل فيها إلى أقصى الدرجات، وضرورة أن يتصف الشهود بالعدالة.

كان النبي عليه الصلاة والسلام يعدل بين نسائه رضي الله عنهن، يعني في الأكل، والشرب، والنفقة، والكسوة، والسكن، والمبيت، وكل ما يتعلق بصور الحياة الزوجية. ففي بيته كان عادلا بين زوجاته أمهات المؤمنين رضي الله عنهن، فيقسم بينهن بالعدل، وفي ذلك أن عائشة رضي الله عنها زوج النبي صلى الله عليه وسلم قالت: (كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أراد أن يخرج في سفر أقرع بين نسائه رضي الله عنهن، فأيتهن خرج سهمها خرج بها رسول الله صلى الله عليه وسلم معه....)[3].

عبد الرحمن الدارمي، سنن الدارمي، كتاب النكاح، باب في العدل بين النساء، تحقيق: الشيخ فواز أحمد زمرلي – الشيخ خالد السبع العلمي، دار الكتاب العربي، بيروت، لبنان، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ، ج٠٢، ص ١٩٣، رقم الحديث ٢٢٠٦.

١. أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري، كتاب اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، كتاب المساجد، باب في خطبة كذبها...، دار الوطن للنشر، السعودية العربية، ج ٠٢، ص ٢٩٤، رقم الحديث ١٥٤٣؛ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث، تحقيق: الدكتور حسين أحمد صالح الباكري، كتاب الصلاة، باب في خطبة قد كذبها...، مركز خدمة السنة والسيرة النبوية، المدينة المنورة، السعودية العربية، الطبعة الأولى: ١٤١٣هـ/١٩٩٢م، ج ٠١، ص ٣١٢، رقم الحديث ٢٠٥.

٢. سورة الطلاق، ٠٣.

٣. مسلم، الجامع الصحيح، كتاب التوبة، باب في حديث الإفك وقبول توبة القاذف، ج ٠٤،

والنبي صلى الله عليه وسلم هو أكمل البشر لكنه مع ذلك لم يستطع العدالة النفسية. ففي الحديث عن عائشة رضي الله عنها قالت: (كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقسم فيعدل ويقول: اللهم هذا قسمي فيما أملك، فلا تلمني فيما تملك ولا أملك)[1]. يعني أمر القلب. وقال الترمذي: يعني به الحب والمودة ؛ لأن ذلك مما لا يملكه الرجل ولا هو في قدرته[2]. هذا أمر يتعلق بالقلوب، والقلوب بين أصبعين من أصابع الرحمن. وإذا أتى بشيء لواحدة منهن يحضر لغيرها مثله، وهكذا. فهذا هو العدل الذي ربط الله به هذا التعدد.

٣. العدل في الأولاد

الأولاد نعمة عظيمة من نعم الله تعالى على العباد، فهم زينة الحياة الدنيا حيث قال تعالى: ﴿الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾[3] فعليهم تعقد الآمال وهم زاد المستقبل إذا صلحت تربيتهم، والإسلام عني بالأولاد وأوجب لهم الكثير من الحقوق فلا فرق بين ذكر وأنثى في التعامل أو النفقة أو العلم أو أي حق من الحقوق التي منحها الله تعالى لهم كالتأديب على الأخلاق الحميدة، والنصح، والإرشاد، والتعليم، وباقي أمورهم.

ص٢١٢٩، رقم الحديث ٢٧٧٠.

١. أبو داود، السنن، كتاب النكاح، باب في القسم بين النساء، ج ٠٢، ص ٢٠٨، رقم الحديث ٢١٣٦؛ البيهقي، السنن الكبرى، ج ٠٧، ص ٢٩٨، رقم الحديث ١٥١٤٢؛ الدارمي، السنن، ج ٠٢، ص ١٩٣، رقم الحديث ٢٢٠٧؛ الحاكم، المستدرك على الصحيحين، ج ٠٢، ص ١٨٧.

٢. أبو محمد بدر الدين محمود بن أحمد العيني، عمدة القاري شرح صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب العدل بين النساء، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الأولى: ١٤٢١هـ/٢٠٠١م، ج ٢٠، ص٢٨٢.

٣. سورة الكهف، ٤٦.

لا ريب أن التزام العدل من الطبقات العليا والمسؤولين له أثر عظيم في تحقيق العدل؛ فيجب على الحاكم أن ينظم أمور دولته بالعدل، والأب أن يدير أمور بيته وأسرته بالعدل كي يعم العدل على مستوى المجتمع.

قد أمرنا الله تعالى بالعدل بين الأولاد، فلا يجوز لأحد أن يجور على الإناث من أجل الذكور، أو أن يجور على أولاد امرأة من أجل أولاد امرأة أخرى، أو أن يفضل بعضهم على بعض، فقد ورد عن النعمان بن بشير رضي الله عنهما وهو على المنبر أنه يقول: (أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة رضي الله عنها[١]: لا أرضى حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية فأمرتني أن أشهدك يا رسول الله. قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا. قال: لا. قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم. قال: فرجع فرد عطيته)[٢].

وعن أنس رضي الله عنه قال: (لم يكن أحد أشبه بالنبي صلى الله عليه وسلم من الحسن بن علي رضي الله عنهما، وكان رجل جالسا عند النبي صلى الله عليه وسلم فجاءه ولد له فأخذه وقبله، وأجلسه في حجره، وجاءت ابنة له فأخذها فأجلسها، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: فهلا عدلت بينهما)[٣].

---

١. كانت عمرة بنت رواحة أم النعمان بن بشير، زوجة بشير بن سعد رضي الله عنهم، وهي من إحدى الصحابيات.

٢. البخاري، الجامع الصحيح، تحقيق: الدكتور مصطفى ديب البغا، كتاب الهبة وفضلها، باب الإشهاد في الهبة، دار ابن كثير، بيروت، لبنان، الطبعة الثالثة: ١٤٠٧هـ/١٩٨٧م، ج ٠٢، ص ٩١٤، رقم الحديث ٢٤٤٧.

٣. البيهقي، شعب الإيمان، ج ١٣، ص ٣٨٣، رقم الحديث ١٠٥١٠؛ أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الطحاوي، شرح معاني الآثار، تحقيق: محمد زهري النجار، كتاب الهبة والصدقة، باب الرجل

فالملاحظ في الموقف الأول هي توصية النبي صلى الله عليه وسلم بالعدل بين الأولاد في العطاء، ويقاس عليه جميع الأمور المادية، وفي الحديث الثاني إشارة إلى ضرورة العدل في مواقف الحياة البسيطة التي توحي بالتمييز بين الأولاد، وهذا يشمل كل المواقف المعنوية والنفسية. وقال أبو جعفر الطحاوي: "أفلا يرى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد أراد منه العدل بين الابنة والابن وأن لا يفضل أحدهما على الآخر، فذلك دليل على ما ذكرنا في العطية أيضا"[1].

إن الله سبحانه وتعالى أيضا يأمرنا بالعدل في الميراث، ويمنعنا من حرمان الإناث من الإرث؛ لأن أهل الجاهلية كانوا يحرمون البنات من الميراث ويجعلونه للبنين فقط ، فأمر الله تعالى بالتسوية بينهم في أصل الميراث، وفاوت بين الصنفين، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين؛ وقال تعالى: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾[2] وذلك لاحتياج الرجل إلى مؤنة النفقة والكلفة ومعاناة التجارة والتكسب وتجشم المشقة، فناسب أن يعطى ضعفي ما تأخذه الأنثى.

فمن الواجب الإذعان لوصايا الله وفرائضه، والتزام منهجه وحدوده، فلا ينبغي الاعتداء وهضم الحقوق، أو التعديل في أنظمة الإرث كإعطاء المرأة مثل الرجل زعما بأن ذلك عدل

ينحل بعض بنيه دون بعض، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الأولى: ١٣٩٩هـ، ج ٠٤، ص ٨٩، رقم الحديث ٥٤٠٧؛ أبو بكر أحمد بن عمرو البزار، مسند البزار، تحقيق: الشيخ عادل بن سعد، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، السعودية العربية، الطبعة الأولى: ١٤٢٦هـ/٢٠٠٥م، ج١٣، ص ٤٥، رقم الحديث ٦٣٦١؛ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في الأولاد، دار الفكر، بيروت، لبنان، ج ٠٨، ص٢٨٧، رقم الحديث ١٣٤٨٩، وقال الهيثمي: رواه البزار، فقال: حدثنا بعض أصحابنا ولم يسمه، وبقية رجاله ثقات.

١. أحمد بن محمد بن سلامة الطحاوي، شرح معاني الآثار، كتاب الهبة والصدقة، باب الرجل ينحل بعض بنيه دون بعض، ج ٠٤، ص ٨٩، رقم الحديث ٥٤٠٧.

٢. سورة النساء، ١١.

يقتضي المساواة في الحقوق بين الرجل والمرأة، لكن لا عدل بعد عدل الله، ولا رحمة فوق رحمة الله، فإن افتتاح الآيات بقوله تعالى: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾[1] دليل على أنه تعالى أرحم بالناس.

٤. العدل في الشهادة

الشهادة في الإسلام حق واجب الأداء، وأداء الشهادة أمانة المشهود له في ذمة الشاهد وهي تقتضي الأداء، كما قال الله تعالى: ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ﴾[2] وقال تعالى: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾[3] وقال تعالى: ﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا﴾[4] والشهادة حجة حقيقية أمام القضاء لإظهار الحقوق لأهلها، وبرهانا جليا للقضاة يهتدون به في إحقاق تلك الحقوق، ودفع المظالم، ورفعها عن المظلومين، لأمر الله سبحانه وتعالى بها في مواضع عديدة من القرآن الكريم حيث قال: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾[5] وقال الله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾[6] وقال سبحانه وتعالى: ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾[7] أي: فاعدلوا في القول في الشهادة أو الحكم، ولو كان المقول له أو عليه ذا قرابة منكم.

وتعتبر الشهادة من أهم وسائل إظهار البينة بين الناس، فقد قال الله تعالى في كتابه العزيز: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ

١. سورة النساء، ١١.
٢. سورة البقرة، ٢٨٣.
٣. سورة النساء، ٥٨.
٤. سورة البقرة، ٢٨٢.
٥. سورة النساء، ١٣٥.
٦. سورة المائدة، ٠٨.
٧. سورة الأنعام، ١٥٢.

الشُّهَدَآءِ﴾[1] وقال تعالى: ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾[2] فكل مسلم أو مسلمة مطالب بأداء الشهادة وعدم كتمها، لقول الله تعالى: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُۥ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾[3] نهى الله سبحانه وتعالى عن كتمان الشهادة، وقال: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَٰدَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُۥٓ ءَاثِمٌ قَلْبُهُۥ﴾[4] ويكون العدل فيها بأن يشهد بما رأى أو سمع فإن شهد بما يخالف ذلك فهو شاهد زور. ويأثم الممتنع عن الشهادة إذا لم يكن عليه ضرر وكانت شهادته مفيدة نافعة، فإن كان عليه ضرر في التحمل أو الأداء لم تلزمه لقوله تعالى: ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾[5] وإذا كان ممن لا تقبل شهادته لم تجب عليه؛ لأن مقصود الشهادة لا يحصل منه.

٥. العدل في المداينة

إن الله تعالى قد أمر بالتزام الكتابة والشهادة بالعدل في المداينة لحفظ الأموال وإزالة الريب. والتزام الكتابة في الإملاء، وفي إملاء الولي عن السفيه والضعيف. وكتابة الكاتب وأداء الشهادة يكونان بالحق والعدل، فلا يكتب الكاتب ما لم يمل عليه. وقال القرطبي: "لا يكتب لصاحب الحق أكثر مما قاله ولا أقل، وإنما قال "بينكم" ولم يقل أحدكم ؛ لأنه لما كان الذي له الدين يتهم في الكتابة الذي عليه الدين، وكذلك بالعكس شرع الله سبحانه كاتبا غيرهما يكتب بالعدل لا يكون في قلبه ولا قلمه مودة لأحدهما على الآخر"[6]. ولا يزيد الشاهد في شهادته ولاينقص منها، فالكاتب والشاهد يعصيان بالزيادة أو النقصان، وذلك من الكذب المؤذي في الأموال والأبدان.

---

١. سورة البقرة، ٢٨٢.
٢. سورة الطلاق، ٠٢.
٣. سورة البقرة، ١٤٠.
٤. سورة البقرة، ٢٨٣.
٥. سورة البقرة، ٢٨٢.
٦. أبو عبد الله محمد بن أحمد شمس الدين القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، تحقيق: الشيخ هشام سمير البخاري، دار عالم الكتب، الرياض، السعودية العربية، سنة الطبع: ١٤٢٣هـ/٢٠٠٣م، ج ٠٣، ص ٣٨٣.

وقال الله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾[١].

هذا إرشاد منه تعالى لعباده المؤمنين إذا تعاملوا بمعاملات مؤجلة أن يكتبوها، ليكون ذلك أحفظ لمقدارها وميقاتها، وأضبط للشاهد فيها.

قوله تعالى: ﴿وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ﴾ "بأن يكتب كاتب مأمون عادل محايد، فقيه متدين يقظ الحق دون ميل لأحد الجانبين، مع وضوح المعاني، وتجنب الألفاظ المحتملة للمعاني الكثيرة، فهو كالقاضي بين الدائن والمدين. وهذا يدل على اشتراط العدالة في الكاتب.

ثم أوصى الكاتب ونهاه عن الإباء: فلا يمتنع أحد من الكتاب عن كتابة وثيقة الدين، ما دام يمكنه ذلك، على الطريقة التي علمه الله في كتابة الوثائق، أو كالتي علمه الله، فالكاف صفة لموصوف محذوف، فلا يزيد ولا ينقص ولا يضر أحدا، والكتابة نعمة من الله عليه، فمن شكرها ألا يمتنع عنها، وإن كانت بأجر، وهذا يدل على اشتراط كون الكاتب عالما بالأحكام الشرعية والشروط المرعية عرفا ونظاما. وقدم اشتراط العدالة على العلم ؛ لأنها أهم من العلم. فالعادل يمكنه تعلم ما تتطلبه كتابة الوثائق، وأما العالم غير العادل فلا يهديه علمه للعدالة، وإنما يفسد ولا يصلح.

---

١. سورة البقرة، ٢٨٢.

ودل قوله: وَلا يَأْبَ على أن العالم العادل إذا دعي للقيام بالكتابة ونحوها، وجب عليه تلبية الدعوة، ثم أكد الله تعالى النهي عن الإباء بالأمر بالكتابة بالحق، لكون الوثيقة متعلقة بحفظ الحقوق"[1].

وقال الشيخ وهبة الزحيلي: "وكون هذه الآية أطول آية في القرآن الكريم دليل على أن المال في ذاته ليس مبغوضا عند الله، وعلى أن الإسلام معني باقتصاديات الأمة، وأنه دين ودولة وحياة ونظام مجتمع، وليس دين رهبنة وفقر، وانعزال عن الحياة، فتنظيم التعامل بين الناس، وتبيان طريق حفظ الحقوق، وتعاطي التجارة وتنمية المال، يدل كل ذلك على أن الإسلام دين عمل وجهد وكفاح، وحرص على الكسب والربح من أوجه الحلال"[2].

٦. العدل في المعاملات

إن التشريع الإسلامي في المعاملات إنما سيقت من باب تحري العدل والاحتراز من الظلم، ولأجل هذا حرم الربا والقمار والغرر والتدليس والنجش، وغيرها من المعاملات التي تفضي إلى الظلم. فالعدل الذي أمر الله به يشمل العدل في حقه وفي حق عباده، فالعدل في ذلك أداء الحقوق كاملة موفرة بأن يؤدي العبد ما أوجب الله عليه من الحقوق المالية والبدنية والمركبة منهما في حقه وحق عباده، ويعامل الخلق بالعدل التام، ويجب على كل وال أن يؤدي حقوق رعايته. فعن ابن عمر رضي الله عنهما قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: (كلكم راع ومسؤول عن رعيته، والإمام راع ومسؤول عن رعيته، والرجل راع في أهله ومسؤول عن رعيته، والمرأة في بيت زوجها راعية ومسؤولة عن رعيتها، والخادم في مال سيده راع ومسؤول عن رعيته. قال: وحسبت أن قد قال: والرجل راع في مال أبيه)[3].

---

١. الدكتور وهبة بن مصطفى الزحيلي، التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج، ج ٠٣، ص ١٠٨، دار الفكر المعاصر، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية ١٤١٨هـ.

٢. المصدر السابق، ج ٠٣، ص ١٠٧.

٣. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الوصايا، باب تأويل قول الله تعالى: ﴿من بعد وصية يوصي بها أو دين﴾ ج ٠٣، ص ١٠١٠، رقم الحديث ٢٦٠٠

العدل واجب، والإحسان فضيلة مستحبة وذلك كنفع الناس بالمال والبدن والعلم، وغير ذلك من أنواع النفع حتى إنه يدخل فيه الإحسان إلى الحيوان البهيم المأكول وغيره[١].

٧. العدل في المعيشة

إن الله تعالى يأمر بالعدل في المعيشة، وينهى عن أكل أموال الناس بالباطل، قال تعالى: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٖ مِّنكُمۡ﴾[٢] وقال تعالى: ﴿وَلَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ وَتُدۡلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلۡحُكَّامِ لِتَأۡكُلُواْ فَرِيقٗا مِّنۡ أَمۡوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلۡإِثۡمِ وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾[٣] والأكل بالباطل يشمل كل ما أخذ بغير وجه الحق، كالربا والقمار؛ لأنه أخذ بدون مقابل، والرشوة والدفاع بالباطل؛ لأنهما إعانة على الظلم، والصدقة على القادر على الكسب؛ لأنها إذلال له، ولا تحل للآخذ إذا كان غير مضطر إليه، والسرقة والغصب؛ لأنهما اعتداء على مال الغير، سواء أكان غصب مال عيني أم غصب المنافع، أم التعدي على منفعة الآخرين، كالتسخير بدون مقابل أو الإنقاص من الأجر، وأكل مال اليتيم ظلما، وأجور الرقص والغناء، ومهور البغايا، وغيرها، والمأخوذ غشا واحتيالا وزورا وبهتانا، ونحو ذلك من أموال السحت والحرام، التي تؤدي إلى النار؛ لأن كل جسم نبت من حرام فالنار أولى به[٤].

وحرم كسب الأموال بغير الوجوه الشرعية، فحرم الربا في قوله تعالى: ﴿ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِي يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَالُوٓاْ إِنَّمَا

---

١. انظر: عبد الرحمن بن ناصر السعدي ، تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان، تحقيق: عبد الرحمن بن معلا اللويحق، ج ١، ص ٤٤٧، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م

٢. سورة النساء، ٢٩

٣. سورة البقرة، ١٨٨

٤. انظر: الزحيلي، وهبة بن مصطفى، التفسير المنير، ج ٢، ص ١٦٤—١٦٥

﴿الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾[1] وأشار القرآن الكريم إلى حرمة الاعتداء على أموال الآخرين وممتلكاتهم، ووضع عقوبة للمتعدي على أموال الناس في قوله تعالى: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللهِ ۗ وَاللهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[2].

فالإنسان مسؤول عن اكتسابه للأموال، كما أنه مسؤول عن طريقة إنفاقه لها، وتزداد المسؤولية عند ما يكون الإنسان مسؤولا عن بيت مال المسلمين؛ لأن هذا المال هو حق لجميع المسلمين، ويجب صرفه في الوجوه الشرعية، ووفق تعاليم الشرع والدين.

٨. العدل في الكيل والميزان

المسلم مأمور بتحري العدل في الكيل والميزان، يقول الله سبحانه وتعالى: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾[3] أي: أتموا الكيل إذا كلتم للناس، ولا تزيدوا فيه إذا اكتلتم لأنفسكم، وأتموا الميزان إذا وزنتم لأنفسكم فيما تشترون أو لغيركم فيما تبيعون، فلا يكون فيه زيادة ولا نقص، وإنما تمام بالعدل، من غير تطفيف، كما قال تعالى: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾[4] أي: أن إيفاء الحق يكون في الحالتين: البيع والشراء. وقوله بالقسط: يوجب تحري العدل حال البيع والشراء بقدر المستطاع. وقد أمر الله تعالى بالوفاء في الكيل والميزان، فقال: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾[5] وقال تعالى: ﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾[6] أي: لا تبخسوا الوزن، بل

---

١. سورة البقرة، ٢٧٥
٢. سورة المائدة، ٣٨
٣. سورة الأنعام، ١٥٢
٤. سورة المطففين، ١-٣
٥. سورة الإسراء، ٣٥
٦. سورة الرحمن، ٩

زنوا بالحق والقسط، وهذا التكرير لتأكيد الأمر بالعدل، ويلاحظ أنه سبحانه أمر أولا بالتسوية، ثم نهى عن الطغيان الذي هو مجاوزة الحد بالزيادة، ثم نهى عن الخسران الذي هو النقص والبخس. كما قال تعالى: ﴿أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾[1] وأهلك الله تعالى قوم شعيب عليه السلام ودمرهم على ما كانوا يبخسون الناس في الميزان والمكيال، بعد أن كرر النصح لهم، فقال تعالى: ﴿وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾[2]

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم أعدل الناس في تعامله وبيعه وشرائه وتجارته بل كان إحسانه يرجح دائما، ففي الحديث عن سويد بن قيس رضي الله عنه قال: (جلبت أنا ومخرفة العبدي بزا من هجر، فجاءنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فساومنا سراويل، وعندنا وزان، يزن بالأجر فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: يا وزان زن وأرجح)[3].

٩. العدل في الإصلاح الاجتماعي

يجب على المسلمين وولاة الأمور الإصلاح بين الناس بالعدل وبالنصح والدعوة والإرشاد إلى حكم الله وإزالة الشبه وأسباب الخلاف لقوله تعالى: ﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ﴾[4]

---

١. سورة الشعراء، ١٨١–١٨٢

٢. سورة هود، ٨٥

٣. أبو عبد الله محمد بن يزيد ابن ماجه القزويني، السنن، تحقيق: الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي، كتاب التجارات، باب الرجحان في الوزن، دار الفكر، بيروت، لبنان، ج ٠٢، ص ٧٤٨، رقم الحديث ٢٢٢٠؛ أبو عيسى محمد بن عيسى الترمذي، السنن، تحقيق: الشيخ أحمد محمد شاكر، كتاب البيوع، باب ما جاء في الرجحان في الوزن، ج ٠٣، ص ٥٩٨، رقم الحديث ١٣٠٥، دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان؛ أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، المعجم الكبير، تحقيق: الشيخ حمدي بن عبد المجيد السلفي، مكتبة العلوم والحكم، الموصل، الطبعة الثانية: ١٤٠٤ھ/١٩٨٣م، ج ٠٧، ص ٨٩، رقم الحديث ٦٤٦٦

٤. سورة الحجرات، ٠٩

هذا أمر بالصلح، وبالعدل في الصلح، فإن الصلح، قد يوجد، ولكن لا يكون بالعدل، بل بالظلم والحيف على أحد الخصمين، فهذا ليس هو الصلح المأمور به، فيجب أن لا يحابي أحدهما، لقرابة، أو وطن، أو غير ذلك من المقاصد والأغراض، التي توجب العدول عن العدل. وذلك هو الإصلاح بينهما بالعدل.

١٠. العدل مع العدو وغير المسلم

إن الإسلام يأمر بالعدل مع الموافق والمخالف، ومع من تحب وتكره؛ لأن الله تعالى قال: ﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾[١] أي: فاعدلوا في القول في الشهادة أو الحكم، ولو كان المقول له أو عليه ذا قرابة منكم، إذ بالعدل تصلح شؤون الأمم والأفراد، وهو أساس الملك، وركن العمران، وقاعدة الحكم. فلا يحملنكم الهوى والعصبية وبغض الناس على ترك العدل في أموركم وشؤونكم، بل الزموا العدل في جميع الأحوال، كما قال الله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾[٢]

ومعنى الشنآن: شدة البغض والكراهية، سواء أكانت هذه الكراهية منهم أومنكم، وقوله تعالى: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا﴾ أي: لا يحملنكم بغض قوم وعداوتهم على ترك العدل فيهم، بل اجعلوا شعاركم العدل في معاملتكم مع الجميع صديقا كان أو عدوا. ولهذا قال: ﴿اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ أي: عدلكم أقرب للتقوى من تركه، أي العدل في معاملة الأعداء أقرب إلى اتقاء للعاصي على الوجه العام. وقوله: ﴿أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ من باب استعمال أفعل التفضيل في المحل الذي ليس في الجانب الآخر منه شيء، أي ليس للمفاضلة بين شيئين، فهو ليس على بابه، كما في قوله تعالى: ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾[٣].

---

١. سورة الأنعام، ١٥٢

٢. سورة المائدة، ٠٨

٣. سورة الفرقان، ٢٤؛ انظر: أبو الفداء إسماعيل بن عمر ابن كثير الدمشقي، تفسير القرآن العظيم،

والله سبحانه وتعالى أمر رسوله صلى الله عليه وسلم أن يقضي بين الناس بالحق والعدل دون محاباة ، ولا إلحاق ظلم بأحد ولو كان غير مسلم، وكافر. وقال تعالى: ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ﴾[1] والقرآن الكريم أنزل تسع آيات في سورة النساء تدافع عن يهودي اتهم ظلما بالسرقة. وكاد النبي صلى الله عليه وسلم يصدق الجماعة الذين قالوا له: إن اليهودي هو الذي سرق، مع أن الذي سرق أحد المسلمين من الضعفاء، وقد ورد في ذلك قول الله تعالى: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا﴾ إلى آخر الآيات[2]. أي: إنا أنزلنا إليك هذا القرآن بالحق في خبره وطلبه وحكمه بتحقيق الحق وبيانه، لأجل أن تحكم بين الناس بما أوحى إليك وأعلمك من الأحكام، فتقضي بالوحي إن وجد، أو تقضي بالاجتهاد إن لم يوجد وحي صريح فاحكم بين الناس بشريعة الله، ولا تكن لمن خان نفسه مخاصما ومدافعا تدافع عنه، وترد من طالبه بالحق، أي لا تتهاون في تحري الحق تأثرا بقوة جدل خصم في الخصومة.

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم قدوة ومثالا يحتذى به في تطبيق العدل، فقد جاء إليه رجلان من الأنصار يختصمان إليه، ويطلبان منه أن يحكم بينهما، فقال لهما رسول الله صلى الله عليه وسلم: (إنكم تختصمون إلي ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو مما أسمع منه فمن قطعت له من حق أخيه شيئا فلا يأخذه فإنما أقطع له به قطعة من النار)[3].

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يبعث عبد الله بن رواحة رضي الله عنه إلى يهود كل عام فيخرص الثمر حين يطيب قبل أن يؤكل، فاليهود أرادوا أن يرشوه، فقال لهم: أترشوني يا أعداء

تحقيق: الشيخ سامي بن محمد سلامة، ج ۰۳، ص ٦٢، دار طيبة للنشر والتوزيع. الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ/١٩٩٩م

١. سورة الشورى، ١٥

٢. سورة النساء، ١٠٥ إلى ١١٣

٣. مسلم، كتاب الأقضية، باب الحكم بالظاهر واللحن بالحجة، ج ۰۳، ص ١٣٣٧، رقم الحديث ١٧١٣

الله، أتطعموني السحت؟ ولقد جئتكم من عند أحب الناس إلي، ولأنتم أبغض إلي من عدتكم من القردة والخنازير، ولايحملني بغضي إياكم وحبي إياه على أن لا أعدل فيكم فقالوا: هذا هو العدل الذي قامت به السماوات والأرض. فعلى المسلم أن يعدل حتى مع عدوه وغير المسلم والكافر.

وعن الشعبي، قال: (دفع رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر إلى أهلها بالنصف، فبعث عبد الله بن رواحة ليخرص[1] النخل - أو قال الثمر - عليهم، فقال لهم ابن رواحة رضي الله عنه : جئتكم من عند رجل هو أحب إلي من نفسي، ولأنتم أبغض إلي من القردة والخنازير. فقالوا: كيف تعدل فينا، وأنت هكذا؟ فقال: ليس يمنعني ذلك من العدل فيكم. قالوا: بهذا قامت السماوات والأرض. قال: فخرص عليهم، ثم جعله نصفين، فخيرهم أن يأخذوا أيهما شاؤوا. قال: فما زاد أحدهما على الآخر شيئا)[2].

والله تعالى يقول: ﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾[3] أي: تقسطوا إليهم، يعني تعدلوا معهم، حتى المحارب الذي يحاربك لا تظلمهم، يعني لا يجوز أن تقتل إلا من يقتلك، لا تقتل الرهبان في الصوامع، لا تقتل الحراث الزراع في أرضهم، لا تقتل التجار في متاجرهم؛ لأن هذا ظلم، حتى وإن كان أهلهم يحاربونك.

---

١. الخرص: هو حزر ما على النخلة والكرمة من الرطب تمرا ومن العنب زبيبا فهو من الخرص الظن؛ لأن الحزر إنما هو تقدير بظن. والاسم الخرص بالكسر. انظر: ابن الأثير الجزري، النهاية في غريب الحديث، ج ٢، ص ٢٢

٢. أبو عبيد القاسم بن سلام الهروي، كتاب الأموال، تحقيق: أبو أنس سيد بن رجب، دار الفضيلة، الرياض، السعودية العربية، الطبعة الأولى: ١٤٢٨هـ/٢٠٠٧م، ج ٠٢، ص ١٤٧، رقم الحديث ١٣٢٩؛ البيهقي، السنن الكبرى، ج ٠٦، ص ١١٤، رقم الحديث ١١٩٦٠

٣. سورة الممتحنة، ٠٨

والذين يعدِلون في حكمهم يجعل الله لهم محبة في القلوب وطمأنينة لقولهم وثقة بهم؛ لأنهم حكموا فعدلوا وقضوا بين الناس بالعدل، ومنه قوله تعالى: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾[1]

ج: العدل السياسي والعدل في الولاية

على ولاة أمور المسلمين أن يسوسهم السياسة الشرعية ويحكموا بينهم بالعدل، فعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: (سبعة الذين يظلهم الله في ظله يوم لا ظل إلا ظله، الإمام العادل)[2]. وعن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : (إن أحب الناس إلى الله يوم القيامة وأدناهم منه مجلسا إمام عادل، وأبغض الناس إلى الله وأبعدهم منه مجلسا إمام جائر)[3]. ومن ذلك قول الله سبحانه وتعالى: ﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ﴾[4] وقال الله تعالى: ﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾[5] وقال تعالى: ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾[6] والحكم بالعدل هنا يشمل القضاء والإمامة العظمى وما يتفرع منها من إمامة فرعية، فالحكم بالعدل يشمل كل حكم قضائي يصدر من

---

١. سورة ص، ٢٦

٢. البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الجماعة والإمامة، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة وفضل المساجد، ج ٠١، ص ٢٣٤، رقم الحديث ٦٢٩

٣. الترمذي، السنن، كتاب الأحكام، باب ما جاء في الإمام العادل، ج ٠٣، ص ٦١٧، رقم الحديث ١٣٢٩

٤. سورة الأعراف، ٢٩

٥. سورة المائدة، ٤٢

٦. سورة النساء، ٥٨

الإمام أو قضاته أو ولاته في حق الرعية. وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (إذا حكمتم فاعدلوا وإذا قتلتم فأحسنوا فإن الله عز وجل محسن يحب المحسنين)[1].

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم أعدل الناس وأسرعهم إلى أداء حقوق الآخرين إذا كانت عليه، ففي الحديث عن أبي سعيد الخدريرضي الله عنه قال: (بينما رسول الله صلى الله عليه وسلم يقسم قسما، أقبل رجل فأكب عليه فطعنه رسول الله صلى الله عليه وسلم بعرجون كان معه فجرح بوجهه، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: تعال فاستقد. فقال: بل عفوت يارسول الله)[2]. بل كان من روائع عدله صلى الله عليه وسلم أنه كان يكره أن يتميز عن أصحابه رضي الله عنهم، ويحب أن يقاسمهم الجهد والعمل في سبيل الله، ففي الحديث عن عبد الله بن مسعودرضي الله عنه قال: كنا يوم بدر ثلاثة على بعير، كان أبو لبابة وعلي بن أبي طالب رضي الله عنهما زميلي رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال: وكانت عقبة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالا: اركب يا رسول الله، حتى نمشي عنك، فيقول: (ما أنتما بأقوى مني ولا أنا بأغنى عن الأجر منكما)[3].

---

١. أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، المعجم الأوسط، تحقيق: الشيخ طارق بن عوض الله — الشيخ عبد المحسن بن إبراهيم، دار الحرمين، القاهرة، مصر، ج ٠٦، ص ٤٠، رقم الحديث ٥٧٣٥؛ الهيثمي، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، دار الفكر، بيروت، لبنان، ج ٠٥، ص ٣٥٦، رقم الحديث ٩٠٠١، وقال الهيثمي: رواه الطبراني في الأوسط ورجاله ثقات

٢. أبوداود، السنن، كتاب الديات، باب القود من الضربة وقص الأمير من نفسه، ج ٠٤، ص٣٠٦، رقم الحديث ٤٥٣٨؛ أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، السنن، كتاب القسامة، باب القود في الطعنة، تحقيق: الشيخ عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الثانية ١٤٠٦هـ/١٩٨٦م، ج ٠٨، ص ٣٢، رقم الحديث ٤٧٧٣؛ أحمد بن حنبل، المسند، ج ٠٣، ص ٢٨، رقم الحديث ١١٢٤٥

٣. أحمد بن حنبل، المسند، ج ١، ص ٤٢٤، رقم الحديث ٤٠٢٩؛ الحاكم، المستدرك، ج ٠٣، ص ٢٣

ولا يمكن أن يتحقق العدل إلا بتطبيق شرع الله عز وجل، واتباع منهجه الذي أمرنا به، وبينه في كتابه وعلى لسان رسوله صلى الله عليه وسلم، وإلا فلا عدل ولا قسط ولا استقامة، وإنما كفر وظلم وفسوق، كما قال سبحانه وتعالى: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾[1] وقال تعالى: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[2] ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾[3].

إنما يخضع الجميع في المجتمع الإسلامي لشريعة الله عز وجل فلا يوجد من يجري في عروقه دم مقدس، وهو فوق النظام والعدالة أو كما يقال فوق القانون. وقد أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بإقامة الحدود في القريب والبعيد. وروي عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (أقيموا حدود الله في القريب والبعيد، ولا تأخذكم في الله لومة لائم)[4]. وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (لا يحكم الحاكم بين اثنين وهو غضبان)[5].

إن الإسلام يقرر مبدأ استقلال القضاء عن بقية وظائف الدولة ومناصبها، كي لا يستطيع أحد أن يتدخل في أمور القضاء أو يؤثر على القاضي. وللحاكم أو الخليفة أو الإمام حق تعيين القاضي ولكن لا سلطان له عليه بعد تعيينه.

هذه بعض مجالات العدل ويتضح من خلالها مدى شمولية العدل لجميع مناحي وجوانب الحياة الإنسانية، بل تضافرت النصوص الدالة على شموليته للموجودات الأخرى في الكون.

---

١. سورة المائدة، ٤٤

٢. سورة المائدة، ٤٥

٣. سورة المائدة، ٤٧

٤. ابن ماجه، السنن، كتاب الحدود، باب إقامة الحدود، ج ٢، ص ٨٤٩، رقم الحديث ٢٥٤٠

٥. الترمذي، السنن، كتاب الأحكام، باب ما جاء لا يقضي القاضي وهو غضبان، ج ٣، ص ٦٢٠، رقم الحديث ١٣٣٤

ثالثا: آثار العدل في المجتمع الإسلامي

إن دين الإسلام دين قائم على العدل في جميع أحكامه وتشريعاته قال الله تعالى: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ﴾[1] فهو صدق في أخباره، عدل في أحكامه، ولا يقر الجور والعدوان، ولا يحابي أحدا بل دائما مع الحق أينما كان. فبالعدالة يعيش الجميع بأمن وسلام، كما أن التقدم والتطور متلازم مع وجود العدالة، وكلما تحققت العدالة ازداد إيمان الناس وقناعتهم بالعمل المخلص والجاد في سبيل تطوير المجتمع، كما أن العدالة تساهم في خلق التنافس الإيجابي، والحافز القوي نحو تفجير المواهب والطاقات، مما يؤدي إلى الإبداع والابتكار، ويشعر المجتمع بالسعادة والرفاهية والراحة.

ويترتب على إقامة العدل في البلاد فوائد عديدة وأثارا عظيمة على الفرد والمجتمع في جميع جوانب الحياة، وفيما يلي بيان لأهمها:

- جعل الله العدل قواما للأنام وتنزيها لهم من المظالم والآثام.
- العدل يحقق الأمن والطمأنينة للمجتمع بأسره، فالإنسان بطبعه يتمسك بحقوقه، ويحرص كل الحرص على صيانة حرماته، كما يسعى للمحافظة على حرياته.
- العدل من أخطر قيم المجتمع على الإطلاق وأبعدها حيوية وأهمية؛ لأن استقامة المجتمع وأحكامه وفق قيمة العدل يفضي حتما إلى إنقاذ قيم اجتماعية أخرى.
- المقسطون عند الله تعالى يوم القيامة على منابر من نور، على يمين العرش.
- العادلون أحب الناس إلى الله سبحانه وتعالى، لقوله: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾[2].
- العادلون أقرب الناس إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم القيامة.
- العدل قوة للمجتمع في حفظ الحقوق والأموال والحريات والحرمات.
- العدل يحصن المجتمع من أهم إفرازات الظلم وآثاره على الصعيدين الفردي والاجتماعي.

---

١. سورة الأنعام، ١١٥

٢. سورة الحجرات، ٩.

- العدل سبب سعادة الإنسان في الحياة سواء أكان في علاقته مع نفسه أو مع ربه أو مع الناس.
- العدل مفتاح استقرار واطمئنان المجتمعات وحافز على العمل والإنتاج ومصدر لنماء العمران وكثرة الخيرات والأرزاق وزرع الثقة بين أفراد الوطن الواحد.
- العدل طريق الاعتدال في المواقف والسلوك والمزاج ومواجهة الأخطار.
- بسيادة العدل تضيق الفجوة بين الأغنياء والفقراء، ويسهل تدارك الفقر ومعالجة البطالة ومحاربة الفساد.
- العدل سبب استقرار البشرية على الأرض وتصحيح مسار البشر في العالم على كافة المستويات دوليا وإقليميا ووطنيا فرديا وجماعيا من المساواة والحرية والعدالة والإقرار بالحقوق لأصحابها.
- تحقيق العدل وتطبيق أحكام الله وشريعته من أجل الحصول على رضا الله عزوجل والفوز بالجنة والنجاة من النار.
- تطبيق وتنفيذ العدل سبب إرجاع الحقوق إلى أهلها.
- يفضي إلى الاستغلال الأمثل لطاقات وجهود أفراد المجتمع.
- تدفع الجميع إلى الذوبان في المجتمع والدولة وتغليب العام على الخاص.
- قوة وتماسك البنيان الاجتماعي والسياسي والتفات الجماهير حول قادتها.
- تحقيق الاستقرار السياسي الذي هو مفتاح التنمية الشاملة والنهوض.
- دوام الملك وعدم زواله.
- أصحاب العدل أهل للولاية والحكم والتقدم والرفعة.
- العدل طريق موصل إلى الجنة.

النتائج والتوصيا ت

قد توصل هذا البحث العلمي إلى أهم النتائج والتوصيات التالية:

١. يمتاز العدل في الإسلام بمزايا وخصائص لا توجد في غيره، ولعل من أبرز وأعظم خصائص ومزايا العدل في الإسلام هو الإطلاق والشمول. والعدل في الإسلام مبدأ مطلق وشامل، لا يستثنى منه أحد سواء أكان مسلما أو غير مسلم.

٢. إن العدل في نظر الإسلام غاية من الغايات القصوى التي أنزلت من أجلها الشرائع السماوية، وأرسل الرسل جميعا لتحقيقها بين بني بشر.

٣. إن العدل في الإسلام ليس منوطا بإسلام المسلم حتى يكون مقصورا عليه لا يتعداه، بل مناطه إنسانية الإنسان المتفرع عن مبدأ الكرامة الإنسانية الثابتة بقوله تعالى: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾[1]

٤. إن الإسلام لم يقف عند حد إقامة العدل بين الناس والأمر به، بل جاوز العدل إلى الإحسان والفضل.

٥. وجوب التزام العدل في كل شيء، سواء في الإشراف على أموال اليتامى، أو في الزواج بهن، أو في تعدد الزوجات.

٦. وجوب العدل في معاملة الناس قاطبة، وعدم الالتفات إلى المال أو الجاه أو القوة أو الضعف أو الصداقة أو العداوة.

٧. العدل من النفس بالوفاء للناس بحقوقهم.

٨. العدل بين الزوجين بوفاء الحقوق المتبادلة.

٩. يجب الاقتصار على زوجة واحدة عند خوف الظلم.

١٠. العدل بين الأبناء والبنات في المعاملة والعطايا.

١١. التزام العدل في الكتابة، وفي الإملاء، وفي إملاء الولي عن السفيه والضعيف.

١٢. أداء الشهادة، وكتابة الكاتب بالحق والعدل، فلا يكتب الكاتب ما لم يمل عليه، ولايزيد الشاهد في شهادته ولا ينقص منها، فالكاتب والشاهد يعصيان بالزيادة أو النقصان.

١٣. إصلاح المسلمين بالوسائل السلمية كالنصيحة والوعظ والإرشاد والتحكيم العادل.

١٤. العدل في تقييم الأفراد.

١٥. العدل في المحاسبة والعقوبات.

١٦. العدل مع النفس في الاعتراف بالخطأ والتقصير.

١٧. العدل في عدم بخس الناس أشياءهم من الأفكار والأعمال والإنجازات والممتلكات.

١٨. العدل مع إخوانك المسلمين بأن تنصرهم مظلومين بمعاونتهم على استرداد حقوقهم، وظالمين بردهم إلى الحق والصواب والأخذ على أيديهم.

---

١. سورة الإسراء، ٧٠

Editor

Shah Moeen-ud-Din Hashmi

Associate Editor

Muhammad Rafique Sadiq

Editorial Board

National		International	
Shahid Siddiqui	Islamabad	Muhammad Yaseen Mazhar Siddiqui	India
Ali Asghar Chishti	Islamabad	Syed Salman Nadvi	South Africa
Miraj ul Islam Zia	Peshawar	Khalid Mehmood Shaikh	USA
Qibla Ayyaz	Peshawar	Ataullah Siddiqui	UK
Muhammad Zia-ul-Haq	Islamabad	Muhammad Saleh Syukri	Malaysia
Muhy-ud-Din Hashmi	Islamabad	Iftikhar H Malik	UK
Abdul Rauf Zafar	Sargodha	Razi ul Islam Nadvi	India
Abdul Hameed Khan Abbasi	Islamabad	Abdurrahman Raden Haqqi	BN
Abdul Quddus Suhaib	Multan	Azzeddine benzeghiba	Dubai
Fazlullah	Islamabad	Muhammad Abdul Razzaq Aswad	KSA
Abdul Aziz Sahir	Islamabad	Abdulhamit Birisk	Turkey
Samina Awan	Islamabad	Fath ur Rehman Qurashi	Sudan
Hafiz Muhammad Sajjad	Islamabad	Muhammad Zaid Malik	KSA
Ali Tariq	Islamabad	Abdul Hameed Kharroub	Al-Jazair
		Besa Ismaili Ahmeti	Kosovo

All Correspondences should be addressed to:
Editor "**Seerat Studies**"
Department of Hadith & Seerah,
Faculty of Arabic & Islamic Studies,
Allama Iqbal Open University, H-8, Islamabad.
Tel:0092 51-9250085– 9057839
E-mail: jss@aiou.edu.pk

Research Journal

Seerat Studies

Editor

Shah Moeen-ud-Din Hashmi

Department of Hadith & Seerah, Faculty of Arabic and Islamic Studies
Allama Iqbal Open University, Islamabad-Pakistan
www.aiou.edu.pk

مجلہ سیرت سٹڈیز میں مقالہ کی اشاعت سے متعلق قواعد وضوابط

۱. مقالہ میں اصالت اور گہرائی پر مبنی تحقیق ہو۔

۲. مقالہ کے حواشی وحوالہ جات اصولِ تحقیق کے مطابق ہوں نیز حوالہ جات صفحہ کے آخر میں دیئے جائیں۔

۳. مقالہ نگار حوالہ دیتے وقت مصنف، کتاب کے ناشر اور مقام اشاعت کے متعلق مکمل معلومات مع جلد نمبر اور صفحہ نمبر وغیرہ فراہم کریں۔ ایک ہی مصدر / مرجع سے دوبارہ حوالہ دیتے وقت اختصارات کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۴. مقالہ کی ہارڈ کاپی صفحہ کے ایک طرف اور سافٹ کاپی مائیکروسافٹ ورڈ میں کمپوز ہونی چاہیے۔

۵. سیرت سٹڈیز میں ارسال کردہ مقالہ کسی اور جگہ شائع شدہ یا کسی اور جگہ اشاعت کے لیے نہ دیا گیا ہو۔

۶. مقالہ نگار اپنے مقالہ کے ساتھ انگریزی میں ایک صفحہ پر مشتمل ملخص (Abstract) ارسال کریں جو کہ ایک صفحہ سے زیادہ نہ ہو۔

۷. مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلہ کی ۲ کاپیاں فراہم کی جائیں گی۔

۸. مقالہ میں دی گئی رائے کی ذمہ داری مقالہ نگار پر ہو گی۔ مجلس ادارت یا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔

مجلہ سیرت سٹڈیز میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار وخیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں:

پتہ برائے رابطہ: مدیر مجلہ "سیرت سٹڈیز" شعبہ حدیث وسیرت، کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ
بلاک نمبر 12، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، H/8، اسلام آباد
فون نمبر: 0092-51-9250085, 9057839 ای میل: jss@aiou.edu.pk

Volume: 1 Issue: 1 Year: 2016 ISSN:2520-3398

Research Journal

Seerat Studies

RJSS

Department of Hadith & Seerah, Faculty of Arabic and Islamic Studies
Allama Iqbal Open University, Islamabad-Pakistan
www.aiou.edu.pk